UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224002
UNIVERSAL
LIBRARY

مجلہ عثمانیہ

طلبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیرین

نبی احسن شمیم بی۔ اے
غلام دستگیر رشید بی۔ اے

صرف ٹائٹل مطبع عہد آفریں میں چھپا

مجلسِ انتظامی

سالِ تعلیمی ۱۳۴۰ف

صدر

مولوی محمد عبدالرحمٰن خان صاحب صدر کلیۂ جامعہ عثمانیہ

نگراں کا حصۂ اردو

مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر اُردو

نگراں کا حصۂ انگریزی

مسٹر ای۔ای۔ اسپیٹ پروفیسر انگریزی

خازنِ اعزازی

مولوی وحیدالرحمٰن صاحب پروفیسر طبیعیات

منتظم اعزازی و معتمد

محمد اسرار حسن ہاشمی صاحب

اراکین

مظہر حسین صاحب نائب صدر انجمنِ اتحاد

نبی الحسن صاحب شمیم مدیر حصۂ اردو

غلام دستگیر صاحب رشید مدیر حصۂ اُردو

مہدی علی صدیقی صاحب مدیر حصۂ انگریزی

مجلّہ عثمانیہ

جلد چہارم شمارہ اول بابتہ سنہ ۱۳۴۰ فصلی

مجلس نگرانی

محمد عبد الرحمن خاں صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ
اے، آر، سی، ایس۔ بی۔ ایس۔ سی (لندن) فیلو آف دی رائل اسٹرونامکل سوسائٹی لندن

محمد عبد الحق بی اے پروفیسر اردو
کلیہ جامعہ عثمانیہ

ای ای اسپیٹ بی اے (لندن)
پروفیسر انگریزی کلیہ جامعہ عثمانیہ

(مدیرین)

نبی احسن شمیم بی اے مدیر حصہ اردو
غلام دستگیر رشید بی اے "

سیّد مہدی علی ام اے
مدیر حصہ انگریزی

ملنے کا پتہ
اسد حسین ہاشمی ناظم اعزازی مجلّہ عثمانیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

اطلاع

۱ ۔ طلبہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی علمی رسالہ حسب ذیل مہینوں کے آخری ہفتوں میں شائع ہوا کریگا ۔

امرداد (جون) آبان (ستمبر) بہمن (ڈسمبر) اردی بہشت (مارچ)

سال تعلیمی اور مجلہ کا سال ایک ہوگا ۔

۲ ۔ رسالہ انگریزی اور اردو دو حصوں پر مشتمل ہوگا ۔ حصہ اردو کے لئے تقریباً ۸ جز اور حصہ انگریزی کے لئے تقریباً ۴ جز مختص کئے جائیں گے ۔ رسالہ کا سالانہ حجم کم از کم (۸۰۰) صفحات ہوگا

۳ ۔ مجلس نگرانی اشاعت کے متعلق ردّ و بدل کی مجاز ہوگی ۔

مضامین کا انتخاب مجلس ادارت کریگی ۔

۴ ۔ تمام مضامین نظم و نثر مدیرین کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں ۔

۔ خریداری اور دیگر امور کے لئے اعزازی ناظم رسالہ سے دفتر کے پتہ پر خط و کتابت کی جائے ۔

۵ ۔ چندہ کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں ۔

چندہ

۱ ۔ سرکار آصفیہ و برطانیہ سے عہ سالانہ پیشگی ۵ ۔ طلبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ سے للعہ ر سالانہ پیشگی

۲ ۔ ارباب جامعۂ اصحاب اقتدار اور اداروں سے ۃ ر ۶ ۔ ممالک بیرون ہند سے ۱۵ شلنگ ر

۳ ۔ عام خریداروں سے ۓ ر ۷ ۔ بلاد یورپ کے طلباء قدیم سے ۱۰ ر ر

۴ ۔ طلبہ قدیم رفاہیہ انجمنوں اور مطالعہ خانوں سے صہ ر ۸ ۔ فی رسالہ عا

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہونگے ، بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی ۔

(۱) بذریعہ رجسٹری (چھ) کلدار ۔ ۳ (سکۂ عثمانیہ (۲) بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی پی کے اخراجات ۱ کلدار ۲ سکۂ عثمانیہ (۳) بذریعہ بک پوسٹ ۶ کلدار مالی

مجلۂ عثمانیہ

فہرست مضامین — شمارۂ اوّل جلد چہارم

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	سخن ہائے گفتنی	رشید سجانی ۔ مدیر اردو	
۲	شاہ نامہ کا جنم بھوم	مولوی محی الدین بادشاہ صاحب متعلم ایم اے عثمانیہ	
۳	روح عمل کی نذر (نظم)	مولوی عبدالقیوم صاحب باقی ایم اے عثمانیہ سابق مدیر انگریزی	
۴	باغباں	مولوی عزیز احمد صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ	
۵	نیٹشے اور اس کا فلسفہ	جناب ڈاکٹر جعفر حسین صاحب پروفیسر عربی کلیہ جامعہ عثمانیہ	
۶	ایک عثمانیہ کی زبان سے (نظم)	بنی الحسن شمیم مدیر اردو	
۷	سزائے موت	جناب محمد محی الدین صاحب متعلم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ	
۸	چاند بی بی سے (نظم)	رشید سجانی مدیر اردو	
۹	معاشیات کی علمی وسعت اور عملی اہمیت	مولوی نعیض الدین صاحب متعلم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ	
۱۰	عناصر کی پیدائش اور ان کا انجام	مولوی سید شاہ محمد صاحب متعلم بی اے کلیہ جامعہ عثمانیہ	
۱۱	حسن ملیح (نظم)	جناب رشدی صاحب ایم اے (عثمانیہ) نظام گرلز	
۱۲	اسد خاں لاری	جناب محمد عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ۔ ال ال بی (عثمانیہ) مددگار پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ	
۱۳	مہ شباب (نظم)	از جناب مولوی خلیفہ عبدالحکیم صاحب پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ	

۱۴ - پپیہا اور عورت (نظم)	مولوی علی حسنین صاحب زیبا متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ
۱۵ - ستاروں کے بعد کی پیمایش	مولوی نصیر احمد صاحب، ام۔ اس۔ سی پروفیسر طبیعات کلیہ جامعہ عثمانیہ
۱۶ - مطربہ	مولوی محمد امیر صاحب بی اے۔ بی، ٹی، سابق متعلم کلیہ عثمانیہ
۱۷ - اقبال حیات اور شاعری	مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام اے۔ ال ال بی مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ
۱۸ - تبصرے	مدیرین
۱۹ - کلیہ کی خبریں	شمیم مدیر اردو ۔

الف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

الحمد للہ مجلہ عثمانیہ کی عمر کے تین سال گزر گئے، اب چوتھے سال کا آغاز ہے گزشتہ سال مجلہ کی طرف سے جو کچھ کیا گیا اسے آپ دیکھ چکے، آئندہ جو کچھ کیا جائے گا، انشاء اللہ اسے بھی آپ دیکھ لیں گے۔ نیا سال ہے، نیا عملہ ادارت ہے، نئی امنگیں ہیں، نوخیز تمنائیں ہیں، لیکن یہ کس حد تک پوری ہونگی، اس کا جواب "حال" میں نہیں بلکہ مستقبل میں پوشیدہ ہے۔

جامعہ عثمانیہ ہماری حیات علمی کی تعمیر کا اک ادارہ ہے۔ کیونکہ انسانی فضیلت اسی میں ہے کسی جامعہ کی حیات علمی کی تعمیر میں "شق تحریر" بھی ایک اہم چیز ہے۔ کیونکہ تحریر اشاعت علم کا ایک نہایت اہم ذریعہ ہے۔ خصوصاً بیسویں صدی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ دور "دور صحافت" ہے ہماری جامعہ کا نصب العین بھی یہی ہے کہ ہمارے علوم کو اپنی زبان میں منتقل کریں بہت جلد ہمیں ترجمہ کے دور سے گزر کر تالیف و تصنیف کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ جب تک ہماری جامعہ کے مختلف علوم کی تحصیل کرنے والے طلبا، تحریر میں کمال نہ پیدا کریں جب تک ان کا قلم اظہار مافی الضمیر و مافی الذہن پر قادر نہ ہو، جامعہ کا یہ نصب العین کس طرح پورا ہو سکتا ہے "کمال تحریر" کی نہ صرف اسی لئے ضرورت ہے بلکہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لئے قریب قریب ہر میدان عمل میں یہ صفت درکار ہے۔ اگر آپ وکیل ہیں تو دعوی یا جواب دعوی کی ترتیب میں زور قلم کی حاجت ہے۔ اگر آپ کرسئ عدالت پر رونق افروز ہیں تو فیصلہ لکھنے میں خوبی تحریر کو بڑا دخل ہے۔ اگر آپ فرائض ادارت انجام دیرہے ہوں اور قوم کی ترجمانی کی سعادت حاصل فرما رہے ہوں تو اس وقت قلم کا زور جو رنگ لاتا ہے وہ آپ پر ظاہر ہے۔ اگر آپ مصنف ہیں تو کمال تحریر آپ کا پیشہ ہی ہے۔ اگر آپ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے کسی محکمہ میں اہلکار پیشی ہیں، تب بھی آپ کی جامعیت تحریر

عہدہ داروں کو خوش کرنے میں بڑی مدد دیگی۔ اگر آپ "عبدیت" کی تبلیغ میں مصروف ہیں تو آپ کی جادو نگاری آپ کے پرخلوص پیغام میں چار چاند لگا دیگی۔ غرض تعلیم یافتہ آدمی کے لئے خوبیٔ تحریر لازم ہے۔ مجلہ صفحات برادران کلیہ کی اسی خدمت کے لئے وقف ہیں لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برادران کلیہ اس "علمی فرض" کے طرف سے بالعموم نہایت غافل ہیں۔ انہیں نہ خوبیٔ تحریر سے بحث ہے، نہ کمال تقریر سے۔ اس حالت میں وہ جامعہ کے نصب العین کو پامال کر رہے ہیں۔

مجلہ کی مشکلات میں اہم ترین مشکل برادران کلیہ کی یہی غفلت ہے۔ مضامین کی درخواست پیش خدمت کی جاتی ہے، لیکن جواب نہایت مایوس کن ہوتا ہے، ایک ایسے ادارۂ علمی میں جہاں چھ سو طالب علم مختلف علوم کی اعلیٰ تعلیم پاتے ہوں اور ستر کے قریب فاضل اور باکمال اساتذہ درس دیتے ہوں اسی کالج کے "ترجمان علمی" کے لئے ہر تین مہینے میں بدقت تمام مضامین فراہم ہوتے ہیں اور وہ بھی وقت پر نہیں۔ یہ بات کس قدر تعجب انگیز اور حسرت ناک ہے۔

ہم اپنے برادران علمی سے پرجوش اپیل کرتے ہیں کہ وہ جلد اپنے دل مردہ کو گرمائیں، سوتے دماغ کو جگائیں پرسکون قلم کو جنبش میں لائیں، کیونکہ مجلہ کی بروقت اشاعت میں سب سے اہم رکاوٹ اور سخت ترین مشکل فراہمی مضامین کی ہے۔ اگر انہوں نے توجہ نہ کی تو انہیں رسالے کے دیر میں شائع ہونے کی شکایت کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اگر غفلت اور بے پروائی بدستور جاری رہے تو خطرہ ہے کہ کہیں وہ نامبارک وقت نہ آجائے کہ اس دل زندہ اور زبان گویا سے بالکل ہاتھ دھونا پڑے۔

ہمارے بھائیوں کو مجلہ کے معیار کے متعلق شکایت ہے کہ وہ بہت بلند ہے اور بعض کی تمنا ہے کہ وہ کسی قدر پست ہو۔ ہماری عرض یہ ہے کہ بجائے اس کے، وہ خود کسی قدر "بلند" ہوں تو بہتر ہے۔ یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں، تھوڑی سی توجہ اور محنت ان کے علمی کام کو مجلہ کے معیار تک پہونچا سکتی ہے۔ "کتب خانہ مدد کو اور فاضل اساتذہ مشورہ اور رہبری کو موجود اور طیار رہیں، پھر کمی کس چیز کی ہے؟ صرف شوق،

بلند حوصلگی اور محنت کی ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی تھا

ہماری آرزو اور کوشش ہے کہ "مجلۂ عثمانیہ" پورے طور پر طلبۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ کا رسالہ ہو اور اس کا علمی حسن روز افزوں ہو۔ ہر قسم کے علمی مضامین سے اس کے صفحات مزین ہوں، ہماری پالیسی بھی یہی رہے گی کہ برادران کلیہ اس میں زیادہ حصہ لیں، ہمیں خدا کے فضل سے امید ہے کہ یہ مراد بر آئیگی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مجلہ کا معیار پست ہو جائے گا! انشاء اللہ مجلہ اپنے سابقہ شاندار علمی روایات کا حامل ہوگا۔

ہمیں قوی امید ہے کہ ہمارے علم دوست صدر کلیۂ فاضل اساتذہ اور دیگر ادب نواز شرفاء حسب دستور مجلہ کو اپنی بزرگانہ عنایات سے سرفراز فرماتے رہیں گے۔

مجلہ کی راہِ کامیابی میں دوسری سب سے بڑی مشکل انتظام طباعت کی ہے، یہ تو مشہور ہے حیدرآباد کی فضا علمی رسالوں کی اشاعت کے لئے ناموافق ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ حیدرآباد میں بعض رسالے باوجود ذاتی مطبع ہونے کے وقت پر شائع نہ ہو سکے۔ عملۂ ادارت نے لکھائی چھپائی کی انہیں مشکلات سے تنگ آکر رسالہ کو ٹائپ کے حوالہ کیا تھا، لیکن بدبختی سے اس "نوشدارو" نے اس زہر کو اور تیز کر دیا۔ مجبوراً ہمیں "پھر لیتھو" کی طرف لوٹنا پڑا۔ خدا کرے کہ یہ "درد" ہی دوا ہو جائے!

کالج میں مجلہ کا تقاضہ نہایت شدید ہے، ہمیں اور ناظرین دونوں کو عجلت ممکنہ منظور ہے اس عجلت میں ہم اس نمبر کی ترتیب و اشاعت کا خاطر خواہ انتظام نہ کر سکے، امید ہے فروگزاشتیں نظر انداز

کیجائیں گی۔

طاعون کی وجہ سے مطبع میں کام وقت پر نہ ہوسکا اور نہ پورا پرچہ ایک ہی کاتب سے لکھوایا گیا، مجبوراً مختلف کاتبوں سے لکھوانا پڑا آئندہ اسکے علاج کی فکر ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس سال طبیعیات کا نوبل انعام پروفیسر سی، وی، رامن کو ملا۔ ڈاکٹر ٹیگور کے بعد یہ دوسرے ہندوستانی ہیں جنھیں یہ علمی شرف حاصل ہوا ہے، ہم ڈاکٹر صاحب کو اور برادران وطن کو اس علمی فتح اور ذہنی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔ یہ بات اور زیادہ قابل قدر ہے کہ یہ انعام سائنس کا ہے، جس کے ماہر خصوصی بالعموم صرف اہل مغرب سمجھے جاتے ہیں۔ ہمیں نہایت عالی حوصلگی سے اس دن کی توقع رکھنی چاہئے کہ جبکہ برادران جامعہ عثمانیہ اس شرف سے مشرف ہونگے، کیونکہ حیات علمی کے اعلیٰ ترین مقامات پر نظر رکھنے والوں کا یہ پیغام ہے ع

جبریل زبوں صیدے در دست جنوں من

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ہم نے نہایت رنج و ملال کے ساتھ مولنا حمید الدین صاحب بی اے کے انتقال کی خبر سنی مولنا قرآن پاک کے بڑے متبحر عالم با عمل اور فارسی اور عربی کے ادیب تھے، فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ علاوہ اس کے جدید تعلیم سے بہرہ وافر رکھتے تھے، خود داری اور فیض رسانی میں یادگار سلف تھے۔ حیدرآباد پر ان کا بڑا علمی احسان ہے۔

ان کی "فکر رسا" کو جامعہ عثمانیہ کی تخلیق میں بڑا دخل تھا ع

مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شاہنامہ کا جنم بھوم

سید محی الدین صاحب متعلم یم۔ اے کلیہ جامعہ عثمانیہ

بسلسلہ گذشتہ

اشاعت اسلام کے بعد ایرانیوں کی کوشش قادسیہ اور جلولا کی جنگ کے بعد جو ساسانی سلطنت کے حق میں مضر ثابت ہوئی اور جس میں ایرانی سردار رستم کو سعد بن وقاص کے ہاتھوں سنہ ۱۴ھ میں شکست اٹھانی پڑی ایرانی داستانوں کی شوکت باقی نہیں رہی لیکن ابھی عرصہ نہیں گزرا تھا کہ متمدن ایرانیوں نے عربوں کی حکومت کے تحت دوبارہ امور عامہ پر قابو حاصل کرلیا۔ خراسان اور عراق عرب میں ایرانی علم و ادب نے اور شام و مصر میں یونانی تمدن نے عربوں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ اسلام کی پہلی تین صدیوں کی تاریخ ایرانیوں کی قومی شورشوں اور سیاسی و مذہبی انقلابوں سے بھری ہوئی ہے جو کھوئی ہوئی حکومت کو واپس لینے کے لئے جان توڑ کوششیں تھیں۔ ان میں ایک طرف تو ایران کے اسپہبد۔ امرا اور اعیان۔ مرزبان۔ پادوسبان۔ استندار۔ علم بغاوت بلند کرتے تھے اور دوسری طرف (مذہبی) زردشت دمانی اور مزدک کے پیرو مختلف ناموں سے مثلاً جاودانی خرم دینی۔ بابکی پیروان سناد مقنع شلمغانی اور بہافرید اور کئی ایک طریقوں سے جن میں بعض مذہب کے اثر میں اور بعض کسی اسلامی فرقہ کی پیچ میں بغاوت میں حصہ لیتے تھے۔ اور دوسری جانب دمشق اور بغداد کے عربی نژاد خلفا ایرانی علما، حکما، زنادقہ اور اہل بدعت کے پیچھے پڑ کر ان کا استیصال کرتے اور ان فتنوں کو دبانے کے لئے جوان کے راستہ میں حائل ہوتے لشکرکشی کرتے تھے۔

اسلام کی پہلی اور دوسری صدی میں ایرانیوں کی علمی، ادبی، روحانی، اجتماعی زندگی اور ان کا ابھار اور خصوصاً زردشتی مذہب کی نشوونما اور اس کا ایرانی مسلمانوں پر اثر واختلاط ایک مستقل اور مبسوط موضوع ہے جو علیحدہ تشریح اور تحقیق کا محتاج ہے۔ اس جگہ ہمارا مقصد صرف ایران کی قدیم سوز تاریخ، اور ملی داستانوں کی حالت بیان کرنا ہے کہ وہ کس طرح تاریک زمانوں میں باقی رہیں۔ اس بات کے قوی قرائن موجود ہیں کہ سیاسی اور قومی شوکت کے باوجود ادبی و علمی مذاق میں کسی قسم کا گھٹاؤ نہیں ہوا تھا۔ اور خاص کر پہلی دوسری اور تیسری صدی ہجری میں بہت سارے مذہبی اور علمی کتابیں اور رسالے پہلوی زبان میں لکھے گئے ہیں جن میں سے چند نسخے جو بہت اہم ہیں اب تک ملتے ہیں۔ یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ جس طرح شکست اور زوال کے بعد ایک قوم کی فطرت میں تاریخ کی اہمیت کا جز بڑھ جاتا ہے اسی طرح ایران میں بھی فن تاریخ کو کافی اہمیت دی گئی ہوگی اور بڑی بڑی مہتم بالشان کتابیں[1] اور تاریخیں لکھی گئی ہوں گی۔

ایرانی علم وادب وتمدن کی طرف اموی اور عباسی خلفا کی توجہ

جب عموی اور خصوصاً عباسی خلفار نے اپنے ملک وقوم سے زیادہ متمدن تر ممالک اور ملل پر غلبہ حاصل کر لیا تو انہیں یہ خیال پیدا ہوا کہ مغلوبین کے منظم اور مرتب محکموں کی نظم ونسق اخذ کریں۔ اس لئے اسلامی تمدن کے ابتدا میں غیر اقوام کے مترجمین خصوصاً یونانی جاننے والے سریانیوں اور پہلوی پڑھنے والے ایرانیوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اور ان متمدن اقوام کے آثار معلوم کرنے کی طرف کچھ رغبت پیدا[2] ہوئی اور جب سے کہ عربی زبان میں تالیف وتصنیف عام ہوئی اور تفہیم کا مکمل ذریعہ بن گئی

---

[1] مثلاً (۱) منوچہر موبد خراسان اور بہرام بن خورزاد کے نوشتجات ابن المقفع کے ماخذ رہ چکے ہیں جن کا ذکر تنسر نامہ میں آیا ہے۔ (۲) اور کتاب اردوا دیا ارتوات بن مورخاں موبداں موبد مولف "تاریخ یزدگرد" جس کا بلعمی نے تاریخ طبری کے ترجمہ کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے! اور (۳) "صور ملوک ساسانی" جس کا ذکر مسعودی نے اپنی "کتاب التنبیہ والاشراف" میں کیا ہے۔

[2] اسلام سے پہلے عرب ایرانی تمدن سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ ملوک حیرہ خلمین اور ایرانیوں کے تعلقات اس زمانہ میں قائم تھے۔ اور ذی قار کی مشہور جنگ اور ایرانیوں کا یمن پر غلبہ نوشیروان کے عہد میں واقع ہوا تھا۔ اور شاپور ذوالاکتاف کا جبر وقہر

تو پہلوی اور یونانی کتابوں کے ترجمے عربی میں ہونے لگے۔ (غالباً یہ بات اکابر اسلام کی سرپرستی اور توجہ سے ہوئی) پہلوی کی سب سے پہلی کتاب جس کے عربی میں ترجمہ ہونے کی اطلاع ملی ہے اگر روایت صحیح ہے تو بقول مسعودی ۱۳۳ھ میں ہشام بن عبدالملک کے لئے ترجمہ کی گئی۔ لیکن اس قسم کے ترجموں کی ابتدا عباسیوں کے زمانہ میں ہوئی پائے تخت خلافت کو جو اطیسفون (مداین) میں جو ساسانیوں کا پائے تخت تھا منتقل کرنے سے یعنی بغداد کو مستقر سلطنت قائم کرنے سے عربی داں زردشتی مذہب ایرانیوں نے یا جدید الاسلام ایرانیوں نے پہلوی کتابوں کے ترجمہ کو رواج دیا۔ ان ابتدائی مترجمین میں سے جن کے متعلق معلومات حاصل ہوئے ہیں ایک بڑا مولف اور مترجم روزبہ جو دادویہ کا بیٹا تھا اور جس کی کنیت ابوعمرو تھی ایرانی زردشتی تھا۔ جو پہلی صدی کے آخر میں اور دوسری صدی کی ابتدا میں عیسیٰ بن علی بن عبداللہ بن عباسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور ابو محمد عبداللہ ابن المقفع[1] بن المبارک کے نام سے مشہور ہوا۔ مشارٌ الیہ نے جن کتابوں کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے ان کے نام ابن الندیم کی کتاب الفہرست (۳۷۷ھ) میں مذکور ہیں۔ اور اب ان میں سے بہت کم کتابیں ملتی ہیں چند کتابوں کے صرف نام قدیم عربی و فارسی کتابوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً آئین نامہ۔ کلیلہ و دمنہ۔ کتاب مزدک کتاب التاج در سیرت نوشیروان۔ کتاب التیمیہ در مراسلات۔ کتاب آداب الکبیر۔ کتاب آداب الصغیر اور خدای نامہ سب سے اہم کتاب یہی آخری کتاب ہے جو تھوڑے عرصہ میں مشہور ہوگئی۔ اور تمام عالم اسلامی میں عموماً و عراق عرب۔ ایران اور ماوراء النہر میں خصوصاً کافی شہرت حاصل کرلی۔ ایرانی داستانوں کو سننے کے لئے عربوں کا شوق اور گذشتہ عظمت و افتخار کو بحال کرنے کے لئے ایرانیوں کی توجہ ان دو چیزوں نے اس کتاب کی وسیع اشاعت میں حصہ لیا۔ اور تھوڑے ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عربوں پر ضرب المثل ہوگیا تھا چنانچہ ثعالبی نے اپنی کتاب "غرر ملوک الفرس" میں حضرت علیؓ کی جانب دو شعر منسوب کئے ہیں جس میں شاپور اور قبیلہ ایاد کے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نوروز اور مہرجان جو ایرانیوں کی دو بڑی عیدیں تھیں ان سے عرب خوب واقف تھے۔ چنانچہ جریر نے اضطل کی ہجو میں ان کا ذکر کیا ہے۔

[1] دیکھو رسالہ شرح حال عبداللہ ابن المقفع تالیف عباسی آشتیانی از انتشارات مجلہ ایرانشہر دورۂ دوم شمارہ ۱۵۔

عرصہ میں اس کتاب کی مختلف حیثیتوں سے ترمیم وتہذیب ہوئی اوراس طرح اس کے بہت سارے ترجمے اصل متن سے کئے گئے۔افسوس کہ خود یہ کتاب اور اس کے ترجمے صرف نام ونشان کی حدتک رہ گئے ہیں۔ان ہی کتابوں سے قرون اولیٰ کے اسلامی ادیبوں نے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔حمزۂ اصفہانی بیرونی۔ابن الندیم بلعمی اور مولف مقدمہ قدیم شاہنامہ اور مولف مجمل التواریخ "خداینامہ" کے مختلف نسخوں کے ناموں کو سلسلہ وار تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔اور جس ترتیب سے کہ ان کتابوں کا ذکر ہوا ہے اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ تاریخی ہے۔"خداینامہ" کے پہلوی سے عربی وفارسی ترجموں بامترجمہ ومحررہ نسخوں کے نام یہ ہیں۔(۱) سیرملوک الفرس ترجمہ محمد بن الجھم برمکی۔(۲) تاریخ ملوک الفرس جو خزانہ ماموں سے ملی (۳) سیرملوک الفرس ترجمہ زادویہ بن شاھویہ اصفہانی (۴) سیرملوک الفرس ترجمہ یاجمع محمد بن بہرام بن مطیار اصفہانی (۵) تاریخ ملوک بنی ساسان ترجمہ یا جمع ہشام بن قاسم اصفہانی (۶) تاریخ ملوک بنی ساسان مصححہ بہرام بن مروان شاہ موبد ولایت شاپور (صوبہ فارس) (۷) تاریخ ساسانیاں تالیف موسیٰ بن عیسیٰ الکسروی یا خسروی (۸) آثار الباقیۂ بیرونی میں بھی ایک کتاب سیرالملوک بہرام بن مھران اصفہانی کا ذکر کیا گیا ہے (۹) اوراسی طرح اسی مضمون کی ایک کتاب بہرام ھروی زردشتی کی لکھی ہوئی بیان کیجاتی ہے۔بلعمی نے تاریخ طبری کے ترجمہ کے دیباچہ میں اور تین کتابوں کا اضافہ کیا ہے اور وہ یہ ہیں (۱۰) تاریخ پادشاہان فارس (۱۱) کتاب ساسانیاں (۱۲) تاریخ یزدگرد تالیف موبدان موبد اردواد مورغاں۔شاہنامہ فردوسی کے قدیم دیباچہ میں اور بلعمی کے مقدمہ میں بیحد مطابقت پائی جاتی ہے صرف فرخان موبد ابن یزدگرد کا نام زیادہ بتلاتا ہے (۱۳) کتاب الفہرست میں کتاب سیرۃ الفرس مشہور بہ اختیار نامہ (خداینامہ) کا جو اسحٰق بن یزید کا ترجمہ ہے ذکر آیا ہے۔ایک مولف اور بھی ہے جس کی اہمیت چند وجوہ سے بڑھجاتی ہے اگرچہ اس کی کتاب کا نام ہم کو معلوم نہیں لیکن اس کے مطالب ہمارے پاس موجود ہیں جس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ مولف ابوجعفر زردشت بن آذرخور موبد متوکلی کے نام سے

مشہور ہے جسے معجم البلدان نے "محمد متوکلی" اور بیرونی نے "موبد متوکلی" اور ابن الفقیہ نے "المتوکلی" اور گمنام قلمی نسخہ میں جس کا بیان آگے آئے گا "ابوجعفر زادشت بن احرا الموبد الذی کان فی خلافۃ المعتصم" لکھا ہے۔ کتاب الفہرست (صفحہ ۳۰۵) میں بھی "المرید (الموبد) الاسود الذی استدعاہ المتوکل فی ایامہ من فارس" لکھا ہے۔ اس نے کلیلہ ودمنہ سے مواد لیکر ایک کتاب لکھی ہے سب سے پہلی مرتبہ یوسٹی (JUSTI) نے لکھا ہے کہ "احرا" جو گمنام نسخہ میں لکھا ہے یہی آذرخور ہے۔ اس لحاظ سے مشار الیہ فارس میں ایک زردشتی موبد تھا جس کو خلیفہ متوکل (۲۳۲-۲۴۷) نے فارس سے بغداد میں طلب کیا اور اپنے درباریوں میں شامل کیا۔ اور شاید اسی وجہ سے وہ لفظ متوکلی کے ساتھ مشہور ہوا۔ خلیفہ معتصم کے زمانہ میں بھی (۲۱۸-۲۲۷) اس کا نام مشہور تھا اور ممکن ہے کہ اس کی تالیفات اسی زمانہ کی ہوں اور متوکل کے زمانہ میں خلیفہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوکر نام بدلا ہو اور محمد کے نام سے موسوم ہوا ہو۔

اُن کتابوں سے جو خداینامہ اور تمام پہلوی کتابوں کے صحیح نمایندے تھے کوئی کتاب باقی نہیں رہی۔ وحشی مغلوں کے حملہ کے طوفان نے دوسری اسلامی تمدن کی کتابوں کی طرح ان کتابوں کا بھی نام ونشان باقی نہیں رکھا حمزہ اصفہانی کے پاس جس نے ۳۵۱ھ میں اپنی کتاب لکھی ہے ابتدائی سیر الملوک کی سات کتابیں اور کسروی کی کتاب موجود تھی۔ لیکن بعض کتابوں کے حصے اور خاص کر ابن المقفع۔ کسروی اور بہرام موبد کی کتابوں کے ٹکڑے موجودہ تالیفات میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

ہجرت کی ابتدائی صدیوں میں اور خصوصاً عباسیوں کی خلافت کی ابتدا سے شاہنامہ فردوسی کی تالیف تک قدیم ایران سے متعلق حالات اور اس کے آثار وعقاید اور تاریخ وآداب اور مذہب کے متعلق تالیفات اور ایران میں نشوونما پائے ہوئے پہلوی اور سریانی کتابوں کے ترجمے اس کثرت سے تھے کہ حقیقت میں اس زمانہ کو شاہناموں اور ایران کی قومی روح کی نشاۃ کا عہد کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں سیر الملوک اور اسی طرح کی ایران کی تاریخی کتابوں اور پہلوی قصوں کے علاوہ پہلوی کی دوسری کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا اور عربی میں قدیم ایران کے متعلق بہت ساری تالیفات ہوئیں۔ ان کتابوں کا

آگے مختصر طور پر ذکر کیا جائے گا۔

علامہ نولدکہ کے دیباچہ کا خلاصہ

خدانیامہ اور اس کے ترجمہ اور تصحیح کے بارے میں سب سے بہتر یہ ہے کہ ذیل میں علامہ نحریر استاد نولدکہ کے مبسوط دیباچہ کا جو احوال ساسانیاں از تاریخ طبری پر لکھا ہے خلاصہ کر دیں۔ محقق مشارالیہ لکھتا ہے :-

"خدانیامہ ابتدائے آفرینش سے ساسانیوں کے آخر عہد تک ایران کی تاریخ پر مشتمل ہے اور اس میں اساطیری داستانوں اور افسانوی روایتوں اور تاریخی بادشاہوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اسی سبب سے اسلام کے بعد کے عربوں اور ایرانیوں نے جن کا ماخذ یہی کتاب رہی ہے کسی وقت بھی انہوں نے اس بات کا احساس نہیں کیا کہ ہوشنگ اور رستم کی ہستیاں اس قدر اصلی تاریخی نہیں ہیں جتنی کہ شاہور، بہرام چوبین اور دوسرے تاریخی اشخاص کی۔ اساطیری داستانیں جن کی بنیاد اوستا کے منقولات پر ہے جیسا جیسا زمانہ گذرتا گیا پھیلتی گئیں اور ان کے حجم میں اضافہ ہوتا گیا اس کے علاوہ آفرینش اور تمدن اور قانون وغیرہ کے بارے میں موبدوں اور ہیربدوں کی روایتوں تفسیروں اور شرحوں کا اور اسی طرح بعض نسب ناموں کا اصل داستان میں اضافہ کیا گیا۔ مثلاً سکندر نامہ کا قصہ جو محض خارجی یعنی یونانی الاصل ہے بے سروپا داستان میں شامل کر دیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ حصہ قدیم ایرانی داستان کا جزو رہ چکا ہے۔

سلوکیوں اور اشکانیوں کے طویل زمانہ کی کوئی چیز سوائے چند ناموں کے باقی نہیں رہی۔ ساسانیوں کے بہت سارے واقعات اب بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس سلطنت کے بانی (اردشیر) کے زمانہ کے صحیح واقعات کے علاوہ بہت ساری افسانہ آمیز داستانیں جو زبانزد خلایق تھیں یا یہ کہ کتابی شکل میں موجود تھیں غالباً خدانیامہ میں داخل ہو گئیں۔ ان میں تاریخی اہمیت بہت کم پائی جاتی ہے اردشیر سے یزدگرد اول (۳۹۲-۴۲۰) کے زمانہ تک بادشاہوں کے

حالات اور تفصیلات کا بہت کم علم تھا مگر خدائینامہ کے جو آثار باقی رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی حصہ کے نقصان کی تلافی عبارت آرائی خطبوں اور پادشاہوں کے تخت نشینی تقریروں اور وصیتوں سے کی گئی ہے لیکن یزدگرد اول کے بعد کے زمانہ کا خوب مواد موجود تھا۔ خدائینامہ اور اسی کی جیسی کتابیں نہایت مبالغہ آمیز اور شاندار ہیں اور صنایع و بدایع سے بھری ہوئی۔ چنانچہ ان کا عربی خلاصہ جو بالواسطہ ہمارے پاس آگیا ہے تکلفات سے بھرا ہوا ہے۔ جاحظ نے اپنی تصنیف کتاب البیان والتبیین میں شعوبیں اور ان کی کوشش کے بارہ میں جو عجم کی فضیلت عرب پر ثابت کرنا چاہتے تھے قریب قریب اس مطلب کو ادا کیا ہے "جو شخص ادب، دانشمندی، علم محفل، عبرت، ضرب الامثال اور لطیف عبارت آرائی اور پاکیزہ خیالات کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُسے سیر الملوک اور تاریخ سلاطین پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔"

حمزہ اصفہانی نے بھی ایران کی تاریخی کتابوں کے متعلق اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔ یہ داستانیں مبالغہ آمیز شاہ پرستانہ تھیں اور ان میں سلاطین کے نسب کو صحت سے بیان کرنے کا التزام تھا۔ اشراف و اعیان اور موبدوں کے اثرات کو بھی ان میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اور یہ داستانیں نہایت شجاعت انگیز اور رزمیہ مضامین پر مشتمل ہوتی تھیں اور ان میں اس بات کی کوشش کیجاتی تھی کہ ایران کے رتبہ اور شان و شکوہ کو بلند کر کے بتلایا جائے اور مقبول عام بنایا جائے۔ بعد میں متاخرین کی جانب سے بعض بہرقی کی روایتیں ان میں داخل ہو گئیں مثلاً بادشاہوں کی قبروں کے کتبے وغیرہ۔ تمام نقائص و معائب کے باوجود خدائینامہ جو مصور تاریخی کتاب تھی اور ساسانیوں کے عہد میں لکھی گئی تھی اور خصوصاً اس کا وہ حصہ جو ساسانیوں کے احوال پر مشتمل ہے بہترین تاریخی ماخذ رہے ہیں۔

اب جب کہ کارنامۂ اردشیر کے سوائے جس قدر تاریخی کتابیں اور قصے جو پہلوی میں موجود تھے بالکل مفقود ہو گئے ہیں اور ایسی عربی مترجم تالیفیں جو براہ راست پہلوی اصل سے تیار کی گئی تھیں وہ بھی دستیاب نہیں ہوتیں تو بعض باتوں کے متعلق ہمارے معلومات بالکل ناقص رہ جاتے ہیں۔ مثلاً ہمیں اس وقت تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہے کہ آیا خدائینامہ کے علاوہ کوئی دوسری کتاب بھی ایران کی عام تاریخ پر پہلوی

ہیں موجود تھی یا کیا اور جو جزئی اختلافات روایتوں میں واقع ہوئے ہیں اور جن کا ایک حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے دراصل پہلوی تحریرات میں پہلے سے موجود تھے یا یہ کہ خداینامہ کی ترتیب و تہذیب و تصحیح و ترجمہ کے دوران میں واقع ہوئے۔ یہ بات بھی بعید از عقل نہیں معلوم ہوتی کہ خداینامہ کے بعض نسخوں میں پہلوی کی اور کتابوں سے مواد لیکر اضافہ کیا گیا ہو مثلاً قصہ بہرام چوبین (جس کا بیان اصل خداینامہ میں نہیں پایا جاتا بلکہ بعد میں ساسانیوں کے عہد میں داخل کر دیا گیا) بہرام موبد شہر شاپور (صوبہ فارس) نے بقول حمزۂ اصفہانی خداینامہ کے بیس سے زیادہ نسخوں کی باہم مطابقت اور ان کا مقابلہ کیا ہے۔ اور مطابقت کے ذریعہ اختلافات کی اصلاح کی ہے۔ موسیٰ بن عیسیٰ الکسروی نے بھی نسخوں کے اختلافات کی شکایت کی ہے۔ مگر دونوں کی شکایتیں بعض بادشاہوں کی سلطنت کے مدت کے شمار میں ہیں اور کسروی نے تو خصوصاً ترجمہ کی غلطیوں سے بحث کی ہے جو عربی ترجموں میں پائی جاتی ہیں۔

بہرحال تاریخ طبری کے مطالعہ سے اور خصوصاً تمام عربی ماخذ اور فردوسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی بادشاہوں کی تاریخ کے بعض بڑے حصے اصلی پہلوی ماخذ میں ایک حد تک مختلف صورت میں رہے ہیں چنانچہ طبری نے اس حصہ میں جو تاریخ ایران سے متعلق ہے غالباً دو روایتیں بیان کی ہیں جن میں سے ایک کی مطابقت ابن بطریق اور ابن قتیبہ کی روایتوں سے ہوتی ہے جن کا ماخذ ابن المقفع کا عربی ترجمہ ہے اور دوسری روایت کی مطابقت زیادہ تر الیعقوبی اور فردوسی کے بیانات سے ہوتی ہے۔ (یہ روایت عربی ترجمہ کے واسطہ سے نہیں لی گئی ہے بلکہ اصل پہلوی متن سے لی گئی ہے) پھر یہ دونوں روایتیں بنیاد میں اور اصلی خصوصیات میں ایک مشترک اصلی پہلوی متن تک پہنچتی ہیں۔ صرف بحث اس بات میں ہے کہ ان روایتوں کا اختلاف آیا خداینامہ سے قدیم تر ہے یا اس کے بعد کا۔ یہ بھی زیادہ تر ادبی مسئلہ ہے نہ کہ تاریخی۔

ابن المقفع کے سیر الملوک کا تلف ہو جانا سب سے زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ اس کا ذکر حمزہ اصفہانی اور دوسرے مورخین نے جن کے پاس یہ کتاب موجود تھی تمام سیر الملوک کی کتابوں کے ذکر پر مقدم رکھا ہے۔ ابن المقفع نے اپنے ترجمہ میں بہت محنت اور اصلی متن سے مطابقت پیدا کرنے میں بڑی

کوشش کی ہے حقیقت میں وہ ایرانی سلطنت کی تاریخ کے ترجمہ کو معاصرین کے ذوق کے ساتھ مطابقت کرنیکی طرف مائل رہا ہے۔ البتہ کہیں کہیں جہاں مسلمانوں کی مذہبی حسیات ملحوظ تھیں دوسرے مولفین اور ترتیب دینے والوں کی طرح اس نے بھی حذف وتغیر سے کام لیا ہے لیکن بظاہر ترجمہ میں کچھ زیادہ تصرفات نہیں ہیں حتی کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ اس نے اصلی پہلوی نسخہ میں اصل سے زیادہ قلم کو جولان دیا ہو اور عبارت آرائی بتلائی ہو۔ اور اگر خاص کر ابن المقفع کی کتاب کے مندرجات کی مطابقت تمام مستقل اور قریب قریب راست ماخذوں سے کی جائے جو اصل سے ترجمہ کئے گئے ہیں مثلاً وہ شاہنامہ جو فردوسی کا ماخذ ہے تو یہ مطابقت ابن المقفع کی ذات سے اس قسم کی بدگمانی کو دور کردیتی ہے۔

ممکن ہے کہ مسلسل کوششوں کے ذریعہ ابن المقفع کی کتاب سیر الملوک کے موجودہ حصوں کو مختلف کتابوں سے ایک جگہ جمع کرلیا جائے لیکن بدقسمتی سے یہ تمام قطعات صرف ادبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور عبارت آرائی کے نمونے۔ اہم حصے بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔

ابن القتیبہ کے عیون الاخبار میں ابن المقفع کی سیر الملوک کے چند حصے پائے جاتے ہیں اور ان میں سے ایک حصہ زیادہ تفصیل کے ساتھ فیروز کی سلطنت کے خاتمہ کے بیان میں ہے اور یہی حصہ (یعنی انجام فیروز) بعینہ کچھ اختصار کے ساتھ سعید بن بطریق (اسکندریہ کا نصرانی یا ملکی جو اوتیکیوس (EUTYCHIUS) کے نام سے مشہور ہے اور جس نے اپنی کتاب آخری عمر میں لکھی ہے) کی کتاب میں بھی پایا جاتا ہے۔ کئی ایک دلائل سے معلوم ہوگیا کہ ایرانی تاریخ کے بارے میں ابن بطریق کا ماخذ بھی مستقل طور پر ابن المقفع کی کتاب ہے طبری نے بھی ایک روایت ابن المقفع کی سیر الملوک سے لی ہے لیکن مستقل طور پر طبری نے کتاب مذکور سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ ایرانی تاریخ کے لئے دوسرے ماخذوں کے علاوہ ایک اور کتاب بھی اس کے پاس موجود تھی جو دوسری سیر الملوک تھی جس میں ابن المقفع کی روایتوں کے علاوہ اور بھی روایتیں ملتی تھیں۔ ایک گمنام کتاب کا نسخہ جو "اسپرنگر ۳۰" سے مشہور ہے اس کے اور طبری کے درمیان ایک دوسرے سے اخذ کرنے میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ بذات خود ایک مکمل کتاب ہے۔ اور پھر وہ حصہ جو ایران کی تاریخ

متعلق ہے اور وہ مقامات جہاں خود طبری نے دو روایتیں لکھی ہیں اس کتاب میں بھی دو روایتیں موجود ہیں۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں کا ماخذ ایک اور اصل کتاب ہے چنانچہ بعض موقع پر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طبری کے پاس اس قدیم اصلی کتاب کا ایک نسخہ موجود تھا ان دونوں کتابوں کا یعنی طبری اور اس گمنام کتاب کا وہی حال ہے جو ابن المقفع کا اور دوسری روایتوں کا یعنی جس طرح سے ابن المقفع کی روایتیں اور دوسری روایتیں ایک اصلی نسخہ پر منتہی ہوتی ہیں اسی طرح سے طبری اور اس گمنام کتاب کی روایتیں ایک اصلی ماخذ سے لی گئی ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اصلی نسخہ کی عبارت کو بقدر امکان یا تو مختصر کر دیا ہے یا بعینہٖ اخذ کر لیا ہے۔

اس دوسری روایت کا اصلی ماخذ جو ابن المقفع کی کتاب کے سوائے ہے وہ بظاہر ایک کتاب ہے جس کو یعقوبی نے (جو ۲۸۰ھ کے حدود میں زندہ تھا) بھی اپنی کتاب جو سامانیوں کے حالات میں لکھی گئی ہے اور اس مقدمہ میں جو اس نے خلفائے بنی عباس کی تاریخ پر لکھا ہے استعمال کیا ہے۔ اور اس کی مطابقت زیادہ تر طبری کی دوسری روایت اور گمنام کتاب کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ یعقوبی نے بعض جگہ پر دوسری خبروں کا اس روایت کے علاوہ ذکر کیا ہے۔ اس کی دوسری روایت کی مطابقت فردوسی کی روایت کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔ اس دوسرے ماخذ (ابن المقفع کے سوائے) کی حقیقت معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ متعدد سیر الملوک سے جن کے نام ہم تک پہنچے ہیں مواد جمع کر کے ایک کتاب لکھی گئی ہو۔ یہ تمام سیر الملوک ابن المقفع کی کتاب کے بعد لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ ہر جگہ پہلے ابن المقفع کا نام لیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد محمد بن مجہم برمکی کا نام ہے جو برمکیوں کے میروں میں سے تھا اور برمکیوں کا عروج ابن المقفع کی وفات کے بعد ہوا۔ غالباً ان سیر الملوک کے مولفین نے اپنے نامی گرامی پیشرو یعنی ابن المقفع کی کتاب سے استفادہ کیا ہے لیکن صحیح طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کتابوں میں اور ابن المقفع کی کتاب میں جزئیات اور امورات کی تفصیلوں میں اختلاف کا کیا سبب ہے ممکن ہے کہ بعض مولفین نے غیر ایرانی ماخذ سے بھی روایتیں اور داستانیں لی ہوں اور اپنے اپنے سیر الملوک میں درج کرایا ہو۔ اور ان سیر الملوک کے بعض مولفین نے کسی دوسرے

قصوں کی کتابوں سے جو پہلوی میں متعدد تھے اقتباس کیا ہو۔ طبری میں ایک اور قسم کی روایتیں اور افسانے پائے جاتے ہیں جن کا نام و نشان نہ گمنام کتاب کے نسخہ میں ہے اور نہ ان کتابوں میں سے جو راست یا بالواسطہ ابن المقفع سے ماخوذ ہیں۔ اور نہ فردوسی میں ان کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی روایتوں کے نشوونما کی جگہ بالکل تاریک اور محتاج تحقیق ہے۔"

یہ اُن چیزوں کا ایک حصہ ہے جو علامہ نولدکہ نے ۴۴ سال قبل اپنے شاہکار اور بے مثل کتاب کے مقدمہ میں یعنی تاریخ طبری سے ساسانیوں کے حالات کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے بیان کی ہیں۔ اور ان کا بہترین مقصد اس مقدمہ میں طبری کی ساسانی اور روایتوں کے ماخذ کی تحقیق اور توضیح ہے۔

تاریخ کے سوائے دیگر ایرانی کتب کا ترجمہ

الغرض خدای نامہ کے اور دوسری تاریخی یا داستان یا قصوں کی پہلوی کتابوں کے براہ راست مترجمین کے سوائے اور ان مولفین کے علاوہ جنہوں نے ان ترجموں سے مواد لیکر کتابیں ترتیب دی ہیں یا اُن ترجموں کی اصلاح کی ہے۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں خصوصاً دوسری صدی کی ابتدا سے چوتھی صدی کے آخر تک بہت سارے ایسے مولفین اور مترجمین بھی تھے جنہوں نے تاریخ کے سوائے تمام ایرانی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور اس طرح قدیم ایران کے متعلق اطلاعات اور معلومات کے وسیع کرنے میں بہت جانفشانی کی ہے۔ قدیم ایران کے آثار اور آداب اور اوضاع کے متعلق مستقل کتابیں یا فصلیں لکھی ہیں اور ان تمام چیزوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ اور معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ انہوں نے ان صدیوں میں جمع کر کے ہمارے لئے چھوڑا ہے ایران کی قومی روح کو بیدار کرنے اور شعوبیہ کے دعوں کو ثابت کرنے کی بیحد کوشش کی ہے۔ اسی قسم کی تحریریں رفتہ رفتہ داستانوں اور شاہناموں میں وسعت کے ساتھ بیان کی جانے لگیں تاکہ عامۃ الناس کو اس مضمون سے خاصی دلچسپی پیدا ہو جائے۔

(باقی دارد)

روحِ عمل کی نذر

از

جناب عبدالقیوم صاحب باقی

تصویرِ حقیقت، آ کہ تجھے اک آئینۂ دل نذر کروں
تجھ لیلیٰ جاں پرور کے لئے اک پردۂ محمل نذر کروں

تو رازِ کمالِ عالم ہے، تو نورِ جبینِ آدم ہے
ہر سانس تری اے روحِ ازل، فردوس بریں آدم ہے

آئینۂ حسنِ کون و مکاں، ہر وقت تری آغوش میں ہے
اک نغمۂ سازِ الست، تری دنیائے دلِ خاموش میں ہے

تشکیلِ خیال و خواب کرے، اعجازِ صداقت سازترا
ہے شورِ محفلِ کُن فیکون اک نعرۂ خوش آواز ترا

تدبیر کی شمعِ درافشاں، روشن ہے تیری خلوت میں
اک نورِ منزلِ عیش ہے تو تقدیر کی وادیٔ ظلمت میں

تو آتشِ دشتِ ایمن ہے، تو جلوۂ سینۂ دامن ہے
ہے برقِ رگِ خونِ دہقاں، جو تیرا دانۂ خرمن ہے

اے مامنِ ہستیِ انسانی، اے بازوئے قوتِ یزدانی
بھاتی ہے تجھے یزداں کی طرح اس ارض و سمائی جہانبانی

اسرارِ ترقی دکھلا کر، فطرت جو ہوئی ہمراز تری
ہونے لگی عرش و کرسی پر اے طائرِ جاں پرواز تری

فردوسِ بریں، حاصل ہے تری، اک سعیِ سراپا لذت کا
اور آتشِ دوزخ شعلۂ دل ہے تیرے چراغِ تربت کا

تاریخ کی خوش آیند فضا، دھندلی سی ہے اک تصویر تری
اقوام کا قصرِ عالیشاں، چھوٹی سی ہے اک تعمیر تری

کرتا ہوں خلوصِ دل سے میں، کعبے کا ترے ہر روز طواف
لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی یہ میرا ہے نو آموز طواف

اے طائرِ بامِ حور و ملک، کر مجھ کو عطا پرواز تری
اک جامِ حیات لب سے پلا، مجھ کو بھی عمرِ دراز تری

اک خواب ہو بعدِ مرگ عطا، جو خلوتِ جاں پر نور کرے
جو نغمۂ امن و رحمت سے، کاشانۂ دل معمور کرے

باغبان

(ایک افسانہ)

جناب مولوی عزیز احمد صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۱)

ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔

باغ کی سطح ذرا نیچی تھی، اور کبھی کبھی برسات میں ندی کا پانی، باغ کے نشیبی حصوں میں پہنچ جاتا تھا۔ پاس ہی سے سڑک گذرتی تھی، جہاں سے باغ کا منظر قابل دید تھا۔ راہ گیر جاتے جاتے ضرور نظر بھر کے پھولوں کے تختے کو دیکھ لیتے۔ اور بچے ندی کے پل پر بیٹھ کر، پھلوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے۔

ندی آہستہ آہستہ بہتی، اور درختوں کا سایہ اُس پر لرزتا ہوا معلوم ہوتا۔ ہوا چل کر ٹہنیوں کو ہلاتی، اور پھول رقص کرنے لگتے۔ انسان کا تھکا ہوا دماغ دن بھر کے کام کاج کے بعد فطرت کی اِن دلکشیوں میں کسقدر لطف پاتا ہے

اس باغ کا مالک جب دن بھر کی محنت کے بعد اس باغ میں آتا، تو اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔

لیکن ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کو اس باغ سے بے پایاں محبت تھی۔ وہ اس باغ کا مالی تھا.....

اس باغ کا مالی جس نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے ان پودوں کو پالا پوسا تھا۔ گرمیوں میں ان کو پانی دیا تھا، دن دن بھر ان پودوں کی تراش خراش کی تھی۔ اور ان کی زندگی اور ترقی کا خیال اس کا نصب العین بن گیا تھا۔

وہ اکیلا تھا۔ اُس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا ــــ شاید کوئی دور کا عزیز ہو، مگر ایسا تو کوئی نہ تھا کہ جس کی کفالت اس کے ذمہ ہو۔ اس لئے بھی باغ اس کے لئے دنیا تھا۔ اس کی ساری محبت ان پودوں میں محصور ہو گئی تھی۔ وہ ان کو پروان چڑھتے دیکھ کر خوش ہوتا، جیسے کوئی اپنے بچوں کو پروان چڑھتے دیکھ کر خوش ہو۔ تنخواہ اس کی تن پوشی کے لئے کافی تھی۔ اور اسے لے دے کے اگر کوئی فکر تھی تو صرف باغ کی۔

وہ باغ کی خدمت اس لئے نہیں کرتا تھا کہ یہ اس کا فرض تھا۔ غالباً اُس نے اپنے فرض کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ وہ پودوں کو اپنے بچے سمجھتا، اور ان سے محبت کرتا۔ جیسے کوئی باپ اپنے بچے سے محبت کرے۔

جب ہوا پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو کو اڑا کر پریشان کرتی تو وہ مست ہو جاتا ـــــ اس کے دل میں محبت کا پاکیزہ ترین جذبہ تھا، اور یہ اسی محبت کا اثر تھا، کہ وہ ان پھولوں کی خوشبو میں ایک خاص فرحت اور لذت پاتا۔ وہ اکثر محبت بھری نظروں سے ندی کو تکا کرتا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ندی اس کے باغ کے پاس سے بہتی تھی، اور اس کے درختوں کو پانی دیتی تھی۔

اور اس طرح اس کی زندگی مسرت کیف، اور لطف سے لبریز تھی۔ یہ سب محبت کا اثر تھا۔ اور محبت جو ہر دل میں کم و بیش موجود رہتی ہے، اس کے دل میں بھی تھی اور اسے دنیا و مافیہا سے بے پروا بنا چکی تھی۔

اس کا مالک جب باغ میں آتا، اور باغ کی تر و تازگی کو دیکھتا تو ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا "یہ سب مالی کی محبت کا اثر ہے۔ ہر ہر پھول سے مالی کی محبت کی خوشبو آ رہی ہے"

شاید وہ اپنی محبت کو یاد کرنے لگتا، جو اس کے نوجوانی کے زمانے کی بہترین یادگار تھی۔

(۲)

دن گذرتے گئے۔ مالی بڈھا ہوتا گیا، اور درخت تناور ہوتے گئے۔

اس کے مالک نے باغیچہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ باغبان اب بہت بڈھا ہو گیا تھا۔ درختوں کو اب بڈھے کی خدمات کا احتیاج نہ تھا۔ بڈھے کے ہاتھ پیر، اب درختوں کی خدمت کر بھی نہ سکتے تھے۔ حالانکہ اُس کی دلی محبت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت ان پرندوں کی سی تھی جو درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر اور پھولوں سے مخاطب ہو کر نغمہ سرائی کرتے۔ بڈھا مالی بہت فرط مسرت سے کوئی دیہاتی راگ گانے لگتا

ایک دن نئے آقا نے بڈھے مالی کو بلا کر کہا "یہ لو اپنی تنخواہ۔ اب تم بڈھے ہو گئے۔ باغ تم سنبھال نہیں سکتے، جاؤ اور گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کرو۔ اب تم کام نہیں کر سکتے اور یہ خدا کو یاد کرنے کا زمانہ ہے،

اور یہ لو انعام۔"

بڈھے مالی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور میری ایک تمنا پوری کر دیں گے؟"

"کیا؟"

مرنے کے بعد میری قبر پر اس باغ کا ایک پھول ڈال دیجئے گا۔"

یہ کہہ کر کہنہ سال باغبان نے ایک سرد آہ بھری، اور لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر نکل گیا۔

نیتشے اور اس کا فلسفہ

جناب مولوی جعفر حسن صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

(معتوبین عہد میں نیتشے کا شمار ۔ نیتشے کی شخصیت ۔ نیتشے کی زندگی، فلسفۂ رجائیت، نظریۂ فوق البشریت: نیتشے کا پیغام عمل ۔ نیتشے کا کارنامۂ حیات)

اپنی زندگی میں نیتشے "معتوبین عہد" میں شمار ہوتا تھا اور جنگ کے اختتام تک ایک براعظم ہی کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی نظروں میں نیتشے ملعون ترین اور حقیر ترین خلائق میں سے تھا اور بجز چند مستثنیات کے بیشتر نفوس کا چاہے امیر ہوں کہ غریب، قدامت پسند ہوں کہ انقلابی، جرمن ہوں کہ فرانسیسی، مذہبی ہوں کہ عیسائی، مرد ہوں کہ عورت، نیتشے پر غضبناک عتاب تھا۔

امیر جو علم، فن، سلطنت، معاشرت کو اپنے بس میں لا چکے تھے۔ (دور انتہائی سرمایہ داری) اس وجہ سے بگڑے ہوئے تھے کہ وہ انہیں بھی فوق الانسان نہیں تصور کرتا تھا، غریب اس وجہ سے نالاں تھے کہ وہ جمہوریت اور مساوات حقوق کا قائل نہ تھا، جرمن اس وجہ سے خلاف تھے کہ وہ جرمانیہ کی تحقیر کرتا تھا اور اس کی نظر یورپ کی طرف اٹھتی تھی، عیسائی اس وجہ سے ناخوش تھے کہ وہ عیسائیت کا دشمن تھا اور مذہبی اس وجہ سے برانگیختہ تھے کہ وہ خدا کا منکر اور لامذہبیت کا پیرو تھا، لوگ اس وجہ سے ناراض تھے کہ اس نے انسانوں یعنے اشرف المخلوقات کے مقابلہ میں "فوق الانسانوں" کے ورود کی تلقین کی اور اشرف المخلوقات کے احساسات کو ٹھیس لگی اور ان کے دل نے گواہی دی کہ اشرف سے بہتر ہونا لایعنی بات ہے۔ عورتوں کی نفرت تو لازمی بات تھی۔ اپنے سے نفرت کرنے والے کو وہ کیونکر پسند کر سکتی تھیں۔

بہرطور جیسے جیسے کہ نیتشے کی تصانیف اور خیالات کا شہرہ ہوگیا ویسے ہی یورپ کا عتاب

نیتشے پر پڑھتا گیا حتیٰ کہ دوران جنگ میں اسے ملعون ترین انسانوں میں شمار کیا جانے لگا۔ مگر سچائی اور حقیقت چھپائے نہیں چھپتی اور نہ نور کا ظہور رات کی تاریکی سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو سکتا ہے۔ بالآخر وہی ہوا جس کی کہ امید تھی، جو سچے گوہر شناس تھے وہ سمجھ گئے تھے کہ نیتشے ایک حقیقت شناس فلسفی ہے جس کے تصانیف کی اہمیت کو ایک زمانہ کی مخالفت بھی نہ کم کر سکے گی۔

نیتشے کی شخصیت

نیتشے کی شخصیت ان دنوں بین الاقوامی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے خیالات اور تصانیف نے بہت سے بڑے بڑے آدمیوں کی ذہنیت پر اثر کیا ہے اس کی وجہ سے نور کا ظہور ہوا، دنیائے فلاسفی میں نئی جان پڑی، علم تمدن، اخلاقیات نفسیات، سیاسیات، عمرانیات کے ذخیرۂ معلومات میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ حق و باطل، صحیح و غلط میں امتیاز کر سکتے میں آسانی ہوئی۔ غرضکہ اس تنہا ہستی نے علوم ذہنیہ و علوم عمرانی کے مختلف مسائل پر تحقیقات کر کے نہ صرف انہیں اپنی قابلیت سے مستفید کیا بلکہ اپنی تحقیقات کو لاجواب، پاک و صاف زبان میں بیان کر کے جرمانی زبان و جرمانی ادبیات پر ایک احسان عظیم کیا۔ یہ بات ان حضرات کے لئے بھی جو نیتشے کے نام سے کم و بیش واقف ہیں تعجب انگیز ہوگی کہ نیتشے جرمانی زبان میں شاعری بھی کرتا تھا مگر اس کی نثر بالخصوص، قادر الکلامی اور دلآویزی کے لحاظ سے بمثل سحر آگین اور اس درجہ ہر دلعزیز سمجھی جاتی ہے کہ خود منافقین اور مخالفین کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کم از کم الفاظ میں موسیقیت بے نظیر ہے وہ نثر کے پردہ میں شاعری اور شاعری کے روپ میں فلسفہ بیان کرتا تھا۔ وہ دنیائے مغرب کا آخری فلسفی[1] جرمانی ادبیات کا بہترین بے نظیر نثر نگار، قومیت کا مخالف، فوق البشریت کا دلدادہ اور علوم ذہنیہ کا اعلیٰ ظرف محقق تھا۔

---

[1] نیتشے کے بعد یورپ و امریکہ نے کوئی قابل لحاظ فلسفی پیدا نہیں کیا۔ سچ پوچھئے تو کانٹ کے بعد ہی سے دنیائے علوم ذہنیہ کا آفتاب آہستہ آہستہ غروب ہونے لگا۔ اس سورج کی آخری کرن نیتشے تھا۔

نیتشے اس قدر گوناگوں قابلیتوں کا آدمی تھا۔ اور اس نے اس قدر مختلف النوع موضوعات مثلاً اخلاقیات، فنون لطیفہ، شاعری وغیرہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ ان کے اعادہ کے لئے ہی ایک جداگانہ تصنیف کی ضرورت ہوگی لہذا اس مضمون میں صرف نیتشے کے چند اہم ترین نظریات کے بیان کرنے کی اور نیتشے کے کارنامہ پر اختصار مگر جامعیت سے نظر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

نیتشے کی زندگی نیتشے کی سوانح حیات ان لوگوں کے لئے نہایت ہی سبق آموز ہے۔ جو اگرچہ خود قابل ہیں ساتھ ہی ایثار کے خواہشمند یا ترقی کے دلدادہ ہیں نیتشے کی عمر (۲۴) برس کی تھی اور وہ ابھی جامعہ لائپزنگ میں یورپی السنہ قدیمہ کا طالب علم تھا۔ اس زمانہ کے مستند عالم السنہ قدیمہ پروفیسر رچل (RITSCHL) اسی جامعہ میں یونانی اور لاطینی پڑھایا کرتے تھے۔ سوئٹزرلینڈ کی یونیورسٹی بازل میں جب یونانی اور لاطینی پروفیسر کی ضرورت ہوئی تو وہاں کے عہدہ داران متعلقہ نے پروفیسر رچل سے مشورہ کیا بلکہ انہیں نامزدگی کا بھی حق دیا۔ پروفیسر نے پوچھا "تمہیں مشہور نام کا آدمی چاہیئے یا کام کا؟" وہ لوگ بھلا کیا جواب دیتے مجبوراً کہنا ہی پڑا کہ انہیں کام کے آدمی کی ضرورت ہے جس پر پروفیسر رچل نے نیتشے کو پیش کیا۔ ایک اَن ہونی بات ظہور میں آئی اور نیتشے کا بازل یونیورسٹی میں بہ حیثیت پروفیسر السنہ قدیمہ تقرر ہوا اور یورپ کے دنیائے تعلیمات نے یہ تعجب خیز مشاہدہ کیا کہ طالب علمی کا زمانہ ختم ہی نہ ہوا تھا کہ معلمی کا دور شروع ہوا۔ یہ خبر پاتے ہی کہ بازل یونیورسٹی میں نیتشے بہ حیثیت پروفیسر جانے والا ہے، جامعہ لائپزگ نے نیتشے کو اعزازی ڈاکٹر فلسفہ (D PHIL H.C.) کی سند عطا کی اور اس طرح افق علم پر یکایک ایک منور ستارہ نمودار ہوا۔

اسی وقت سے نیتشے نے اپنے تئیں خود کو علم و تحقیقات، فنون و زبان، ادب و شاعری کے لئے وقف کر دیا۔ دن رات کی مسلسل محنت، سالہا سال کی جانسوزی و کتب بینی، ہمیشہ کے فکر تحلیل مسائل اور روزمرہ کے بحث مباحثوں نے اس کی صحت کو خراب کر کے رکھا۔ ایک ہشیار

آدمی ہوتا تو پھر بھی اپنے تئیں خود کو سنبھال لیجاتا مگر نیتشے یونہی علمی تحقیقات میں مستغرق رہا۔ اس کے شوق وانہماک میں، اس کی محنت ومشقت میں کچھ کمی نہ ہوئی جب اُسے مہلت ملتی اور جس قدر اُسے موقع ملتا، وہ علم ادب کی خدمت میں صرف کرتا۔ صحت کے خراب ہوجانے سے نیتشے کو اپنی نوکری سے سبکدوش ہونا پڑا۔ تمام جسمانی آسائش زندگی سے محروم رہنے لگا۔ نیتشے ہمیشہ علیل رہتے رہتے دائم المریض بنگیا۔ زمانہ کی نیرنگیوں اور وقت کی نامساعدت سے نیتشے کو گوناگوں تکلیفیں پہنچیں۔ لوگوں نے اُسے ذلیل کیا، یورپ نے بیقدری کی، ساتھ ہی صحت کی خرابی نے اور مصیبت ڈھائی ان تمام تکالیف سے نجات پانے کے لئے۔ نیتشے سوئٹزرلینڈ کے ایک خاموش مگر پرفضا مقام پر جابسا اور صحت یابی کی موہوم امیدمیں حسب معمول اپنے شغل تصنیف وتالیف میں سرگرم رہا۔ حتیٰ کہ جس طرح اندیشہ تھا (۴۳) سالہ عمر میں اس کی ذہنی وفات ہوئی یعنے مثل اردو کے بہترین نثرنگار کے جرمانی زبان کا بہترین نثرنگار بھی مخبوط الحواس ہوگیا۔ اور کامل (۱۰) سال اپنی ہمشیرہ کی مہربانیوں کا مرہون احسان ہوکر ۱۹۰۰ء میں وفات پائی۔ اس طرح نیتشے نے نیک نیتی مگر نادانی، صدق دل مگر غیر دانشمندی سے اپنی صحت علم وادب، شاعری وموسیقی پر قربان کردی۔ اور اس کی مخبوط الحواسی نے اس کے مخالفین کو پروپیگنڈا کا خوب موقع دیا اور جہاں کہیں نیتشے کا تذکرہ آتا تھا لوگ کہتے تھے کہ وہ پاگل ہے، اب بھی وہ لوگ جو نیتشے کے تخیلات، اور اس کے نظام فلاسفی سے اتفاق نہیں کرتے ہیں اور بحث مباحثہ کے وقت استدلال سے کام نہیں چلتا یہ کہہ کر ٹالدیتے ہیں کہ وہ تو پاگل تھا! یہ غیر علمی طریق استدلال ہے۔ یہ علمیت اور علمی تحقیقات کے شایان شان نہیں کہ ہم ایک شخص کے ان خیالات ونظریات کو پاگل پن سے تعبیر کریں جو اس نے سیانے پن میں بیان کئے ہوں[1]۔

---

[1] یہ بھی مخالفین کے پروپیگنڈا کی وجہ سے مشہور ہے کہ نیتشے کو ذہنی امراض کی شکایت رہتی تھی۔ یہ صحیح نہیں ہے ثبوت کے لئے دیکھئے:۔ "FR. NIETZSCHE: SEIN LEBEN UND SEIN WERK" مصنفہ RAOUL RICHTER مطبوعہ DIIRR بمقام لائپزگ سنہ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۰ تا ۸۳۔

جس طرح ایک عاقل آدمی کے ان افعال و اقوال سے جو اس نے شدت بخار میں بحالت سرسام کئے ہوں اس کی عقلیت پر کوئی حرف نہیں لایا جاسکتا۔ اسی طرح نیتشے کی تصنیفات و تالیفات فلسفہ و شاعری کی اہمیت نیتشے کی بدقسمتی و نادانی سے نہیں گھٹ سکتی۔ اور بالفرض نیتشے نے کوئی ایسی بات بیان بھی کی ہو جو سراسر خلاف واقعہ ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ ہر شخص سے چاہے وہ بڑے سے بڑا آدمی ہی کیوں نہ ہو فاش غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ ارسطو جیسا عالی دماغ، بلند خیال، قابل انسان معاشی مسائل کی تحلیل میں ناکام رہا اور بالخصوص مسئلہ سود کے متعلق جو اس نے لغزش کی وہ تاریخ معاشیات کے جاننے والوں کو بخوبی معلوم ہے۔ سب ایک طرف آخر یہ نقادان علم و ادب ہی کا کام ہے کہ وہ خیر و شر، حق و باطل، صحیح و غلط، میں امتیاز کریں ہر چند کہ یہ میرا کام نہ تھا کہ فلسفیانہ مسائل کی تحقیق و توثیق کروں مگر قطع نظر اس کے کہ دوران تعلیم میں مجھے سلسلہ نصاب کی تکمیل کی غرض سے جدید یورپی فلسفہ کا مطالعہ کرنا پڑا۔ حسن اتفاق سے میرے معلمین کو بھی نیتشے کے فلسفہ سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ متعدد لکچروں کے سننے سے نیتشے کی اصل تصانیف کے مطالعہ کی ترغیب بھی ہوئی۔

فلسفۂ رجائیت نیتشے کے نظام فلسفہ کا سب سے ممتاز پہلو رجائیت کی تلقین و تبلیغ اور قنوطیت کی تحقیر ہے۔ یہ کس قدر تعجب انگیز بات ہے کہ ایک ایسے شخص نے جس نے اپنی زندگی کا نصف حصہ جسمانی مصیبت اور امراض میں گذارا ہو مدت العمر رجائیت کی تلقین کرتا رہا۔ اس کی تمام تصانیف میں جو عام خصوصیت پائی جاتی ہے وہ یہی فلسفہ رجائیت ہے جس کی تبلیغ نیتشے نے اس شد و مد سے کی کہ لوگ غلط فہمی سے اُسے دنیا پرست، حسیات کا پرستار (SENSATIONALIST) اور جبر و تشدد کا قائل سمجھنے لگے۔ چونکہ فلسفہ رجائیت نیتشے کی عمارت فلسفہ کا بنیادی پتھر ہے۔ لہٰذا اس کے سمجھانے کی نیتشے نے پوری پوری کوشش کی۔

اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ولہلم لائبنٹس (WILLHELM LEIBNIZ سنہ ۱۶۴۶ء تا سنہ ۱۷۱۶ء)

جس نے دنیا کو بہترین ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہہ کہا تھا کہ ہماری دنیا بہترین ہے اور اس سے بہتر دنیا کی تخلیق ناممکن ہے۔ اس کے برخلاف آرتھر شوپن ہاور ARTHUR SCHOPENHAUR (۱۷۸۸ء تا ۱۸۶۰ء) نے دنیا کو بدترین ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ ظاہر کیا کہ دنیوی زندگی ایک کاروبار ہے جس کے اخراجات زیادہ اور آمدنی کم، لہذا بیکار ہے۔

عین اس وقت جب کہ نیتشے کی طفولیت، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ تھا، شوپن ہاور کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی اور دنیائے فلسفہ پر ہی نہیں بلکہ عام تعلیم یافتہ لوگوں پر بھی اس کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ جس وقت شوپن ہاور کا انتقال ہوا نیتشے کی عمر صرف (۱۶) برس کی تھی۔ شوپن ہاور مر چکا تھا مگر اس کے خیالات زندہ تھے۔ وہ قومی ادبار کا ہی زمانہ تھا، جرمانیہ گوناگوں سیاسی دقتوں میں مبتلا تھا۔ ملک کا شیرازہ پراگندہ تھا اور قوم کی حالت ناگفتہ بہ تھی ظاہرہ کوئی صورت تحلیل مسائل کی نظر نہیں آتی تھی۔ ایسی صورت میں شوپن ہاور کے فلسفۂ قنوطیت کے نشو و نما کے لئے بہت ہی زرخیز و شاداب زمین ملی لوگوں سے نفرت کرنا، انسانوں کی تحقیر کرنا، زندگی کو بیکار، زندگانی کو بے سود، علم کو فضول، تہذیب کو لغو سمجھنا شوپن ہاور نے سکھایا تھا۔ خود اس نے اقرار کیا کہ "میں انسانوں سے نفرت کرنے والا نہیں ان کی تحقیر کرنے والا ہوں!" [۱]

جس شدت سے شوپن ہاور انسانوں کی تحقیر کرتا تھا اس کا اندازہ اس سے بہتر کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس طرح ہم جانوروں کو چوپایہ (VIER FUESSER) تصور کرتے ہیں وہ انسانوں کو دوپایہ (ZUEIFUESSER) تصور کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں میں جو ایک سچا عاقل ہے وہ بہ قول (شوپن ہاور) "ہزاروں لاکھوں شودروں اور پاریاؤں میں ایک برہمن ہے"۔ [۲]

---

[۱] دیکھئے (WINNER: "SCHOPENHAUER'S LEBEN" BROCKHAUS W. V. صفحہ ۲۵۵ - LEIPZIG - 1910

[۲] ایضاً۔ مزید تفصیل کے لئے اسی کتاب کا گیارہواں باب

اسی قسم کی قنوطیت کی تلقین اور طرح بھی کی جارہی تھی اور جس فضا میں نیتشے نے نشو و نما پائی وہ یہی فضا تھی۔ مگر وہ لوگ جو غیر معمولی قابلیت کے آدمی ہوتے ہیں ان پر فضا اور ماحول کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اور باوجود اس کے کہ نیتشے نے شوپن ہاور کی تصانیف کا مطالعہ بھی کیا اور ایک طرح سے اسے اپنا استاد بھی مانتا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنے لئے سیدھا راستہ ڈھونڈ نکالا۔ لائبنتس اور شوپن ہاور کے بین بین وہ راہ لی جو افراط و تفریط سے مبرا، لہذا حقیقت سے سب سے قرین تھی۔

نیتشے کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہم اپنے لئے چاہے دوزخ تیار کر سکتے ہیں چاہے جنت وہی ملک جو قدیم زمانہ میں رشک گلشن تھا اور جو ملک جسمانی، ذہنی دونوں اعتبار سے ترقی کرتے کرتے بلند مرتبے پر پہنچ گیا تھا آج برباد و ویران ہے۔ نسل وہی ہے، لوگ وہی ہیں، موسم وہی ہے، آب و ہوا وہی ہے۔ پھر بھی ہر چہار طرف ویرانی و بربادی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ترقی کے ایک بلند مرتبہ پر پہنچ جانے کے بعد انسان نے بلندی کی طرف نہیں بلکہ پستی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ موجودہ زمانے کے اعتبار سے بلند ترین زینہ پر پہنچنے کے یہ معنے نہیں کہ اس کے آگے ترقی محال ہے۔ بہت سی برائیاں اب بھی ہم میں موجود ہیں جو صرف تہذیب و تمدن کے پردے میں چھپی رہی ہیں چونکہ وہ نظریہ ارتقار کا قایل تھا، وہ کہتا ہے کہ "ہم نے نیم جانداروں سے ترقی کرتے کرتے موجودہ رتبہ حاصل کیا ہے۔ مگر اب بھی ہم میں انہیں کی بہت سی خصوصیتیں باقی ہیں۔ [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) خصوصاً صفحات ۴۲ تا ۲۸۱) اور شوپن ہاور کی مشہور تصنیف "PARERGA UND PARALIPOMENA" پڑھیئے جو نہایت دلچسپ اور پر از معلومات ہونے کے علاوہ نفسیاتی مشاہدات سے مالا مال ہے۔

[۱] پروفیسر پاسپرز کی شرح کے مطابق یہی نیتشے کا خیال تھا لفظاً البتہ اس نے یہ کہا ہے "تم لوگوں نے کیڑے سے لیکر انسان تک کی مسافت طے کی مگر اب بھی تم لوگوں میں بہت کچھوا پن ہے"۔ دیکھیے "ALSO SPRACH ZARATHUSTRA"

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس سے زیادہ ترقی کریں اور انسانوں سے بہتر جاندار بن سکیں۔ نیتشے نے اس آنے والی نسل (SPECIA) کا نام فوق الانسان رکھا۔ اور جس طرح بندر تمام جانداروں میں انسانوں کی آمد کی خبر لائے تھے اسی طرح انسان فوق الانسانی نسل کا پیش خیمہ ہے نیتشے نے اپنے فلسفہ رجائیت کا دارومدار فوق البشر اور فوق البشریت پر رکھا۔

نظریۂ فوق البشریت

فوق البشریت سے نیتشے کی کیا مراد ہے

جہاں تک مجھے علم ہے نیتشے نے یہ کہیں نہیں کہا کہ فوق الانسان موجودہ نسل انسانی سے کسی طرح مختلف شکل وصورت کا آدمی ہوگا اور بالخصوص عضویاتی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی تبدیلی ہوگی اور نہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا یا یہ کہ ہر فوق الانسان کی عمر دو دو تین تین یا چار چار صدیاں ہوا کرے گی اس قسم کی لغو باتیں نیتشے نے کبھی نہیں کہیں اور یہ زیادہ تر ان لوگوں کے خود ساختہ تخیلات ہیں جنہوں نے نہ کبھی نیتشے کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور نہ نیتشے سے متعلقہ مستند کتابوں اور مضامین کے پڑھنے کی زحمت گوارا کی۔

نیتشے کی مراد فوق الانسان سے ایسے بشر سے تھی جو حیوانیت کا نہیں بلکہ عقلیت کا پیرو ہو جو حظ نفس کا طالب نہیں بلکہ احکام عقل کا پابند ہو، وہ انسانی نسل جس میں کمترین برائیاں اور زیادہ سے زیادہ خوبیاں ہونگیں۔ فوق الانسانوں کی نسل ہوگی۔ وہ فرشتے نہ ہوں گے بلکہ فوق الانسان ہی رہیں گے۔ ان میں برائیاں بھی ہوں گی مگر اس مجسمہ اوصاف میں یہ برائیاں مطلق قابل لحاظ نہ ہوں گی۔ جس طرح سمندر کا پانی کثافت و غلاظت کے پڑنے سے غلیظ و کثیف

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) مطبوعہ KROENER بمقام لائپزگ ۱۹۲۳ء صفحہ (۱۳)

نہیں ہوجاتا اور بحر من حیث البحر صاف ہی رہتا ہے اسی طرح فوق الانسان کی خوبیوں اور اوصاف کے مدنظر اس میں جو کچھ برائیاں ہونگیں وہ ناقابل لحاظ ہونگیں اور جس طرح گندے بدبودار پانی کے گرنے سے سمندر صاف ہی رہتا ہے فوق الانسان کا کردار اس کی چند بدخصلتوں کی وجہ سے متاثر نہ ہوگا۔ [1]

نیٹشے کی تصانیف کے مطالعہ سے اس سے زیادہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ فوق البشر کو کس طرح سمجھتا تھا۔ انسانوں کے افعال و کردار میں جس قدر عدم عقلیت (IRRATIONALITY) وہم پرستی نادانی، غیر دانشمندی، نفس پرستی پائی جاتی ہے وہ کم ہوتے ہوتے تقریباً مفقود ہوجائے گی۔ اور ان کی جگہ عقلیت، علم پرستی، دانشمندی اور فہم و ادراک لیگی جن کی بدولت انسانوں کی صحت بدرجہا بہتر ہوگی، اور وہ جمالیاتی، عضویاتی اور عمرانیاتی نقطہائے نظر سے حتی الوسع مکمل انسان ہوں گے

انسانوں کے کردار اور افعال و اعمال، ذہنیت و عقلیت کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے والے فلسفیوں، نفسیوں (PSYCHOLOGISTS) اور مردم شناسوں کے مطابق انسانوں کی جبلی خصوصیات ایسی تو نہیں ہیں جن پر وہ لوگ فخر کرسکتے ہیں جنہیں "اشرف المخلوقات" ہونے کا دعویٰ ہو۔ کسی سیاہ بین، دنیوی معاملات سے بیزار، تارک الدنیا، سنیاسی نے نہیں بلکہ اناطول فرانس جیسے عالم و یکتائے زمانہ نے کہا ہے کہ "اگر ہر شخص کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے ملاقاتی، دوست احباب، اغیار، اس کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں اور کس حد تک اس کے بہی خواہ ہیں تو انسان ایک دوسرے سے الحذر کرنے اور دوسروں کی پرچھائیں سے ڈرنے لگیں گے"۔

دشمن دوست کی شکل میں، بدظن و بدگمان نیک دل و بہی خواہ کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ دنیا میں عالمگیر ریاکاری، جھوٹی دوستی، بے وفائی، بے مہری پھیلی ہوئی ہے۔ انسان

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۴

مختلف النوع عیوب کا مجسمہ ہے بالخصوص خود غرضی، خود نمائی، ظاہر داری کی خصوصیات نے اس کی بیشتر خوبیوں کو بھی غارت کر رکھا ہے۔ کروڑہا انسان محض تقاضائے مصلحت یعنے خود غرضی کی وجہ سے نیک دل، باوفا بنے ہوئے ہیں اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسان میں بمقابلہ بھلائیوں کے برائیاں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ برائیاں بہ نسبت بھلائیوں کے بہت زیادہ شدت سے نمودار ہوتی ہیں۔

نیٹشے، جو دل و دماغ سے نظریۂ ارتقار کا معتقد تھا، خیال کرتا تھا کہ ارتقار کی آخری منزل انسان نہیں ہے کیونکہ انسان کے دماغ نے گو کافی ترقی کرلی ہے اور اپنی عقلیت کے بدولت انسان نے زمین و سمندر، پر فتوحات حاصل کرلیں۔ ہوا کے مقابلہ پر درپیش ہو کر اس کو مغلوب کرنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ اس نے بالخصوص میکانیت میں محیر العقول ایجادات و اختراعات، تحقیقات و انکشافات کے ذریعہ قدرت کے مقابلہ میں ایک ذاتی قدرت پیدا کی، فطرت کی غلطیوں کو دور کیا۔ پہاڑ کاٹے، غار بنائے، ندیوں کو روکا، عظیم الشان آبشار بنائے۔ بجلی کو مقید کیا، بلندی و پستی کی تفریق کو کم کر کے، ہموار سڑکیں بنائیں، زمان و مکان، بعد و فاصلہ، کی اہمیت گھٹادی، سر بفلک عمارتیں، زمین دوز ریلیں اور ہوائی جہاز تیار کئے غرض یہ کہ انسانی دماغ نے اپنی قابلیت کا بہترین سے بہترین، اعلیٰ ترین ثبوت پیش کیا۔ یہ سب صحیح مگر انسان کے دماغ ہی نے ترقی کی۔ انسان کی خصلت و طینت میں بہتری تو کجا کسی قسم کا تغیر ہی نہیں ہوا۔ ہمارا کردار۔ ہماری ذہنیت اور ہمارے اخلاق وہی ہیں جو آج سے سو، ہزار، یا دس ہزار سال قبل تھے۔ شرافت کے لحاظ سے یعنی اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے انسان نے مطلق ترقی نہیں کی، بے ایمانی، دغابازی، رشوت خواری، احسان فراموشی خود پسندی، مثل گذشتہ زمانوں کے اب بھی ہیں اگر موجودہ زمانہ میں پاک دل، نیک ذات، نیک صفات، ملنسار، صلح کل، خوددار، حلیم و غیور آدمی پائے جاتے ہیں۔ تو یہ کسی طرح بھی گذشتہ زمانہ کے کسی دور میں مفقود نہ تھے، بہرطور انسان کے دماغ میں نور ہے تو دل میں حسب معمول

مثل سابق کے تاریکی، عقل بڑھ رہی ہے مگر اخلاق و کردار، افعال و اعمال میں کوئی بہتری نہیں پائی جاتی۔

رجائیت کا فلسفی، ترقی کا خواہاں، بروز کا آرزومند، ارتقائیت کا معتقد، نیٹشے مایوس نہیں ہوتا۔ جس طرح ظاہرہ بیجان چیزوں سے نیم جان درختی جانور[1]، کیڑے کوڑے، رینگنے والے (REPHILES) چوپائے اور انسان پیدا ہوئے ہوں گے۔ اسی طرح انسان سے فوق الانسان پیدا ہوں گے جو نہ صرف لاجواب دماغی قابلیت کے آدمی ہوں گے بلکہ ان کے اخلاق بھی اعلیٰ ہوں گے۔ وہ نفس پرست، تابع حسیات، محکوم دل نہ ہوں گے بلکہ عقلیت کے پیرو، علم کے تابعدار اور دماغ کے فرمانبردار ہوں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان دنیا میں (IDEAL) زندگی گذار ینگے۔

فلسفہ فوق البشریت کی تائید میں اصولی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر نظریۂ ارتقاء صحیح ہے (جس کے صحیح ہونے کا تمام ماہرین حکمت کو یقین ہے) تو کوئی وجہ نہیں کہ ارتقائیت انسانوں پر ختم ہوجائے اور انسانوں سے بہتر انسان یعنے بقول نیٹشے فوق الانسان پیدا نہ ہوں۔ خصوصاً جبکہ دور تاریخ ہی میں اکثر افراد اس قسم کے گذر چکے ہیں اور موجودہ زمانہ میں بھی یقیناً بعض انسان ایسے موجود ہیں جو دماغی، عقلی، اخلاقی، ہر طرح سے اضافی پایۂ تکمیل حاصل کر چکے ہیں اپنے ہم قوموں میں نیٹشے امانیول کانٹ، گوئٹے اور بیٹ ہوون کو، یورپ میں سقراط، ارسطو و افلاطون کو فوق الانسانوں کا (VORERSCHEINUNGEN) "آثار ظہور، قبل ظہور" سمجھتا تھا تو کیا ہم کانفوشیوس، بدھا،

---

[1] ایسے جانور جو دیکھنے میں مثل چھوٹے چھوٹے درختوں کے معلوم ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی جانوروں کی بہت سی خصلتیں موجود ہوتی ہیں۔ برلن وکوپن ہیگن (سوئٹزرلینڈ) کی نمائش گاہوں، عجائب خانوں، اور نباتاتی باغوں میں اس قسم کے "درختی جانوروں" کے متعدد نمونے دیکھنے میں آئے تھے۔ شہر مدراس کے مشہور عجائب خانے میں بھی دو چار نمونوں کے دیکھنے کا راقم کو خیال پڑتا ہے۔

اسوکا، عمر خیام، ابن خلدون اور اکبر اعظم، کو فوق الانسانوں کے (VORERSCHEINUNGEN) نہیں تصور کر سکتے۔ ماضی قریبہ اور دور حاضرہ کی بھی چند ہستیاں مثلاً سرسید، انیس، حالی، اکبر الہ آبادی، جارج برنارڈشا اور مہاتما گاندھی کیا اسی زمرہ میں داخل نہیں کی جا سکتیں؟ جو شرافت، وعقلیت، اخلاق و ذہانت، فعلیت وعملیت کے نقطہائے نظر سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہیں؟

مثالوں میں چاہے اختلاف رائے ہو مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکثر ایسی ہستیاں گذر چکی ہیں اور اب بھی موجود ہیں جو فوق الانسانی درود کی خوشخبری بنی آدم کو پہنچاتی ہوں۔ اگر جانوروں سے انسان بننا ممکن تھا اور صحیح ہے تو انسانوں سے فوق الانسان بننا کیونکر اصولاً ناممکن اور غلط ہو سکتا ہے؟ اگر نظریۂ ارتقائیت صحیح ہے تو دوسرا لازماً غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ ارتقائیت کا عملدرآمد ختم ہو چکا اور اب جذر کے بعد مد ہے۔ اگر بدترین سے بد، بد سے خوب، خوب سے خوبتر بننا ممکن تھا تو کیا معنے کہ خوبتر سے خوبترین نہ بن سکے۔[1]

بہر طور نیٹشے نے فلسفہ رجائیت کی تلقین خوب کی اور اس ضمن میں نظریۂ فوق الانسان کی اہمیت وصداقت کو بخوبی واضح کیا، اس کا کارنامۂ حیات اگرچہ یہی تھا مگر اس کے علاوہ بھی نیٹشے نے بڑے بڑے کام انجام دیئے، بہت سے فلسفیانہ مسائل کو حل کیا۔ اخلاقیات کے فرسودہ قوانین کو پانی کیا

---

[1] تمام جانداروں نے کچھ اپنے سے بہتر ہی پیدا کیا۔ اے انسانو! تم کیا چاہتے ہو کہ اس عظیم جذر کی مد بنو اور الثا راستہ اختیار کر کے جانور بنو؟ نہ یہ کہ آدمی کو مغلوب کر کے فوق البشر بنو؟ انسانوں کے لئے بندر کیا ہیں؟ ایک حقارت آمیز ہستی یا ایک تکلیف دہ شرمندگی (تحقیر اس لئے کہ وہ پیچھے رہ پڑے اور شرمندگی اس وجہ سے کہ وہ ہمارے رشتہ دار ہیں) اس طرح اگر تمام انسانوں نے ترقی نہ کی تو چند افراد ہی فوق الانسان بن جائیں گے اور فوق الانسان کے لئے آدمیوں کی نسل باعث تحقیر ہوگی اور انہیں ہمارے وجود سے تکلیف دہ شرمندگی ہوگی۔"

(خطبات زردشت صفحہ ۱۳)

جمالیات، فنون لطیفہ، لسانیات، صوتیات، السنۂ قدیمہ کی صرف و نحو، کے متعلق گرانبہا تحقیقات کی، ایک نئے ذہنی دبستان (SCHOOL OF THOUGHT) کی بنیاد ڈالی اور سب سے بڑھکر اپنی متعدد تصنیفات اور گرانقدر مضامین کی وجہ سے جرمانی نثر کو بے نظیر کلام سے مالا مال کر کے جرمانی ادب پر ایک احسان عظیم کیا۔

نیٹشے بحیثیت ادیب و شاعر

چاہے لوگوں کو نیٹشے کے خیالات و فلاسفی سے کتنا ہی اختلاف ہو اس حقیقت سے کسی نے انکار کرنے کی جرأت نہ کی کہ نیٹشے کو جرمانی زبان پر پورا عبور تھا وہ اس زبان کا مجدد اور اس کا بہترین انشا پرداز تھا جس کے تحریرات کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ "الفاظ کی موسیقی اور مصوری ہے" جس پر کارل فورلینڈر نے جل کر کہا ہے کہ وہ "علمی مفکر سے کہیں زیادہ (فنون لطیفہ کا) صنّاع ہے"[1] نیٹشے کے ایک مخالف نے لکھا ہے کہ "نیٹشے کے تصانیف میں زبان ہی زبان ہے خیالات کچھ بھی نہیں" جس کا جواب ایک نیٹشے کے حامی نے ترکی بہ ترکی یہ دیا کہ "آپ کی تصانیف میں تو زبان بھی نہیں"۔

نیٹشے کی نثر نگاری کی مقبولیت کے لئے اس سے بہتر اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف اس کی عمدہ عمدہ نظموں کو بلکہ اس کی نثر کے عمدہ حصوں کو لوگ زبانی یاد کرتے ہیں۔ جرمانی زبان جاننے والوں میں متعدد اشخاص ایسے ملتے ہیں جنہیں نیٹشے کی نظم و نثر کے حصے یاد ہیں بالخصوص اس کی کتاب "خطبات زردشت" ادبی لحاظ سے ایک لافانی چیز ہے اور یورپی ادب کے بہترین کارناموں میں شمار کئے جانے کی مستحق ہے۔ نیٹشے کا کارنامہ حیات مختلف علوم عمرانی

---

[1] از "GESCHICHTE DER PHILOSOPHIE" مصنفہ KARL VORLAENDER مطبوعہ MEINER سنہ ۱۹۲۱ء صفحہ ۴۷۵

کی خدمت گزاری السنہ قدیمہ کی تحقیقات اور ادب جرمانیہ میں سحر نگاری ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ نیتشے نے دنیا کے اقوام بالخصوص باشندگان یورپ کا جو پیغام عمل پہنچایا وہ سیاسیات کے عالم میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان سب کے علاوہ نیتشے نے عیسائیت کی سخت ترین مخالفت کر کے انسان کے مذہبی نفسیات پر روشنی ڈالی اور خود فلسفہ میں ایک نئے دبستان کا بانی ہوا جسے فلسفہ فہم عامہ (THE PHI JOSOPHY OF COMMON SENSE) کہنا بجا ہوگا۔ [1]

---

[1] ان سب امور پر تفصیلی تذکرہ کرنے کے لئے ایک جداگانہ تصنیف کی ضرورت ہے۔ جس کو ایم، اے گے کی کتاب "نیتشے" جس کا اردو ترجمہ پروفیسر سید مظفرالدین صاحب ندوی نے کیا ہے اور دارالمصنفین اعظم گڈھ کے طرف سے شایع ہوا ہے۔ ایک حد تک پورا کرتی ہے مظفرالدین صاحب کے لکھے ہوئے چند مضامین سلسلہ وار رسالہ "معارف" میں بھی شایع ہو چکے ہیں جس کو پڑھنے سے گمان ہوتا ہے کہ مضمون نگار نیتشے کی تصانیف کو اصل زبان میں نہ پڑھ سکا اور زیادہ تر انگریزی ترجموں سے مستفید ہوا ہے اس کمی کی تلافی گو ایک حد تک مضمون نگار کی محنت و کاوش سے ہوگی مگر کام پھر بھی تشنہ ہی رہا۔ ملک میں ایسے فلسفہ کے جاننے والے موجود ہیں جو جرمانی زبان سے بھی واقف ہیں۔ کیا ان میں سے کوئی بھی نیتشے کو اردو داں حضرات سے واقف کرانے پر آمادہ نہ ہوگا ؟

نیتشے کا پیغام عمل

نیتشے کا پیغام عمل انتہا درجہ کی فضیلت و عملیت ہے نیتشے کو سب سے زیادہ نفرت جمود سے تھی۔ نیتشے کا پیغام عمل بہترین طور پر خود اسی کی زبان میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی مشہور آفاق تصنیف "خطبات زردشت" سے چند اقتباسات کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

(۱) وہ چیز قابل تعریف ہے جس سے انسان سخت جان بنے۔ میں اس ملک کو پسند نہیں کرتا جہاں گھی اور شہد بہتے ہوں۔"

(۲) میرے بھائیو میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ دنیا سے وفاداری کرو۔ ان پر اعتماد نہ کرو۔ جو تمھیں فوق الفطری امیدوں سے پھسلا رہے ہیں وہ زہر ملانے والے ہیں! چاہے خود انہیں معلوم ہو یا نہیں۔"

(۳) قابل نفرین ہیں وہ لوگ جو اپنی مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے جد و جہد نہیں کرتے حسرت بھری آواز میں پکارتے ہیں! "کاش دوسروں کی سی پُر لطف زندگی حاصل کرنے کے لئے خداداد طریقے ہوتے۔"

(۴) تم پوچھتے ہو کہ "اچھا کیا ہے"؟ بہادر ہونا اچھا ہے" انسان اسی وقت اطمینان سے بیٹھ سکتا ہے جبکہ اس کے پاس تیر و کمان ہو ورنہ انسان بیکار جھگڑتا اور کڑکڑاتا رہتا ہے

لہ اصل عبارت کے لئے دیکھئے ALSO SPREAH ZARAT HUSTRA (KROENER) مطبوعہ ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۲، ۴۴، ۶۷، ۷۰، ۹۳، ۹۵، ۱۶۶، ۲۲۲، ۲۳۹، ۲۴۲، اور ۴۲۹۔

ہیں تمھیں امن کی ہدایت نہیں کرتا بلکہ فتح کی۔ تمھاری محنت ایک جنگ رہے۔ اور تمھارا امن فتح بنے"

(۵) "بہ نسبت پڑوسیوں کی محبت کے جنگ اور ہمت نے زیادہ کارہائے نمایاں کئے ہیں تمھاری ہمدردی اور رحم سے نہیں بلکہ تمھاری بہادری سے ہمیشہ حادثوں میں لوگوں کی جانیں بچیں۔"

(۶) بعض انسانوں سے مصافحہ کرتے وقت ہاتھ نہ دو بلکہ پنجہ، اور میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تیرے پنجہ میں ناخن بھی ہوں"۔

(۷) عورتوں کے متعلق ہمیشہ مردوں ہی سے گفتگو کرنی چاہیئے۔ عورتوں کی ہر بات ایک معمہ ہوتی ہے اور ہر مرد دو چیزیں چاہتا ہے۔ کھیل اور خطرہ، اس وجہ سے وہ عورت کو پسند کرتا ہے کیونکہ وہ بہترین خطرناک کھلونا ہے۔

"کاش ہر عورت ایک کھلونا بن سکے پاک وصاف مثل قیمتی جواہر کے جس میں آنے والی دنیا کے اوصاف کا نور ہو"

"اے عورتو! کاش ستاروں کی شعاعیں تمہاری محبت میں منور ہوں اور تمہاری یہ خواہش ہو کہ تم فوق الانسان پیدا کرسکو"

(۸) جب سے انسان ہیں اس وقت سے انسانوں نے خوشی کم منائی۔ یہی ہمارا دائمی گناہ ہے۔ ہم جس قدر زیادہ خوش رہیں گے اسی قدر ہم دوسروں کی دل آزاری و دلشکنی کرنا بھولیں گے"

(۹) زندگی نام ہے اطاعت کا۔ اس کو حکم دیا جاتا ہے جو خود ہی حکم کی تعمیل کرنا نہ جانتا ہو"

(۱۰) بلندی بری نہیں بلکہ احساس پستی خوفناک ہے"

(۱۱) ان مردوں کو تو دیکھو۔ ان کی آنکھوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دنیا میں کسی شئے کو

اس سے بہتر سمجھتے ہی نہیں کہ ایک عورت کے پاس پڑے رہیں۔ کاش تم کم از کم جانوروں کی حیثیت میں مکمل ہوتے مگر جانوروں کے لئے معصومیت لازمی ہے۔"

(۱۲) "مسرت میرے جلو میں ہے سبب اس کا یہ ہے کہ میں عورتوں کا گرویدہ نہیں ہوں"

(۱۳) اگر دعا نہیں دیتے ہو تو بد دعا ہی کرو" یہ منور خیال مجھے ایک درخشندہ آسمان سے ملا تاریک راتوں میں بھی یہ ستارہ میرے آسمان پر چمکتا ہے۔

(۱۴) "عالم حیات میں ہر ہستی نے اپنے سے بہتر ہستی پیدا کی بجائے اس کے کہ انسان کو مغلوب کر کے تم فوق الانسان پیدا کرتے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ حیوان کی طرف پھر عود کرو؟ کیا اس بحر ارتقاء کے جذر کو مد میں تبدیل کرتے ہو؟"

(۱۵) فرط مسرت کی بدحواسی شدت غم کی بدحواسی سے بہتر ہے۔ بدنما رقص لنگ سے بہتر ہے"

(۱۶) "کہا جاتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے محبت کرو" میرا خیال ہے کہ "اپنے پڑوسیوں کو ان کے حال پر رہنے دو" اور یہی طرز عمل مشکل تر ہے!"

ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ نیتشے کا فلسفۂ عمل کیا تھا اور اس نے کس شد و مد سے فعلیت و عملیت کی تلقین کی اور وہ رجائیت کا کس درجہ معتقد تھا!

نیتشے کے سمجھنے میں سخت غلط فہمیاں ہوئیں چنانچہ لوگوں نے اسے جنگ عظیم کا بانی اور جرمن پرست ٹھیرایا۔ جس کی وجہ میرے خیال میں زیادہ تر یہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے غیر جرمانی ممالک میں نیتشے کی کتابوں کا نظر غور سے راست مطالعہ بہت کم کیا ہے اور زیادہ تر چیدہ چیدہ مضامین دیکھے ہیں جس میں سراسر یک طرفہ بیانات کی تائید میں ایسے اقوال بطور سند پیش کئے گئے ہیں جن کو نفس موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ مثال کے طور پر اسی قول کو لیجئے:۔

"بعض انسانوں سے مصافحہ کرتے وقت ہاتھ نہ دو بلکہ پنجہ اور میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تیرے پنجہ میں ناخن بھی ہوں"۔

جنگِ عظیم میں یہ قول بھی نیتشے کے جرمن پرست (PAN GERMAN) ہونے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا تھا۔

اس کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کی اس کے یہ معنے نہیں کہ ایک قوم کو مسلح ہوکر اپنے سے کمزور قوموں پر ٹوٹ پڑنا چاہیئے۔ اگر نیتشے سنہ ۱۹۱۴ء میں زندہ ہوتا تو وہ اپنی قوم کی بد افعالی پر نادم ہوتا ہے۔ اس قول سے نیتشے کی نیت یہ ہے کہ ان انسانوں کو جو ڈرپوک ہیں اور جو خوف زدہ ہوکر خود کو اور اپنی قوم کو ذلیل کرتے پھرتے ہیں، بے اعتنائیاں اور ناانصافیاں جھیلتے جاتے ہیں، اور محض خوف زدگی کے باعث اپنی اور اپنی قوم کی تذلیل و تحقیر پر صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کرتے بلکہ قوت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے اور اصول و حقوق فراموش کرکے قوی کی تمام زیادتیوں پر چشم پوشی کرتے ہیں ہمت دلائی جائے۔ ان لوگوں سے نیتشے مخاطب ہوتا اور کہتا ہے کہ "مصافحہ کے وقت ہاتھ نہ ملاؤ بلکہ پنجہ"! یعنے یہ کہ اپنے مدمقابل پر ظاہر کردو کہ تم کسی طرح تحقیر کا گندلہ پانی پینا گوارا نہ کروگے اور قوت کا جواب قوت سے دوگے!

یہ ہے تعلیم دنیوی طرزِ زندگی کی، یہ ہے تعلیم اعلیٰ معیارِ زندگی کی! یہ ہے تعلیم شرافت و خودداری، تحفظِ حقوق اور مطالبہ مساوات کی!

اس تعلیم کو جرمن پرستی سے کیا تعلق؟ اور یہ سراسر نیتشے کے حق میں ناانصافی ہے کہ اسکو جرمن پرستوں کے زمرے میں شامل کیا جائے۔ غالبًا ناظرین کو یہ معلوم کرکے سخت تعجب ہوگا کہ بمقابلہ جرمنوں کے نیتشے فرانسیسیوں کو زیادہ مہذب اور زیادہ متمدن سمجھتا تھا اور بمقابلہ جرمانیہ کے اسے فرانس سے زیادہ لگاؤ تھا[۱] اور متعدد بار اپنے مضامین اور تصانیف میں نیتشے نے جرمانیہ کا مذاق اڑایا ہے۔

---

[۱] تفصیلی بحث کی یہاں گنجائش نہیں ان لوگوں کے لئے جنہیں اس مسئلہ سے دلچسپی ہو میں حسب ذیل کتب کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتا ہوں

TEUZEITS VON GUT UND BOESE "ماورائے خیر و شر" مطبوعہ (KROENER) لائپزک سنہ ۱۹۲۲ء صفحہ ۲۰۹، ۲۰۹، ۲۹۳ و ۲۹۴

DER WANDERER UND SEIN SCHATHEN "راہرو اور اسکی پرچھائیں" مطبوعہ ایضًا صفحہ ۶۸ و ۱۸۰

جرمنوں کی کمزوریوں پر بے دردی اور بے رحمی سے تنقید کی ہے ۔

۱۸۷۱ء میں فرانس پر فتح حاصل کرنے کے بعد جب جرمنوں کے غرور و تکبر میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا تو نیتشے نے اپنے ہم قوموں کے متعلق کہا" کہ جب سے جرمنوں نے فوجی فتح حاصل کی ہے اس وقت سے وہ اس خبط (!) میں مبتلا ہیں کہ جرمن تہذیب و شائستگی نے بھی فرانسیسی تہذیب و شائستگی پر فتح حاصل کرلی ہے"! کیا یہ ایک "جرمن پرست" کے الفاظ ہوسکتے ہیں؟

اسی طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نیتشے "یورپ پرست" تھا یہ خیال بھی صحیح نہیں نیتشے کا صحیح سیاسی ایمان و اعتقاد کسی خاص قوم اور کسی خاص حصہ دنیا پر نہیں تھا۔ اس کی تعلیم تمام اقوام عالم کے لئے یکساں اہمیت رکھتی ہے ۔ اور اس نے تمام دنیا کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لہذا نیتشے سیاسی اعتقاد کے لحاظ سے نہ تو جرمن پرست ہے اور نہ یورپ پرست بلکہ اس کا ایمان بین الاقوامیت (INTER NATIONALISM) تھا وہ جرمنوں کی فتح نہیں چاہتا تھا اور نہ اس کو مغر کی پروا تھی وہ فلاح نسل انسانی، بین الاقوامی بروز اور ترقی کا خواہشمند تھا۔

نیتشے کی زندگی نہیں بلکہ نیتشے کی تعلیم ہی ہم لوگوں کے لئے نہایت سبق آموز ہے خصوصاً قنوطیت پسند ہندوستان کے لئے نیتشے کا فلسفہ رجائیت روح بخش، جانفزا اور حیات ابدی بخشنے والی طاقت ہے۔

جب ہم ہندوستان کی اقتصادی حالت پر غور کرتے ہیں اور بحیثیت معاشی کے نیتشے کے نظام فلسفہ پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیں نیتشے کی اہمیت کا اور زیادہ شدت سے احساس ہونے لگتا ہے وہ قوم جس کے ہاں قدرتی دولت کے بیشمار خزانہ ہیں، وہ قوم جس کے افراد میں قابلیت و ذہانت فہم و ادراک بھی کسی طرح مفقود یا کمیاب نہیں، وہ قوم جسکے ہاں دفینوں اور خزانوں میں باوجود صدیوں کی لوٹ مار اور تباہی و بربادی کے اب بھی لاکھوں بلکہ کروروں روپیہ موجود ہے یعنی وہ ملک جس میں قدرتی دولت بھی ہے، جو قابل بھی، جس کے ہاں پونجی بھی ہے۔ آج بے سروسامان ہے۔ اس بے سروسامانی کے وجوہ کا پتہ چلانا گو کسی قدر دشوار ہے مگر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہماری قنوطیت پسندی

اور بیجا قناعت پسندی ہمیں ڈبو رہی ہے۔ کاہلی، تساہل، لاپرواہی، تعطل جن کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تیز رفتار سے خاطرخواہ طور پر ترقی نہیں کر رہے ہیں۔ یہی ہندوستان کی پس ماندگی اور سست رفتار ترقی کی وجہ ہے کہ ملک میں گو عاملین پیدائش (قدرتی دولت، محنت و سرمایہ) موجود ہیں مگر اسبابِ دولت (شوق زیست، خواہش حیات، ولولۂ زندگی) عنقا ہیں۔ یہ نہ ہوں تو سب ہیچ ہے۔ لہذا انہیں کا حاصل کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اسی فلسفۂ حیات، اور ترغیب عمل کا بہترین مبلغ اور مجدد نیتشے تھا۔ یہی اس کا کارنامۂ حیات ہے اور یہی کارنامۂ حیات اس کی ابدی نیک نامی کے لئے کافی ہے!

ایک عثمانیہ کی زبان سے!

از

مولوی نبی الحسن صاحب شمیم

اثر خواہش لذات مٹاتا ہوں میں
اپنے احساس کی قوت کو بڑھاتا ہو نہیں

غیر کے طنز کو بھی غور سے سنتا ہو نہیں
ایسے تیروں کو کلیجہ میں بٹھاتا ہو نہیں

ہم خیالی نہیں دنیا میں میسر مجھ کو
رات دن ایک اسی بات پہ روتا ہو نہیں

میرا ظاہر بھی وہی ہے مرا باطن بھی وہی
جو سمجھتا ہوں زباں سے وہی کہتا ہو نہیں

بجلیاں کوٹ کے بھر دی ہیں کسی نے مجھ میں
سب سے بیتاب طبیعت ہی جو رکھتا ہو نہیں

انقلابات پسندی ہے مری خلقت میں
میں سمجھتا ہوں کہ ہمرنگ زمانہ ہو نہیں

گھیرتے ہیں جو مصائب مجھے اس عالم کے
بیٹھکر مجمع احباب میں ہنستا ہو نہیں

زندگی چھوڑ دی ہے علم و عمل پر میں نے
انہی سانچوں میں تو ڈھل ڈھل کے نکلتا ہو نہیں

آپ عثمانیہ کالج کے افق پر دیکھیں
ایک چھوٹا سا چمکتا ہوا تارا ہوں میں

سزائے موت

از

مولوی محمد محی الدین صاحب

یعقوب..... یعقوب..... یعقوب؟

شکستہ حال بوڑھا اپنا نام آپ دُھرا رہا تھا۔ یا یوں کہیے کہ وہ دل ہی دل میں اس آواز کا لطف اُٹھا رہا تھا جو اس کے نام سے پیدا ہوتی تھی۔ اور جس کے سننے کا وہ بچپن سے عادی تھا۔ اصطبل میں، کھیتوں میں، چراگاہ میں، مکان میں، یہودی کی دوکان میں، غرض ہر جگہ وہ یہی آواز سنتا۔ مگر آج کا سا لطف اسے کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ آواز اس کے دل کی لامتناہی گہرائیوں سے نکل کر ایک عجیب سا معہ نواز نغمہ کی صورت میں اس کے کانوں میں گھلی جا رہی ہے۔ جس کے تاثرات نظر افروز مناظر اور کیف آمیز بیخودی کی شکل میں اس کے روبرو جلوہ گر ہو رہے ہیں لیکن ــــ یہ خوش کیفی اور خوش نگاہی بجائے خود ایک بعید ترین احساس یاس و ناامیدی کا باعث بن رہی تھی۔

یہ افسردہ کن جذبہ آہستہ آہستہ اس کے تابع و اطاعت گزار دل پر قبضہ کر کے اسے مضطرب و غمگین بنا رہا تھا۔ اپنی امکانی کوششوں کے باوجود وہ کسی طرح اس پریشان خیالی سے نجات حاصل کر سکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی پر اصرار غیبی واقعہ کے طویل اور تھکا دینے والے انتظار میں

مصروف ہے۔ اس کا چہرہ بالکل سپید پڑ گیا تھا خون کی جھلک نام کو نہ تھی لب مرتعش وخشک اور زبان گویا کاٹھ کا کھلونا ہوگئی تھی۔

وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ غنیم کی فوج سیلاب کی طرح چاروں طرف سے اُمنڈ آئی۔ گاؤں کی خاموش فضا میں افراتفری اور کھلبلی پڑ گئی۔ ہر طرف ہتھیاروں کی جھنکار گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز اور سپاہیوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے اکثر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے مگر چند ایک گرفتار بھی کرلئے گئے یعقوب ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اس قابل نہ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس نے اس کی کوشش بھی نہ کی۔ اس کے پاس دھرا ہی کیا تھا جو اسے لوٹ مار کا خوف ہوتا۔ اور یوں بھی بوڑھوں اور بچوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔

وہ آتش دان کے پاس گھانس کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا پھٹے ہوئے میلے چیتھڑوں میں لپٹا سردی کا مقابلہ کر رہا تھا۔ سرد ترین ہوا پہاڑوں سے چلتی ہوئی اس کی بوسیدہ جھونپڑی میں گھس آتی۔ اور برف دروازوں کھڑکیوں اور چھت کے کھلے ہوئے روزنوں سے اندر گر رہا تھا۔ باہر کھیتوں میں پودوں کے ہلنے سے سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرد ہوا سے بچنے کے لئے کھیت کہیں دور محفوظ مقام پر پناہ لینے بھاگے جا رہے ہیں۔ زمین سفید برفانی چادر میں ملبوس لرزہ براندام آسمان کا محاصرہ کئے ہوئے تھی اور آسمان گھبرا کر پہاڑوں کے بلند درختوں کی ٹہنیوں میں اُلجھ گیا تھا۔

یعقوب...... یعقوب...... یعقوب!

وہ اٹھا اور کچھ سوچتے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا۔ دریدہ پتلون کی جیب سے پائپ نکالا اور اسی طرح بے تنباکو بھرے منہ میں رکھ لیا۔ سلگاتا کیا خاک۔ استغراق و محویت کے عالم میں ایک ہاتھ سے پائپ تھامے بڑھاپے کی زندہ تصویر بنا بیٹھا تھا۔ برف اور کہر کی دھندلی

چادر کے پیچھے سے گویا اسے اپنی بیوی بچوں کے بھاگنے کا سین نظر آرہا تھا۔ اس نے کل قیمتی سامان ان کے ساتھ کردیا تھا حتیٰ کہ پشمینہ کا لبادہ کندھے سے اتار کر اور گائے صحن کے کھونٹے سے کھول کر اُن کے حوالے کردی۔ جو اس کی محبوب ترین چیزیں تھیں۔ خدا حافظ کہنے اور اس کی پیشانی پر رخصتی بوسہ دینے کے بعد اس کے اہل وعیال لوگوں کے ہجوم میں گم ہوگئے جو بے تحاشا اور بغیر منزل مقصود کے گاؤں سے بھاگے جارہے تھے۔ اس وقت سے ہر گھڑی اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا ہے۔ وہ پریشان اور متعجب ہوکر ادھر اُدھر دیکھتا مگر اسے کوئی نظر نہ آتا۔ گویا اس حزینہ کا انجام جس کی ابتدا اس کی ولادت سے ہوئی تھی قریب الختم ہے اور ابھی سے اس کا دوسری اور بہتر دنیا سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق قایم ہورہا ہے۔ فضا میں افسردگی و سکوت طاری تھا۔ اور وہ تکلیف، اذیت اور موت کی حساس فضا میں گھرا ہوا تھا۔

ایک عرصہ سے ترکوں اور روسیوں میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ اور یعقوب کا گاؤں ترکی علاقہ میں عین سرحد اور محاذ جنگ پر واقع تھا۔ روسیوں نے آج اوسے فتح کرلیا اور اب اس پر تسلط جماکر ہیڈ کوارٹر بنانے کی فکر میں تھے۔ یہاں سے چند ہی میل کے فاصلہ پر ایک دوسرا گاؤں واقع تھا جو روسی قبضہ میں نہایت اہم مقامات میں سے ایک تھا۔

یعقوب رات دن گولیوں کے سنسنانے اور توپوں اور بندوقوں کی گرج سنتا تھا بعض بعض مرتبہ تو گولے اس کی جھونپڑی کے قریب آگرتے اور گولیاں اس کی چھت سے ٹکراتیں دل بہلانے کی خاطر وہ ٹین کے چھوٹے سے ڈبے سے مکھن کا ایک ٹکڑا نکالتا اور اُسے چبانے لگتا۔ مگر فرطِ غم سے اس کے حلق میں پھندا سا پڑتا محسوس ہوتا۔ گاؤں کو نظر آتش کردیا گیا تھا جس کے عظیم الجثہ شعلے آسمان کی خبر لاتے نظر آتے تھے۔

کیا تجھے یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا چاہیئے؟..... کیا ملک اور قوم کی خدمت

میرا فرض نہیں؟ وہ سوچنے لگتا۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

یعقوب کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کھیتوں میں برف جما ہوا تھا گویا ان پر گاڑھی وارنش کا چمکدار غلاف چڑھا دیا گیا ہے۔ بے نور مدھم چاند اپنی ناتوان شعاعیں دنیا میں پھیلا رہا تھا کہیں کہیں جنگل کے درخت کالے نکیلے دانتوں کی صورت میں کھڑے تھے اور دمکتے ہوئے تارے اس منظر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس پُرعظمت سرد اور تھکتی ہوئی رات کو جبکہ تمام دنیا ابد کے سامنے سر جھکا رہی تھی۔ یعقوب نے دیکھا کہ کوئی کالی سی شئے ایک طویل قطار کی صورت میں پہاڑ سے نیچے اتر رہی ہے۔ دامن کوہ پر روشنیوں کا ایک سلسلہ لگا ہوا تھا جو بیچ سے قطع ہو کر جنگل میں گم ہو جاتا نیچے کھیتوں میں شعلے بھڑکتے نظر آتے اور گاؤں میں جھونپڑیوں اور مکانوں کی جگہ عظیم الجثہ آتشین دیو ناچتے دکھائی دیتے۔

"انہوں نے قاضی کے گھر کو بھی آگ لگا دی" یعقوب نے خیال کیا کہ اس کا دل اس پر گواہی دے رہا تھا۔ اور میں یہاں ..... بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔

وہ دریچہ کی چوکھٹ پر جھکا اور چہرہ آئینہ سے دبا دیا۔ اس کی نظر سے بیچارگی کے علاوہ کسی نفرت انگیز اور خوفناک عزم صمیم کی جھلک ہویدا تھی۔

دفعتاً اسے کچھ آہٹ محسوس ہوئی۔ کوئی چیز جنگل سے اس کی جھونپڑی کی جانب بڑھ رہی تھی مسلسل و باقاعدہ طور پر یہ چند فوجی سوار تھے۔ جن کے مخصوص لبادے اور خود انہیں صاف صاف ترکی سپاہیوں کے ہلکے پھلکے لباس اور سرخ ٹوپی سے متمیز کرتے تھے روسی دشمن آنے والے ..... حتی الامکان دبے پاؤں چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ یعقوب پر ایک سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس غیر متحرک کھڑا رہا۔ پائپ اسی طرح اس کے منہ کے ایک کونے سے نکلا ہوا تھا۔ مگر نہ اس میں تمباکو تھا نہ آگ۔ وہ علانیہ کانپ رہا تھا۔ وہ سردی تھی یا خوف؟ خدا جانے!

دفعتاً دھماکے کے ساتھ دروازہ کھولا گیا۔ دہلیز پر ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں

قندیل تھی۔ کمرہ میں اجالا ہو گیا یعقوب کا خوف اس کی رگوں میں منجمد ہو گیا۔ سپاہی یکے بعد دیگرے داخل ہو رہے تھے۔ اس کے موٹے اونی لبادوں پر برف چھٹکا ہوا تھا۔ صحن میں گھوڑے ہنہنا رہے تھے نیزوں کی انیاں اندھیرے میں ایسی چمک رہی تھیں جیسے اودے مخمل پر ننھے منے جواہرات۔

انہوں نے اسے بوڑھا کہکر مخاطب کیا اور روسی زبان میں کچھ پوچھا۔ اس نے لاعلمی ظاہر کرنے کے لئے دونوں ہاتھ ہلائے۔ پھر انہوں نے اسے آگ سلگانے کا اشارہ کیا۔ اس نے غور کیا۔ لوگ آتے ہی چلے جا رہے ہیں اور صحن میں بہت سے گھوڑے جمع ہو گئے ہیں اس نے سنجیدگی اور متانت سے غور کرنا شروع کیا۔ اس کا ڈر غائب ہو چکا تھا۔ اسے اپنی حفاظت کا خیال آیا۔ ان لوگوں کی ہر معمولی سی حرکت اسے گھنٹوں میں ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ وہ ان کی ہر حرکت کی نگرانی کر رہا تھا۔

"سردی مارے ڈالتی ہے!"

وہ ان ناخواندہ مہمانوں کے لئے آگ روشن کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کی نسبت سرگوشیاں کر رہے اور ہنستے جا رہے ہیں۔ اس نے ان کی طرف دیکھا اور ایک مجبورانہ تبسم کے ساتھ سر ہلا دیا۔ اس نے خیال کیا کہ ان کی ہنسی کی داد دینا اور خود بھی مسکرا دینا اجنبیت دور کرنے اور رحم و کرم کو بلانے کا باعث ہوگا۔

انہوں نے اس سے خدا جانے کیا کیا پوچھا۔ گاؤں کا نام؟ اس کا اپنا نام؟ ہیڈ کوارٹر کا راستہ؟ گویا وہ جانتا ہی تھا۔ اور اگر جانتا بھی تھا تو کہہ ہی دیتا۔

پھر انہوں نے آپس میں گفتگو کرنی شروع کی۔ ان میں سے ایک اٹھا اور آتشدان تک آکر مذاقاً یعقوب کی پیٹھ ٹھونک دی۔ مگر اس سے بجائے خوش ہونے کے یعقوب کے دل کو سخت صدمہ پہنچا یعقوب نے غم و پریشانی سے سر کھجا کر بالوں کو اور زیادہ ابھالیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ انہوں نے پانی گرم کیا اور چائے بنائی۔ بھنے ہوئے گوشت کی بو کمرہ میں پھیلنے لگی۔ یعقوب نے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹے۔ اور میز کی طرف سے رخ پھیر کر آگ کو گھورتا رہا۔

اس کے کان بج رہے تھے۔ سپاہیوں کے دانتوں کے کٹکٹانے کی آواز۔ چھری کانٹوں کی جھنکار اور چٹخارے اسے کسی المناک انجام کی ابتدا اور کسی منحوس بدشگونی کا عمل معلوم ہو رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی چیز اس کے حلق میں پھنسی ہوئی ہے۔

انہوں نے شور و غل کرتے ہوئے کھانا شروع کیا۔ برانڈی کی تیز بو فضا میں پھیلی۔ اس کی صلاح کی گئی۔ اسے بے چینی سی معلوم ہونے لگی۔ اسے شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن ـــــ کیا وہ دعوت قبول کرلے؟ وہ سوچنے لگا۔

"آؤ۔" سپاہی کہنے لگے۔ بس نخرے رہنے دو۔ اب آبھی جاؤ۔"

بوڑھے یعقوب نے محسوس کیا کہ اس کی مستقل مزاجی اور عزم صمیم میں ایک عجیب سا انحطاط ترقی پذیر ہے۔ اور کھانے کی اشتہا غلبہ پا رہی ہے۔ اس کی قوت ارادی جواب دے رہی تھی۔ وہ اس للچانے والی خوشگوار تیزبو کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ آخر ان میں سے دو نوجوان اٹھے۔ اسے دونوں بازو تھام کر اٹھالیا اور اپنے درمیان میں لا بٹھایا۔

ہوا جھونپڑی میں داخل ہوکر چمنی سے سرسراتی ہوئی طرح طرح کی غمناک آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ یکایک آتشدان میں آگ کا شعلہ بھڑکا۔ دیواروں پر سائے رقص کرنے لگے۔ پھیکا چاند کھڑکی میں سے صاف نظر آرہا تھا۔ یعقوب نہیں بلکہ یعقوب کا سایہ۔ یعقوب کی تاریک روح مجسم ہوکر سپاہیوں کے درمیان بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"غالباً وہ مجھے زہر دینا چاہتے ہیں۔" اس کے ذہن میں دشمنوں کے صلاح کرنے کی اس کے سوا کوئی اور توجیح نہ ہوسکتی تھی اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں پر سائے ہنس ہنس کر اس پر طعنہ زنی کر رہے ہیں۔ سپاہی باتوں میں مشغول تھے۔ ان کے ہونٹ اور انگلیاں چربی کی چکناہٹ سے چمک رہی تھیں۔ یعقوب کے بازو والے سپاہی نے اپنا ایک ہاتھ اس کے گلے میں ڈالا اور کانا پھوسی کرنے لگا۔ اس کا سُرخ مُنہ یعقوب کے کان کے بالکل قریب تھا۔

"بابا" اس نے کہا اور گوشت کا ٹکڑا یعقوب کے دانتوں کے درمیان ٹھونس دیا۔

یعقوب نے اپنے دانت بھینچ لینے کی کوشش کی۔ مگر گوشت جو اس کے منہ میں سما چکا تھا کٹ کر حلق میں چلا گیا۔ "بابا" نوجوان سپاہی نے دوسرا ٹکڑا بڑھاتے ہوئے پھر کہا۔ اس نے یعقوب کے سر پر تھپکی دی اور ہنس پڑا۔ یعقوب دل ہی دل میں رنج و افسوس کر رہا تھا۔ کیا اسے اندھے معذور کی طرح نوالہ بنا بنا کر کھلایا جائے اور وہ بھی دشمن اس پر رحم کھا کر؟ وہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہے؟ کیا اس کے ہاتھ نہیں؟ کیا وہ خود نہیں کھا سکتا۔

جب سپاہیوں نے دیکھا کہ یعقوب کھا رہا ہے۔ تو وہ قہقہہ مارنے لگے اور زمین پر فرط مسرت سے پاؤں پٹکنے لگے۔ ان کے جبڑوں سے جھنجھناہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ سپاہی اس پر ہنس رہے ہیں۔ اس کو کچھ خوشی ہوئی کہ وہ ان کی خوشدلی اور ہنسی کا باعث تھا۔ اب وہ عمداً ہنسانے والی حرکت کرنے لگا۔ اس کی مضحکہ خیز شخصیت بجائے خود ہنسی کی محرک تھی لیکن ـــــ اس کے لبوں پر سہمناک مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے گرنے والی بجلی کی چمک۔

پھر انہوں نے کھانا ختم کیا اور شراب پینی شروع کی۔ یعقوب ندیدہ نظروں سے بوتل کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ پس پشت بندھے ہوئے تھے۔ سر جھکا ہوا۔ کپتان نے اپنے بالوں بھرے ہاتھ سے بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔

اب وہ اپنی قدیم قدرتی ہنسی ہنس سکتا تھا۔ نہ صرف ان کے مذاق پر۔ بلکہ خود بخود۔ کیونکہ وہ اب نہایت خوش تھا۔ شراب اس کے سرد اکڑے ہوئے جسم کو گرما رہی اور رگوں میں تلاطم و ہیجان برپا کر رہی تھی۔ وہ بزعم خود آزادی کی فضا میں سانس لینے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ حالانکہ فریقین ایک دوسرے کی زبان سے محض اجنبی تھے۔

"ہاں۔ گوشت اچھا اور مزہ دار تھا۔۔۔۔۔ یقیناً۔ نہایت لذیذ!" اس نے چٹخارا بھرتے ہوئے سر ہلا کر کہا اس نے روٹی کی بھی تعریف کی۔ حالانکہ گوشت اور روٹی دونوں باسی تھے۔

ساغر کے دور پے در پے چلنے لگے۔

"بابا!" اس کا ہمسایہ نوجوان سپاہی بار بار کہتا اور پہاڑوں کی طرف ہاتھ سے معنی خیز اشارہ کرتا اس کی آنکھوں میں، یعقوب کو ایسا معلوم ہوا گویا آنسو بھر آئے ہیں۔

وہ بڑھاپے کی عزت کرتا ہے..... آخر یہ لوگ بھی تو انسان ہیں۔ اور اس کا پہاڑوں کی طرف اشارہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پہاڑ کے ورے اس کا بھی ایک بوڑھا باپ ہے جس کو وہ چھوڑ آیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔" یعقوب نے خیال کیا اور آگ پر لکڑیاں ڈالنے کے لئے اٹھا۔

انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ اسے تکلیف نہ دینا چاہتے تھے۔ ایک نوجوان سپاہی اپنی جگہ سے کود کر "بیٹھ جاؤ۔ تم بوڑھے اور کمزور ہو" اس نے کہا اور خود لکڑیاں اٹھا کر آگ پر ڈالدیں۔

یعقوب نے خالی پائپ پھر جیب سے نکالا۔ کپتان نے خود اس میں تنباکو بھرا۔

انہوں نے پوچھا "تمھارے بیوی بچے کہاں ہیں؟" غالباً اس وقت انہیں اپنے اہل و عیال کا خیال آیا ہوگا جو وطن میں ان کی یاد میں بیقرار ہوں گے۔

"میری بیوی" اس نے کہا "دوسرے گاؤں کو چلی گئی۔ وہ تم لوگوں کی آمد سے خوف زدہ تھی" وہ ہنسے اور سپاہیانہ عادت کے مطابق اپنی جرأت و بہادری یا دوسرے الفاظ میں غارتگری کی تعریف سنکر سینہ ٹھوکنے لگے "جنگ بڑی خطرناک شئے ہے۔ اس سے خوفزدہ کون نہیں ہوتا" یعقوب نے تسلیم کیا کیونکہ خطرہ سر سے گذر چکا تھا "گاؤں کا راستہ جانتے ہو؟ کپتان نے فوراً پوچھا۔ اس کی آواز سے بے صبری اور ملی جلی یاس و امید کا جذبہ صاف ظاہر تھا۔ اس کی آنکھوں سے اشتیاق ٹپک رہا تھا۔ اور ایک عجیب پراسرار چمک جھلکتی تھی۔

یعقوب نے جواب نہ دیا۔ بھلا وہ کیسے نہ جان سکتا تھا؟

سپاہی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور پٹیاں تلواریں سنبھالیں۔ یعقوب نے بچا ہوا سامان خورد و نوش اکٹھا کیا تاکہ کسی کپڑے میں باندھ کر انہیں دیدے۔ مگر انہوں نے کہا کہ ان کی نسبت ان چیزوں

کی اسے خود زیادہ ضرورت ہے اور وہ اصرار کر کے اسے رکھ لینے پر مجبور کرنے لگے۔ نوجوان روسی نے جو کھانے کے دوران میں اس کے بازو بیٹھا تھا۔ سرخ مفلر اپنی گردن سے اور جھولی سے ایک پرانی مگر مضبوط و کارآمد پتلون نکالکر اُسے دی۔

حیرت زدہ یعقوب ان غلط بخشیوں پر اچھل پڑا۔ لیکن اس کے عذر مسترد کر دیئے گئے۔ اور وہ اسے قبول کر لینے پر مجبور کیا گیا۔ کپتان نے کوچ کا حکم دیا۔ اور ایک حسرت خیز وداعی نظر جھونپڑی پر ڈالکر چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

یعقوب انہیں خدا حافظ کہنے کے لئے ان کے ساتھ باہر نکلا۔ جب اس نے برف پوش دشت و دنیا کا نظارہ کیا تو اس کے دل میں ایک عجیب مافوق الفطری احساس پیدا ہوا۔ چاند اپنی دھیمی روشنی سے برف کی چادر کو ملمع کر رہا تھا اور ستارے آسمان پر ہیروں کی طرح جڑے ہوئے جگمگا رہے تھے۔

سپاہیوں نے گھوڑوں کا رخ کیا جنہیں وہ صحن میں کھلا چھوڑ آئے تھے۔ یعقوب نے دیکھا کہ اور بھی بہت سے سپاہی باہر کھڑے ہوئے ہیں گھوڑے بے صبری سے ادھر ٹاپیں مار رہے تھے اور ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔ برف ان کی پیٹھوں پر جمی ہوئی تھی۔ سپاہی سردی سے تھرتھرا رہے تھے۔

وہ ان کے حال پر متاسف تھا۔ کپتان نے اس کا بازو چھوا۔ اور راستہ دریافت کیا۔

"سیدھا۔ تیر کی طرح۔"

"کتنی دور تک؟"

"بس تھوڑی دور۔"

"آخر۔ اندازاً ہے کتنا؟"

سپاہی اپنے گھوڑوں کی لگامیں ہاتھ میں پکڑے اس کے اطراف ہجوم کئے کھڑے تھے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ یہ خیال بار بار اس کے پریشان دماغ میں گھوم رہا تھا "آخر ہم ساتھ بیٹھے۔ ایک دسترخوان پر۔ گھر کے دوستوں کی طرح پھر اگر وہ روسی ہوئے تو کیا مجھے راستہ نہ بتانا چاہیئے بصرف پتہ۔ اس کے۔

بعد ان کی قسمت!"

اُس نے کہا چوراہہ پر بائیں ہاتھ کی جانب۔ کھیتوں سے گذرتے ہوئے۔۔۔"

کپتان نے اشارہ کیا کہ وہ یہ معمہ سمجھنے سے قاصر ہے۔

اس نے سوچا۔ "غالباً وہ راستہ بھٹک جائیں گے۔ اور میری جھونپڑی کو دوبارہ واپس ہوں گے پھر میرا بچا ہوا گوشت اور روٹی کھا جائیں گے۔ اس سے بہتر چوراہہ تک میں خود ہی چل کر راستہ کیوں نہ بتاؤں؟"

وہ ان کے ساتھ ہولیا ــــ کسی خاموش گم گشتہ راہ رو کی طرح۔

"اب سیدھے اس صلیب تک چلے جاؤ۔ وہاں سے۔۔۔۔ یعقوب نے ایک سائے والی کالی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔" کپتان نے جواب دیا۔

اس نے صلیب تک ان کا ساتھ دیا۔ جس کے اوپر حضرت مسیح کا مجسمہ تاج پہنا کھڑا ہوا تھا۔ یہاں سے کھیتوں کے اس پار گاؤں نظر آرہا تھا۔ یعقوب نے دیکھا کہ روشنیوں کی وہ قطار جسے اس نے سرِ شام دیکھا تھا اب اتر کر گاؤں کے اطراف پھیل چکی ہے۔

خوابیدہ دنیا پر سنسانی و ویرانی کی حکومت تھی۔ خفیف سے خفیف آہٹ صاف سنائی دیتی تھی اس خاموشی نے یعقوب کے دل کو ایک وحشی ڈر سے بھر دیا۔ اس نے منھ پھیرا اپنی جھونپڑی پر بیکسی و یاس کی ملی جلی ایک نظر ڈالی اور بے اختیار اس کے سینہ سے ایک آہ سرد نکل پڑی گاؤں میں ابھی تک جلتے ہوئے گھروں کے شعلے بلند تھے۔ یہاں سے ایک سڑک زیریں میدانوں سے گذرتی ہوئی شاہ راہ عام کو کاٹتی تھی۔

یعقوب رکا۔ اور پس و پیش کرنے لگا۔

"آؤ۔ آؤ۔ بوڑھے۔ آگے بڑھو۔" انہوں نے پکارا اور جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھنے لگے

سپاہیوں کے وزنی بوٹوں کی ایڑیاں نرم نرم برف میں گڑی جاتی تھیں۔ اور وہ مشکل تمام لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔ مزید برآں ان کے ایک ہاتھ میں بندوق تھی۔ اور دوسرے میں گھوڑے کی باگ۔ وہ حتی الامکان احتیاط سے قدم اٹھاتے کہ کہیں گڈھوں میں نہ گر جائیں یا دشمن تک ان کے آنے کی آہٹ نہ پہنچے۔ یعقوب ان کی رہبری کر رہا تھا۔ ہر جھاڑی یا برف کی چادر سے اس کا ارادہ متزلزل ہو جاتا اور آگے بڑھنے سے ہچکچاتا۔ گاؤں اب صاف صاف نظر آ رہا تھا اور ان کو مزید رہنمائی کی کچھ زیادہ ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر وہ ان سے اپنے خیال کا اظہار کرتے ڈرتا تھا۔

"اس کھنڈر تک۔ اس سے آگے ہرگز نہ بڑھوں گا۔" وہ ہر کھنڈر کے پاس کہتا۔ شراب کا نشہ جو اس پر مستولی تھا اب رفتہ رفتہ کم ہو رہا تھا۔ اور اس کا دماغ اس قابل ہو رہا تھا کہ وہ صورت حال کو سوچے سمجھے۔

وہ کیا کر رہا تھا؟ دشمنوں کو گاؤں کا راستہ بتا رہا تھا۔ وہ ملک اور قوم کا غدار تھا۔ یکایک وہ رک گیا۔ "بس اب آگے تو راستہ صاف ہے۔ مجھے معاف کیجئے۔" اس نے کہا۔

"چلو آگے بڑھو۔" کپتان نے خوفناک گرجدار آواز سے کہا۔ اس کا چہرہ ایسا درشت اور پُر شکن تھا کہ اس کو عدول حکمی کی ہمت نہ ہوئی اور وہ کانپتے ہوئے آگے بڑھنے پر مجبور ہو گیا۔

یکایک سپاہی زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔ اب یعقوب نے دیکھا کہ مخالف کی سمت سے کچھ اور سپاہی اِدھر آ رہے ہیں۔ ان کی سرخ ٹوپیاں اور ان پر چمکتے ہوئے ہلال نے اسے بتا دیا کہ وہ اس کے ہم قوم ہیں جو گاؤں کو دشمنوں کے ہاتھ سے نجات دلانے آ رہے ہیں۔ انہوں نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

بندوقوں کی باڑھ اور توپوں کی گرج چاروں طرف سے آنی شروع ہوئی۔ روسی ترکوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے تھے۔ ترکوں نے جب دیکھا کہ روسی ایک گاؤں فتح کر چکے ہیں اور اب دوسرے پر شبخون ماریں گے تو انہوں نے ان کے راستہ میں ہر ایسی جگہ جہاں چھپنا ممکن

اپنے آدمی بٹھا دیئے۔ روسی اس منصوبہ سے بے خبر اپنی دانست میں ایک کامیاب شبخون مارنے جا رہے تھے کہ اچانک ترکوں کی فوج کا ایک دستہ سامنے نمودار ہوا اور لڑائی شروع ہوئی۔ خون کے کے سے سرخ شعلے یعقوب کے سر پر سے گذرنے لگے۔ کراہنے اور مدد کی چیخوں کی دردناک آواز آنی شروع ہوئی۔ آوازیں پہاڑوں سے ٹکرا کر دوہری قوت سے کانوں میں گونجتی تھیں۔

یعقوب جو روسیوں کے آگے آگے تھا۔ اب رک گیا اور الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر کپتان نے اس کے سر پر اس زور کا مکا لگایا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اسے خواب کی سی دھندلی فضا میں ایسا معلوم ہوا کہ روسیوں نے ہتیار رکھ دیئے اور کل دستہ ترکوں کی حراست میں چلا گیا۔ جس میں یعقوب بھی شامل تھا لیکن اس کا دماغ ابھی اس قابل نہ تھا کہ موقعہ کو سمجھے۔ صرف اسے نظر آ رہا تھا کہ ترکی سپاہی اس کے اطراف حلقہ کئے ہوئے تعجب سے اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس کی ترکی ٹوپی اس کا مسلمان اور ترکی ہونا ظاہر کر رہی تھی۔ لیکن وہ روسیوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ ان ہوں نے شروع ہی میں دیکھ لیا۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر تو اس نے قوم کی بڑی خدمت کی جو دشمنوں کو ان کے جال میں پھنسایا لیکن دراصل اس کا منشا یہ نہ تھا وہ غدار تھا۔ وہ روسیوں کا جاسوس تھا جس نے چند روپیوں کی خاطر خود کو اور اپنی قوم کو ان کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ وہ ان کی راہبری کر رہا تھا تاکہ وہ دوسرے گاؤں پر بھی قبضہ کر لیں۔ وہ ان کو قریب ترین مخفی راستہ سے لیجا رہا تھا کہ ترکوں کو اس کی خبر نہ ہو ——

"اٹھو۔ بوڑھے آدمی!" ان چار سپاہیوں میں سے ایک نے کہا جو سنگین لئے ہوئے اس کے قریب ہی کھڑے تھے۔

یعقوب کھڑا ہوا اور بدحواسی سے۔ چلنے لگا۔ چار سنگینوں کے درمیان سے اسے آسمان ایسا شامیانہ نظر آتا تھا جس پر سلمہ ستارے کا کام کیا ہوا ہو۔ ابھی تک اس کے منہ میں خالی پائپ اٹکا ہوا تھا۔ جسے وہ چوسنے لگا۔ مگر اس کا دماغ وہی اپنے تخیلات میں غلطاں و پیچاں تھا۔ اب جو خوف

اس کے دل میں جاگزیں تھا وہ ویسا نہیں تھا جیسا کہ روسیوں کی آمد کے وقت ہوا تھا۔ بلکہ ایک پراسرار خوف جو اس کی قوت سامعہ و باصرہ دونوں کو معطل کر رہا تھا۔ جان و مال کا خوف نہیں بلکہ حیا و عزت کا سوال اس کے لئے دنیا میں اب کوئی جگہ باقی نہ رہی تھی جہاں وہ عزت کے ساتھ اپنا سر چھپا سکے۔

"کیا ہماری رفتار تیز ہے؟" گارڈنے پوچھا کیونکہ یعقوب زور زور سے سانس لے رہا تھا۔

"نہیں۔ نہیں ٹھیک ہے۔" اس نے خوشی سے جواب دیا۔ یہ ہمدردانہ و دوستانہ الفاظ اس کے دل سے خوف کم کر رہے تھے۔

"باہم۔ تمہاری خاطر ہم ذرا آہستہ ہی چلیں تو مناسب ہے۔ لو یہ سگریٹ پیو۔"

اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے یعقوب کو سگریٹ دیا۔ جسے اس نے کان کے اوپر بالوں میں اڑس لیا۔

وہ گاؤں میں داخل ہوئے سڑک لرزاں شعلوں کی روشنی میں کانپتی ہوئی نظر آتی تھی۔ ہوا درختوں سے گذر کر ایک غم آگیں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ گاؤں خالی اور سنسان پڑا تھا۔

یعقوب نے آسمان کی جانب دیکھا۔ تاریکی اور ستارے یکجان ہو گئے۔ یہاں کی ہر شئے سے یعقوب قدیم واقفیت اور انس رکھتا تھا۔ مگر اس وقت وہ گھنٹوں تک برف میں دھستا ہوا حیران پریشان کھڑا تھا۔ یہ جاننا کہ وہ اس وقت کہاں کھڑا ہے اس کے لئے ایک حل نہ ہو سکنے والا معمہ تھا۔

"کاش یہ خواب جلد از جلد ختم ہو جائے۔ اور فی الحقیقت خواب ہی ثابت ہو۔ ..... وہ سڑک کو شناخت نہ کر سکا۔ ..... رات زیادہ آگئی تھی۔ مگر گاؤں کے لوگ روز کی طرح سو نہیں رہے تھے۔ ..... کاش وہ اسے اپنے گھر چلے جانے کی اجازت دیدیں۔"

پن چکی ابھی چل رہی تھی۔ خرمنوں اور مکانوں کے اوپر سے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جلتی ہوئی اوپر اچھلتیں اور دور جا گرتیں۔ دھنواں آنکھوں میں گھسا جا رہا تھا۔

وہ آئے ..... دوستانہ طریق سے مجھے کھانے کی دعوت دی ..... شراب پلاکر گرم مزاج بنایا ..... گرم لباس پہنایا ..... پھر مجھ سے راستہ بتانے کی التجا کی ..... انہوں نے مجھے ڈرایا دھمکایا ..... اور مارا .....

یعقوب نے اپنے فعل کو جایز قرار دیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو جھلک آئے تھے لیکن اس کا رونا اس کو ضمیر کی ملامت سے نہ بچا سکتا تھا کہ وہ ملک و ملت کا غدار ہے۔

یعقوب کے گارڈز ایک دوسرے دستہ کے انتظار میں کھڑے رہے جو روسیوں کو حراست میں لئے ہوئے آرہا تھا۔ روسی ایسے چل رہے تھے جیسے تھکے ہوئے کسان۔ جو شام میں تھکن سے چور کھیتوں سے واپس آرہے ہوں۔ ان میں بعض ہنس رہے تھے۔ سگریٹ پی رہے تھے اور ایک دوسرے کے اوپر مذاق کر رہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو اس کی جھونپڑی میں آئے تھے۔ اس نے کپتان اور دوسرے چند سپاہیوں کو پہچانا۔ جب انہوں نے یعقوب کو دیکھا تو سلام کے طور پر اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کئے اور کہنے لگے "بوڑھے۔ بوڑھے۔" اس نے بے طور آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور شرم سے اپنا سر نیچا کر لیا۔ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یکایک یاد آگیا کہ ان میں وہ نوجوان جس نے اسے اپنے مفلر اور پچیس دئیے تھے شامل نہ تھا۔

"دوسرا۔ وہ۔ وہ۔" اس نے ہاتھ سے گلے کا مفلر بتاتے ہوئے قیدیوں سے پوچھنے کی کوشش کی۔

"اسے تم کہاں چھوڑ آئے۔" سپاہی درمیان میں آگئے اور روسی بغیر جواب دیئے آگے بڑھ گئے۔

پن چکی سے ایک تڑاقہ کی آواز آئی۔ ایک موٹا سرخ بادل اوپر کی طرف اچانک طور پر اٹھا جس میں چنگاریاں ایسے چمک رہی تھیں جیسے نیلے آسمان پر تارے۔ اس بادل کے پیچھے گاؤں والوں کا مجمع تھا جو اپنی فوج کو گاؤں کی طرف آتا دیکھ کر واپس آرہے تھے۔ وہ لوگ سب کے

سب بیک وقت چیخ رہے تھے اور سپاہیوں کے لبادے اپنی طرف پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ اس کے اطراف بچے۔ عورتیں اور بوڑھے سب جمع ہو گئے۔ یہ لوگ مجنونانہ حرکات و اشارات کر رہے تھے

"یہ وہی ہے ..... !"

بقیہ الفاظ شور و غل میں دب گئے۔ یعقوب کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ جس میں دیو قامت مرد و زن کسی ہوئی مٹھیاں اس کی طرف ہلاتے ہوئے گالیاں دے رہے تھے۔ یکایک اسے ٹھوکر لگی۔ وہ سپاہیوں کے درمیان ایسا تھا جیسا پنجرے میں مقید پرندہ۔ انہوں نے سہارا دیکر اسے اٹھایا۔ وہ اپنے پھٹے ہوئے لباس کو دیوانے کی طرح پھاڑنے لگا۔ اس کے ہونٹ مسلسل طور پر ہلتے جا رہے تھے۔ اس کے سینہ کی گہرائیوں سے چھوٹے بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رونے کی آواز نکل رہی تھی۔

ہجوم ہاتھ ہلاتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا منہ چتھڑوں میں چھپا لیا۔ اور کانوں میں انگلیاں دے لیں سپاہی کے ساتھ مدرسہ میں داخل ہوا جہاں اس وقت فوج کے کرنل کا قبضہ تھا روسی قیدیوں کی قسمتوں کا فیصلہ کر لیا گیا اور ان کو آرام سے مقید رکھنے کا حکم ملا۔ کرنل کمرہ کے درمیان میں سگریٹ پیتا ہوا ٹہل رہا تھا۔

"میں ..... ہیں ....." یعقوب نے فرط کرب سے کراہتے ہوئے کہا۔ اس کے سر کے بال جو الجھے ہوئے اور اس کا دریدہ لباس اسے انسان کی نسبت کسی حیوان سے زیادہ مشابہت دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ مکوں کی ضربوں کی وجہ سے سیاہ اور سوجا ہوا تھا۔ اس کے خون آلودہ کان کے اوپر ابھی تک سگریٹ اٹکا ہوا تھا ـــــ اور وہ رو رہا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے گارڈ سے رپورٹ سنکر اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ اور ایک عجیب احساس اعتراف یعقوب پر طاری ہوا۔

"میں مجرم ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"انہوں نے مجھے کھانا کھلایا" یعقوب نے کہا۔ اور یہ مفلر اور پتلون دی ــــ پھر انہوں نے مجھے مارا!"

"تم ہی نے انہیں راستہ بتایا؟"

"ہاں!"

"کیا تم ان کے تنخواہ دار جاسوس تھے؟"

یعقوب نے بغیر سوال کا مطلب سمجھے نیم بیہوشی کی حالت میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اچھا۔ اب اپنی صفائی کے لئے تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

یعقوب کسی خاص فکر میں غرق تھا۔ نہ اس نے سوال سنا اور نہ اس کا جواب ہی دیا۔ افسر نے کاغذ پر کچھ لکھا اور سنتری کو یعقوب کے باہر لے جانے کا اشارہ کیا۔

اب بھی یعقوب خاموش تھا۔ اور خاموشی کے ساتھ وہ پہرہ دار کی معیت میں باہر چلا گیا۔ باہر کھڑے ہوئے ہجوم کے درمیان سے بھی وہ اسی طرح سر نیچا کئے گذرا۔

"وہ کیسا سہما ہوا معلوم ہوتا ہے..... انہوں نے اسے کتنا مارا..... وہ کس قدر خوف زدہ ہے" چند رحم دل اشخاص نے کہا۔ اس نے مفلر کو گلے کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔ کیونکہ اسے شدت سے سردی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ وہی دغاباز ہے ــــ مار ڈالو ــــ قتل کر ڈالو" غصہ ور مجمع چلایا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ ایک دوسری عمارت میں داخل ہوئے۔ طویل و عریض کمرہ میں اسٹاف کے افسر بیٹھے ہوئے۔ جن کے درمیان میں کمانڈر کھڑا ہوا کچھ تقریر کر رہا تھا۔ یعقوب کو دیکھ کر وہ رک گیا۔ اور دوسرے افسر بھی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

گارڈ نے کرنل کا لکھا ہوا کاغذ دیا اور زبانی رپورٹ سنائی۔

"یہی مجرم ہے نا؟" اس نے یعقوب کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے گارڈ سے پوچھا۔ اس کی

گھنی ابروؤں کے نیچے سے اس کی تیز چمکدار آنکھیں عقابی متجسس نظروں سے یعقوب کا دل چھید رہی تھیں

"جی ہاں سرکار!" یعقوب نے اپنی زبان سے گویا جرم کا اقبال کرلیا۔

"تم ہی نے انہیں راہ بتائی؟"

اس سوال سے یعقوب کا دل مطمئن ہوگیا۔ وہ خیال کرنے لگا کہ یہاں وہ واقعہ عمدگی سے سمجھا سکتا ہے

"ہاں" اس نے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور چمکتی ہوئی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

"تم جانتے ہو، اس کی سزا کیا ہے؟"

کماندار نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اس کے انداز سے عظمت و حکومت ٹپکتی تھی۔ یعقوب مرعوب ہوگیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ گویا کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

"تم اپنی صفائی کے لئے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ہم نے ساتھ ملکر کھانا کھایا....." اپنی بہترین استعداد دماغی سے کام لیکر ابتدا کی۔ جو اس کی رائے میں موثر اور مناسب حال تھی۔ وہ اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ دفعتاً رک گیا۔ کیونکہ کماندار اس کی طرف آتشین نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

یعقوب نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اور ہوا اور لہروں کی آواز کو سننے لگا۔ کماندار ابھی تک اسی کی جانب اپنی آنکھوں سے شرر باری کر رہا تھا۔ دونوں اس حالت میں ایک لمحہ تک جو یعقوب کو صدیوں کے برابر طویل معلوم ہوا دیکھتے کھڑے رہے۔ کماندار فوجی لباس میں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پتھر کا مجسمہ اور یعقوب لرزہ براندام۔ پستہ قد۔ دریدہ خاک و خوں آلود لباس میں کوئی ناپاک بھتنا۔ یعقوب نے محسوس کیا کہ کوئی بھاری بوجھ اس کے سینہ پر رکھا ہوا ہے۔

"لے جاؤ"

آواز کے تحکمانہ اور پر غیظ و غضب لہجہ سے اسٹاف کے افسر بھی چونک پڑے۔

اسے ایک شکستہ عمارت کے کمرہ میں مقید کردیا گیا اور ایک سپاہی اس کی حفاظت کے لئے

مقرر کیا گیا۔ باہر ہال میں اور دوسرے متصلہ کمروں میں ٹوٹی ہوئی قطاروں میں سپاہی بھی پڑے سو رہے تھے۔ ان کے خراٹوں کی آواز امواج آب۔ طوفان باد۔ اور تاریکی شب سرد سے ملکر ایک عجیب خوفناک منظر پیدا کر رہی تھی۔

یعقوب گھانس کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ کسی نے پھٹی سی ایک بلانکٹ پھینک دی۔

"تم رو رہے ہو؟" سپاہی نے آواز سنکر باہر سے دریافت کیا۔ اور اس کے بوڑھا پے پر رحم کھا کر نرم الفاظ میں تسلی و تشفی دلانی شروع کی۔

یعقوب خاموش ہو رہا۔ ان شیریں الفاظ نے اس کے لئے لوریوں کا کام کیا تھا۔ وہ سو رہا تھا

صبح جب یعقوب کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ سورج نکل چکا ہے جس کی شعاعوں سے سارا برفپوش جہان یک بیک چمک اٹھا ہے جس سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوتی ہے۔ ہوا تازہ اور سرد تھی

اس نے اٹھ کر سنتری کو سلام کیا جس نے جواب سلام کے ساتھ اسے سگریٹ کا تحفہ پیش کیا ابھی یعقوب جو کل کی باتوں کو تقریباً بھول چکا تھا دھوئیں کے بقعے فضا میں چھوڑ رہا تھا کہ کافی کی پیالی اور باسی توس بھی آ گئے۔

تاہم اس کے دل میں ابھی خلش باقی تھی "میں مجرم ہوں۔۔۔۔ قوم اور ملک کا" اس نے نسیم صبح سے رازدارانہ لہجہ میں کہا۔

ایک قلیل وقفہ کے بعد چند سپاہی آئے اور اسے سنگینوں کے سایہ میں اپنے ساتھ لے چلے کہاں؟ ابھی اسے یہ نہ بتایا گیا۔

ہائیں! یہ تو اس کے گاؤں کا قبرستان تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے آگے بڑھنے سے انکار کرنا چاہا۔ لیکن اس کی گذارشوں کی پذیرائی نہ ہوئی اور گو نرم الفاظ میں لیکن سپاہیوں نے جواب دیا کہ وہ حکم سے مجبور ہیں۔ انہیں اس کی حالت پر رحم تو ضرور آتا ہے مگر اس کو چلنا اور قسمت کا لکھا بھرنا پڑیگا۔

اسے کچھ عجیب پراسرار احساس ہو رہا تھا۔ پن چکی کے کھنڈر اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ پانی پھیکو اب بھی گردش دے رہا تھا۔ کاجل اور دھواں پانی پر بہتا چلا جاتا تھا کسی نامعلوم منزل کی تلاش میں۔

مجرم ..... نامجرم ..... آہ ان دونوں لفظوں میں کتنا کم فرق ہے۔

اس کے بازو گہری کھائی کھدی ہوئی تھی۔ جن میں چند کھوپریاں اور انسانی ڈھانچ پڑے نظر آرہے تھے

دوسری طرف ایک درخت کے سائے میں سپاہیوں کا ایک دستہ بے ترتیبی سے کھڑا ہوا تھا۔ افسر قیدی کو آتا دیکھ کر آگے بڑھا۔ گارڈ سے کچھ دریافت کیا۔ کاغذات لیکر ملاحظہ کئے یعقوب کو نظر بھر کر دیکھا۔

پھر پلٹ کر اس نے سپاہیوں کو یعقوب کے بالمقابل باقاعدہ کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔

یعقوب کی آنکھوں پر رومال باندھ دیا گیا۔

سپاہیوں نے حکم پر اپنی بندوقیں سینہ سے تان لیں۔

دوسرا حکم ملا۔

گولیاں سنسناتی ہوئی چلیں۔

دفعتاً یعقوب کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ وہ اُچھلا۔ اور خندق میں گر گیا۔

خندق اور جنگل سے دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے بادل اُٹھ رہے تھے۔

"چاندبی بی سے"

از
رشید سبحانی

اے نسیمِ باغِ ملت، جوہرِ خاکِ دکن
تھا عیاں تیری جبیں سے خندۂ صبحِ وطن

اے بہارِ جانفزائے گلشنِ احمد نگر
تیرے جلووں سے نمایاں تھا سدا رنگِ سحر

تیرے نقشِ پا سے بیجاپور تھا رشکِ چمن
تو مہِ روشن، ستاروں کی اگر وہ انجمن

شیر دل کرتی تھی اکثر رشک تجھ پر رزم میں
چاندنی پھیلی ہوئی تھی تیرے دم سے بزم میں

کیسے کیسے معرکے دشوار تو نے سر کئے
زندگی تیری سبق، ذوقِ مجاہد کیلئے

معرکے ہمت کے تیری سنکے حیراں مرد ہیں
ہیبتِ دشمن کے ماری اپنے چہرے زرد ہیں

بیچ اعدا میں تری تلوار طوفاں خیز تھی
رجز خوانی بھی غضب کی دل انگیز تھی

ایک پیغامِ حیات افروز تھی تیری نظر
اکبری اقبال بھی حیراں تھا تجھکو دیکھکر

پردۂ ناموسِ ملت لے قمر تیری ردا
جس سے ظاہر پاسِ آئینِ محمد مصطفےٰ

تذکرہ سے تیرے اپنی داستاں رنگین ہے
تو مگر مفقود ہے بس اس سے دل غمگین ہے

قوم پر ظلمت ہے استبداد کی چھائی ہوئی
یہ دعا دل سے زباں پر آج ہے آئی ہوئی

کوئی تجھ سا چاند زیبِ مطلعِ امید ہو
شامِ غم اپنے لئے پیغامِ صبحِ عید ہو

معاشیات کی علمی وسعت اور عملی اہمیت

از
مولوی فیض الدین صاحب متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ

دنیوی علوم کی وسعت اور اس کے مباحث کی پیچیدگی کو دیکھکر علامہ دہر سر اسحٰق نیوٹن نے بھی یہ کہدیا تھا کہ میری حالت علم کے بحر ناپیدا کنار اور زخار سمندر کے مقابلہ میں ایک ایسے بچے کی مانند ہے جو کنارے بیٹھا ہوا گھونگوں سے کھیلنے لگے اور اپنی طفلی عقل کی وجہ سے یہ سمجھے کہ اس نے ایک بہت بڑی دولت پالی ہے اور اسکو اسکی خبر نہ ہو کہ اس بحر مواج میں بے شمار قیمتی موتی بھی پوشیدہ ہیں اور جنہیں ایک ماہر غوطہ زن ہی اسکو باہر نکال سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ موجودہ علوم وفنون کی بالکل یہی حالت ہے۔ جب ایسے زبردست علامہ نے اس کے مقابلہ میں اپنی بیچارگی کو تسلیم کیا ہے تو پھر کسی کی کیا مجال ہے کہ علوم وفنون کا احاطہ کرنا تو بڑی چیز ہے اس سے کما حقہ آگاہ ہونیکا بھی وہ دعویٰ کرسکے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان علوم وفنون کی وسعت کو دیکھکر خوفزدہ ہو۔ اسے جسقدر بھی ممکن ہو اپنی خداداد ذہنی قابلیتوں سے کام لے اور متقدمین نے جسقدر سرمایہ اس میں چھوڑا ہے اس میں کچھ اپنا ذاتی سرمایہ بھی شامل کرے اور اس طرح سے اضافہ دولت کا باعث ہو جس سے دنیا ایک گونہ فائدہ حاصل کرسکے ورنہ اسکے اندر اس قدر گہرائی ہے کہ جسکی تھاہ آجتک کسی کو نہیں مل سکی۔

علوم کی تقسیم۔ علوم وفنون کو بالعموم دو شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جن کا تعلق مادہ و موالید ثلاثہ سے ہوتا ہے جیسے طبعیات، کیمیا، طب، ریاضی وغیرہ اور ان علوم کو علوم متعارفہ کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ علوم ہیں جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے اور ان علوم میں سیاسیات، عمرانیات، قانون اخلاقیات اور اسی قسم کے دوسرے علوم شامل ہیں اور انہیں میں سے ایک فن یا علم معاشیات کا ہے جس کا موضوع انسانی احتیاجات اور اسکو پورا کرنیکے وسائل ہیں۔ انسان کی زندگی کے جس پہلو پر وہ روشنی ڈالتا ہے

وہ پہلو اسقدر واضح یقینی اور ضروری ہے کہ شاید ہی انسانی زندگی کا کوئی دوسرا پہلو اسقدر ضروری ہو۔ اسی لئے اس فن کا تعلق نہ صرف ان علوم سے ہے جس کو غیر متعارفہ کہا جاتا ہے بلکہ ان علوم سے بھی ہے جسکو متعارفہ کہتے ہیں گویا تعلق اور نسبت کے اعتبار سے بھی اسکی وسعت اور حدود بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ بہرحال دنیا میں کوئی علم اور فن ایسا نہیں ہے جس سے معاشیات کو بالواسطہ بلاواسطہ تعلق نہ ہو یہی وجہ کہ معاشیات کے حدود نہایت وسیع ہیں اسلئے اسکے مسائل کا احاطہ کرنا نہایت دشوار امر ہے اس علم کا ایک ایک مسئلہ بجائے خود اسقدر اہمیت رکھتا ہے کہ اگر کوئی طالب علم اس کے کسی ایک مسئلہ کے مطالعہ اور تحقیق کیلئے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہے تو اس کیلئے اس میں بہت بڑی گنجائش موجود ہے کیونکہ اس فن میں جس قدر تحقیق کیجائیگی اسی قدر نئے نئے معلومات ہوتی جائینگے اور جوں جوں اس کی گہرائیوں میں بڑھتے جائینگے قیمتی موتی اور انمول گوہر دستیاب ہوتے جائینگے کیونکہ بقول جوئندہ یابندہ محقق اپنا پھل پاکر رہیگا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اسکی ابتدا کہاں سے ہوئی زمانہ وسطی میں اس پر کیا گزری کن کن حالات سے سابقہ پڑا اور اب اسکی کیا حالت ہے ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہ ہوگا کہ دنیا کا پہلا انسان جب پہلے پہل دنیا میں قدم رکھا تو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی وہ براہ راست معاشیات ہی سے تعلق ہوگا کیونکہ اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خواہ انسان ہو یا حیوان غرض کوئی جاندار جب عالم وجود میں آتا ہے تو سب سے پہلے اسکو خود اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی احتیاج محسوس ہوتی ہے اور بلا امتیاز انسان حیوان یہ پہلی احتیاج اور ضرورت ہے جو اسکو اس دنیا میں زندہ رہنے کیلئے فطرتاً محسوس ہوتی ہے اور قدرت اپنی جانب سے ہوا کی ایک نعمت بے بہا اسکو عطا کرتی ہے جس کو حاصل کرکے ہر جاندار زندگی کی سانس لیتا ہے اور یہ سب سے پہلی دولت ہے جو قدرت اپنی طرف سے فراہم کرکے ہر ایک ذی حیات کو بخشتی ہے۔ اس کے بعد دوسری احتیاج جو ہر ذی روح کو محسوس ہوتی ہے وہ اپنی پیاس کو بجھانا ہے تشنگی کو رفع کرنا ہے۔ ان دو احتیاجات کے بعد تیسرا درجہ تن پوشی کی ضرورت ہے جو ہر ایک انسان کیلئے لازمی امر ہے۔ غرض احتیاجات کا یہ ایک سلسلہ ہے جس میں انسان نہایت بری طرح گرفتار ہے مگر قدرت کی یہ ایک نہایت ہی عجیب و غریب فیاضی ہے کہ جو احتیاج سب سے زیادہ لازمی اور سب سے بڑھکر ضروری ہے وہی مبادلہ سے آزاد ہے یعنی جس نسبت سے احتیاجات کی شدت انسان کو محسوس ہوتی ہے اسی نسبت سے

اس کے حصول میں قدرتے آسانی پیدا کردی ہے اگر ہم اس امر پر غور کریں تو معاشیات کا یہ علمی مسئلہ جس پر معاشیات کی بنیاد قایم ہے اپنے اندر غیر معمولی دلچسپیاں اور حقایق رکھتا ہے اس کی وسعت اس سے ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی انسان احتیاجات کی گرفت سے آزاد نہیں ہے اور جب ہر انسان ضروریات میں جکڑا ہوا ہے تو لازماً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مطالعہ انسان کی اجتماعی زندگی کے ایک ضروری اور اہم جزو کا مطالعہ ہے۔ علوم متعارفہ کا تعلق چونکہ اشیاء سے ہے اسکے مختلف تجربات کے بعد ایک قطعی رائے ایک اٹل نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے برخلاف علوم غیر متعارفہ کے کہ چونکہ وہ انسان کا مطالعہ ہے اس لئے حالات و واقعات کو ایک جا جمع کرکے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے اور جو رائے قایم کیجاتی ہے وہ قطعی نہیں کہی جا سکتی کیونکہ ممکن ہے کہ ایک ماہر معاشیات کی رائے چند مخصوص حالات کے تحت صحیح ہو مگر جب حالات بدل جائیں جن حالات میں تغیر پیدا ہو جائے تو اسی نتیجہ کو قطعی تسلیم کرلینا درست نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نتائج میں بھی نمایاں فرق پیدا ہوتا جاتا ہے ایک سائنس داں سائنس کے تجربہ خانہ میں ہر قسم کا تجربہ کرسکتا ہے ہر ایک چیز کے متعلق خواص معلوم کرکے کوئی صحیح رائے قائم کرسکتا ہے سائنس کا تجربہ خانہ اسکو ہر قسم کی مدد دے سکتا ہے ہر ایک سہولت بہم پہونچا سکتا ہے مگر غریب معاشی ان سب سہولتوں اور آسانیوں سے محروم ہے۔ سارا عالم اس کیلئے ایک تجربہ خانہ ہے۔ اسکو انسانوں کے خیالات کی ٹوہ لگانی پڑتی ہے۔ رفتار زمانہ کی تبدیلیوں پر غور کرنا پڑتا ہے۔ حالات کے نشیب و فراز پر توجہ کرنا پڑتی ہے۔ واقعات کے تلاطم میں اپنی تحقیق کی کشتی کو ڈالدینا پڑتا ہے۔ غرض یہ سب مشکلات اور قیود علوم عمرانی میں پیش آتی ہیں جن سے کسی طرح مفر نہیں ہو سکتا ہے۔

معاشیات کا موضوع ہر علم و فن کا کوئی نہ کوئی موضوع ہوا کرتا ہے جسپر اسکی بنیاد قائم کیجاتی ہے جس طرح سائنس کا موضوع مشاہدہ میں آنیوالی اشیاء کے خواص اور اسکی ماہیت دریافت کرکے اُن سے استفادہ حاصل کرنا ہے اور جس طرح طب کا موضوع انسان کا بدن اسکے اعضا اور ادویہ ہیں اسی طرح معاشیات کا بھی موضوع ہے۔ یہ ظاہر کیا جا چکا ہے کہ اس علم کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ علم انسان کی زندگی کے کن پہلو سے بحث کرتا ہے۔ معاشیات کے موضوع کو طے کرنے میں ابتداءً معاشین میں بہت اختلاف رائے تھا مگر اب سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ معاشیات جس چیز سے بحث کرتا ہے وہ انسانی احتیاجات ہیں۔ یہ موضوع بجائے خود اسقدر وسیع ہے کہ اسکے حدود کا تعین نہیں کیا جا سکتا دنیا میں کوئی ایسا

شخص ہو گا جس کو احتیاجات محسوس نہیں ہوتیں ممکن ہے یہ خیال پیدا ہو کہ راہبین، سنیاسی اور اسی قسم کے تارک الدنیا لوگ احتیاجات سے مستثنیٰ اور مبرا ہوتے ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی ضروریات سے خارج نہیں ہوا کرتے۔ احتیاجات تارک الدنیا اور دنیا دار دونوں کو ہوا کرتی ہیں لیکن ان کے احتیاجات کی نوعیت جدا جدا ہے۔ تارک الدنیا لوگوں کی ضروریات اور قسم کی ہیں اور دنیا دار لوگوں کی اور قسم کی۔ ایک کی احتیاجات غیر مادی ہیں دوسرے کی مادی۔ بس یہی فرق دونوں قسم کے لوگوں کی ضروریات میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا غیر مادی احتیاجات بھی معاشیات کے دایرہ میں شامل ہیں حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک معاشیات کے علم اور اسکے احوال کا تعلق ہے اس قسم کی غیر مادی احتیاجات ہم معاشیات کے دائرہ سے خارج نہیں کر سکتے کیونکہ جو موضوع معاشیات کا قرار دیا گیا ہے اسکے لحاظ سے کوئی وجہ بظاہر ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ اسکو اس دائرہ سے خارج کیا جائے۔ البتہ اصول سے ہٹ کر جب اسکی عملی حد شروع ہو جاتی ہے اور اضافت کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو خود بخود غیر مادی احتیاجات مثلاً تارک الدنیا لوگوں کی ضروریات اس سے خارج ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ہر غیر مادی احتیاج کا معاشیات کے دائرہ سے خارج ہونا ضروری نہیں ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ بعض غیر مادی احتیاجات ایسی بھی ہیں جن سے پیدائش دولت میں بہت بڑی مدد ملتی ہے۔ جیسے خوش خلقی، کارکردگی، تندرستی، خوش معاملگی، راستبازی وغیرہ یہ ایسے صفات ہیں جن کا وجود پیدائش دولت اور تجارتی معاملات جیسی چیزوں میں نہایت ضروری ہوتا ہے۔ غرض اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر وہ احتیاج معاشیات کے دائرہ میں داخل ہے جس سے انسانی تعلقات پیدا ہوتے ہوں اور جس سے انسان کی عملی اور معاشی زندگی کا پتہ ملتا ہو۔

بعضوں نے اس علم کو علم دولت بھی کہا ہے۔ اس کو علم دولت کہنے سے عجیب عجیب غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ کسی نے یہ سمجھا کہ یہ ایسا علم ہے جس سے دولت کمانے کے ڈھنگ معلوم ہو جاتے ہیں اور کسی کا یہ خیال ہے کہ یہ علم ایسا اگر انسان کو سکھا دیتا ہے جس سے انسان گھر بیٹھے دولت پا سکتا ہے یا ایک ایسا دست غیب ہے جس کے سیکھنے سے بغیر ہاتھ پیر ہلائے دولت کی ڈھیر لگ جاتی ہے۔ یہ سب خیالات تنگ نظری پر مبنی ہیں۔ اگر علمی اعتبار سے دولت کی توجیہ و تشریح کیجائے تو معلوم ہو گا کہ دولت فی نفسہٖ مقصود بالذات کوئی شے نہیں ہے کیونکہ اگر انسان کو احتیاجات ہی محسوس نہ ہوں تو دنیا کی کوئی شے بھی دولت نہیں کہلائی جا سکتی۔ کوئی چیز دولت محض اس لئے ہے کہ اس سے انسانی احتیاج وابستہ ہوتی ہے۔ دولت کی خصوصیت

ہی یہ ہے کہ وہ انسانی احتیاج کو رفع کرنیکی اس میں قابلیت موجود ہو۔ جس چیز میں یہ صفت یا خصوصیت نہ ہو ہم اسکو دولت میں شریک نہیں کر سکتے۔ ایک طرف تو انسانی احتیاجات ہیں کہ پیدا ہوتی جارہی ہیں اور دوسری طرف وہ وسائل یا ذرائع ہیں جن سے احتیاجات رفع ہوتی ہیں۔ اگر انسانی خواہشات، آرزؤں، تمناؤں وغیرہ کی تحلیل کیجائے تو معلوم ہوگا کہ انسان بظاہر بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ آرزؤں کا پتلا، تمناؤں کا بندہ اور احتیاجات کا مجسمہ ہے اس کے سینہ میں دن رات احتیاجات کا ایک سیلاب موجزن رہا کرتا ہے۔ وہ اپنی ان آرزؤں کو پورا کرنے خواہشات کو رفع کرنے تمناؤں کو بر لانے کے لئے مخلوقات میں سے ہر ایک شے کو تلاش کرتا ہے اگر اپنے سوال کا جواب اس کے اندر پاتا ہے تو وہ اس کو اپنے مفید خیال کرتا ہے یا بالفاظ دیگر جس چیز میں اس کے لئے افادہ موجود ہو وہی چیز معاشیات کی اصطلاح میں دولت ہے۔

جب دولت کی خاصیت یہ ہو تو اس کو ایک غیر معمولی چیز سمجھنا یا اسکو ایک ناقابل توجیہ حقیقت تسلیم کرلینا کیونکر درست ہو سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دولت کا لفظ کانون کو کچھ ایسا خوشگوار معلوم ہوتا ہے اور اسکی محبت میں ہر شخص ایسا مگن اور سرشار نظر آتا ہے کہ جس کی وجہ سے اسکو یہ غور کرنیکا خیال نہیں آتا کہ اسکے اندر جو اسقدر جاذبیت موجود ہے اسکی اصلیت کیا ہے۔ مگر معاشیات نے اس کو ایک وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس موہوم لفظ کی علمی توجیہ اور تشریح کرکے دنیا کو دکھایا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ غرض یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ اس علم کی وسعت خود اسکے موضوع میں پوشیدہ ہے۔

معاشیات کا دیگر علوم سے تعلق۔ قبل اسکے کہ اس علم کا تعلق دیگر علوم سے ظاہر کیا جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت بحث پر کچھ سرسری طور پر روشنی ڈالی جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ باعتبار اس کے مبحث کے اس کے ہمجنس علوم یعنی علوم عمرانی سے اس علم کا کیا تعلق ہے۔ کیونکہ معاشیات سے علوم عمرانی کا تعلق بھی نوعیت بحث پر مبنی ہے۔ اس سے قبل ہم نے اسکے موضوع پر کافی بحث کی ہے اب یہ بتانا مقصود ہے کہ اس مضمون کے متعلق جو بحث کیجاتی ہے اس کا نقطۂ نظر کیا ہے اور کس زاویۂ نگاہ سے اس علم کی توجیہ کیجاتی ہے۔ علماء معاشیات میں عرصہ دراز سے یہ اختلاف چلا آرہا ہے کہ معاشیات آیا علم ہے یا فن۔ معاشیات کی اس علمی بحث میں دو جداجدا گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ تو اس کو علم بتاتا ہے اور دوسرا اس کو

فن ظاہر کرتا ہے مگر علماء معاشیات کے ان گروہوں کے خیالات خواہ کچھ ہی ہوں لیکن اسقدر تو مسلم ہے کہ جہانتک اسکی حیثیت نوعی کا تعلق ہے ابتداءً اس کا آغاز فن ہی سے ہوا رفتہ رفتہ جب ضروریات زمانہ بڑھتی گئیں خیالات میں تغیر ہوا۔ معاشرت میں سادگی باقی نہ رہی اور انسان کا تمدن پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا گیا تو ضرورت اس امر کی درپیش ہوئی کہ انسان کے اس باہمی تعلقات اور معاشرت کا علمی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا جائے۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ معاشیات نے فن سے علمی حیثیت پیدا کی نہ کہ علم سے فن جیسا کہ دیگر علوم کا قاعدہ ہے بہرحال جہانتک معاشیات کے اصول کا تعلق ہے ہم اس کو علم کہہ سکتے ہیں اور جہاں اسکی عملیت کا سوال پیدا ہوا سکو فن میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس علم میں دونو پہلو موجود ہیں یعنی معیاری اور ایجابی۔ اسی کو معاشیات نظری اور معاشیات عملی یا مالیات بھی کہتے ہیں۔ اگر معاشیات کو بالکلیہ علم یا فن قرار دیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ علم فن سے اور فن علم سے جدا ہو جائیگا جس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔ ان دونوں میں زبردست باہمی لزوم ہے کیونکہ علم ایجابی کے بغیر علم معیاری کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس علم کا ایجابی ہونا ضروری ہے لیکن ایجابی علم کی نفسہ کچھ مفید نہیں ہے اور نہ محض علم کچھ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ غرض دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ان کا باہمی اتصال ناگزیر ہے۔

معاشیات اور اسکے ہمجنس علوم یعنی علوم عمرانی مثلاً اخلاقیات، قانون، سیاسیات اور نفسیات وغیرہ کی یہی مشترک خصوصیت ہے کہ ان کی تصاویر کے دو دو رخ ہیں ایک اصولی دوسرے عملی۔ اور چونکہ معاشیات بھی انہی کی ایک شاخ ہے اسلیئے ان علوم سے معاشیات کا نہایت ہی گہرا تعلق ہے۔ از منۂ قدیم میں چونکہ انسانی تمدنی زندگی نہایت سادہ مختصر اور تکلفات سے معرا تھی اسلیئے ان علوم کو علیحدہ کرنیکی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ارتقائے تمدن کے ساتھ ہی یہ سب علوم تقسیم عمل کے اصول پر علیحدہ علیحدہ طور پر منقسم ہو گئے۔ اور اور چونکہ یہ سب علوم ایک ہی دریا کی مختلف نہریں اور ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں اسلیئے ان کا باہمی تعلق نہ صرف اس لحاظ سے گہرا ہے کہ ان سب کا مرجع اور مصدر ایک ہے بلکہ نصب العین میں بھی بہت بڑی حد تک مناسبت پائی جاتی ہے کیونکہ ان سب علوم کا تعلق انسان کے مدنی الطبع ہونیکے اعتبار سے ہے اور مطمح نظر بھی انسان کی اجتماعی زندگی یا اجتماعیت ہے اور یہ سب علوم انسان کے اسی خاص پہلو سے بحث کرتے ہیں۔ آخر علوم عمرانی میں کس قسم کا باہمی تعلق ہے اسکی تفصیل کو ہم نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیز مسلّمات میں سے ہے اور اسکی تفصیل میں پڑنا بے ضرورت طوالت ہوگی۔

معاشیات کا مذکورہ بالا علوم کے علاوہ دیگر علوم سے بھی تعلق ہے ۔ یہ تعلق اگر براہ راست نہ بھی ہو تو بالواسطہ ضرور ہے ۔ مثلاً تاریخ کو لیجئے کہ اس سے معاشیات کا ایک نوع کا تعلق ہے کیونکہ تاریخ کے معلومات سے معاشی مسائل کی تحقیق اور تصدیق میں گراں قدر مدد ملتی ہے ۔ ماضی کے معلومات کا ذخیرہ جب تک ہمارے پیش نظر نہ ہو اس وقت تک اس علم کی ترقی اور اسکی رفتار کا ٹھیک ٹھیک اندازہ قائم نہیں کیا جا سکتا اور گزشتہ کے معاشی حالات اور اسکی جد و جہد کا پتہ بغیر تاریخ جانے ہوئے لگانا ہمارے لئے نہایت دشوار ہو جاتا ہے منطق سے بھی معاشیات میں بہت مدد ملسکتی ہے ۔ کیونکہ مختلف تجربات اور واقعات و حالات کا مشاہدہ کر کے نتائج کا استنباط کرنا اور صحیح رائے قائم کرنی اور تحقیقات کے طریقوں کا دار و مدار بالکلیہ اسی علم پر ہے ۔ اسی طرح نفسیات سے بھی اس کا قریبی تعلق ہے ۔ تجارت اور خاص کر اشتہار بازی میں جس طریقہ اور پیرایہ میں نفسیات سے مدد لیجاتی ہے اس پر اگر تفصیلی بحث کیجائے تو اسکے لئے ایک علحدہ مستقل عنوان کی ضرورت ہے ۔ طبعیات اور کیمیا یعنی سائنس سے اس کا ایسا ہی تعلق ہے جیسے جسم سے کپڑے کا ہوا کرتا ہے جس سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس علم کا پھیلاؤ باعتبار اس کے تعلق کے کسقدر وسعت رکھتا ہے اور چونکہ اس علم کا مقصد انسان کی عملی زندگی کا مطالعہ ہے اس لئے اس کا سایہ تقریباً ہر ایک چیز پر پڑا ہوا ہے

معاشیات کا ارتقاء معاشیات کے ارتقاء اور اس کے نشو و نما کے مختلف دور قرار دئے جا سکتے ہیں بالعموم اس کے تین دور تسلیم کئے گئے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ جب اسکی حالت بالکل ابتدائی تھی ۔ زندگی سادہ تھی تکلفات اور تکلفات سے بری تھی ۔ لوگوں کی ضروریات محدود اور انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں ، مبادلہ باہمی اگرچہ جاری تھا مگر نہ اسقدر کہ اس میں پیچیدگی کی وجہ سے دقت واقع ہو ۔ زر کی ایجاد نہ ہوئی تھی ۔ اسکے بعد معاشیات کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں معاشیات نے اپنے قدم آگے بڑھائے ۔ احتیاجات میں اضافہ ہونے لگا اور ان احتیاجات کو رفع کرنیکی تدبیریں اور وسائل بھی مہیا ہونے لگے ۔ اسکے بعد تیسرا دور وہ ہے جس کو ہم آجکل دیکھ رہے ہیں اور جس کو ہم سرمایہ داری کا دور یا عہد استعماریت سے تعبیر کرتے ہیں معاشی جد و جہد کی موجودہ حالت کن کن اسباب و حالات کا نتیجہ ہے اور یہ مختلف دور کسطرح یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوئے اور ارتقاء کس طرح ہوتا رہا ۔ اس کے معلوم کرنے کیلئے معاشی تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے لیکن معاشیات کی نشو و نما اور اس کے ارتقاء کے سلسلہ میں یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اس کا نقطۂ آغاز کیونکر ہوا اور معاشیات کے لفظ نے اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے کون کون سے مراحل طے کئے اور اسکا

موجودہ لفظ کن کن تغیرات اور تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔ اس موقع پر لفظ اکانمی کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے یہ لفظ پہلے پولٹیکل اکانمی کے نام سے موسوم تھا۔ اکانمی ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی انتظام خانہ داری کے ہیں۔ بعد میں یہ لفظ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ یعنی (DOMESTIC ECONOMY) اور (POLITICAL ECONOMY)۔ ڈومسٹک اکانمی میں صرف خانہ داری کا انتظام اور اس کے آمد و خرچ کا حساب داخل تھا۔ اور پولٹیکل اکانمی سے یہ مراد تھی کہ حکومت چونکہ قدیم زمانہ میں لوگوں کے کاروبار اور معاشی معاملات میں مداخلت کیا کرتی تھی اسلئے اسکو پولٹیکل اکانمی سے تعبیر کیا گیا۔ اسطرح اکانمی میں بہت تفاوت اور فرق ظاہر کرنے کیلئے دونو کو علیحدہ علیحدہ کر کے دو جداگانہ نام دئیے گئے۔ پروفیسر الیاس برنی نے اپنی مولفہ کتاب "اصول معاشیات"[1] میں اس لفظ کے مفہوم اور معنی کے متعلق حسب ذیل خیال ظاہر کیا ہے "چونکہ کفایت شعاری اور منفعت طلبی معاشی معاملات کے حسن انتظام کی لازمی خصوصیت ہے، لفظ اکانمی میں کفایت شعاری کا خیال بتدریج ملتے ملتے ایسا پیوست ہوگیا کہ لوگ اصلی معنی انتظام خانہ داری یا معاشی خیالات کی نگرانی بھلا بیٹھے اور مدت تک اچھے اچھے اس مغالطہ میں مبتلا رہے کہ یہ علم کفایت شعاری کی دولت پرستی اور خود غرضی کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں بعض پاک طینت ملکوں نے اس پر بہت زہر اگلا اور دل کھولکر اسے صلواتیں سنائیں اور ناواقفیت و غلط فہمی کی وجہ سے وہ بھی معذور تھے بعد کو اس کا مبحث اور موضوع بہت کچھ صاف ہوگیا یعنی وہ انسانی زندگی کے ایک خاص اور اہم شعبہ کا مطالعہ قرار پایا۔ تاہم چونکہ لفظ پولٹیکل اکانمی سے مغالطہ کا اندیشہ باقی رہتا ہے بنظر مزید احتیاط اب یہ علم اکنامکس کے سیدھے سادے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے"۔

یونانی لفظ کی طرح اردو زبان میں بھی اس لفظ میں مفہوم اور مقصد کے اعتبار سے بہت کچھ تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں یعنی علم انتظام مدن۔ اصول سیاسیات۔ مدن۔ علم ثروت اور اصول تونگری وغیرہ بعد ازاں اس کو علم الاقتصاد کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چنانچہ اسی نام سے ڈاکٹر سر اقبال نے ایک مختصر سا رسالہ بھی شائع کیا تھا مگر یہ لفظ جیسا کہ اسکے موضوع میں اسقدر پھیلاؤ اور مفہوم میں اسقدر وسعت پیدا ہوگئی ہو اس علم کے وسیع مفہوم کا حامل نہیں ہے۔ کیونکہ اقتصاد کے معنی دراصل میانہ روی کے ہیں پہلے اس امر کیجانب اشارہ کیا جا چکا ہے اور ظاہر ہے کہ جب اس علم کو کفایت شعاری اور منفعت طلبی سے کچھ سروکار نہیں

---

۱ دیکھو کتاب اصول معاشیات مولفہ مولوی محمد الیاس برنی پروفیسر معاشیات کلیہ جامعہ عثمانیہ صفحہ (۲۱)

تو پھر کیوں کر یہ لفظ اس علم کے حقیقی مقاصد اور اس کے اعلیٰ مبحث کی ترجمانی کرسکتا ہے لہذا بہ لحاظ ضرورت اور اس کی وسعت کے اس کو اکنامکس، علم المعیشت یا اختصاراً معاشیات کہنا ہی زیادہ موزوں ہوگا۔

یورپ کی موجودہ معاشی ترقی کو دیکھکر ایک عام خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے یورپ نے اس علم کو علم کی حیثیت سے مطالعہ کیا اور اس کی سائنٹیفک طریقہ پر توجیہہ و تشریح کرکے اس کے قوانین مدون کئے۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے اس لئے کہ ایشیا میں بھی ازمنہ قدیم میں اس کے متعلق اکثر کتب وغیرہ میں معاشی ہدایات ملتی ہیں جن میں کچھ علمی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر اس قدر ضرور ہے کہ باضابطہ علمی نقطۂ نظر سے مستقل طور پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ البتہ شیخ ابو الفضل جعفر بن علی نے ایک کتاب "الاشارۃ الی محاسن التجارۃ" تصنیف کی جو چوتھی صدی ہجری میں قابلِ قدر تصنیف تھی۔ اس کے بعد علامہ ابن خلدون نے تاریخ کے سلسلہ میں معاشی مباحث کے متعلق بحث کی ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ جرجی زیدان اور فارسی میں ابو الفضل نے فن معاشیات کے متعلق معلومات کا ایک معقول ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ غرض اس علم کے متعلق ایشیا میں بھی داغ بیل ڈالی گئی تھی اور اس موضوع پر قلم اٹھانے کی خاص کوشش کی گئی تھی جس کی تکمیل یورپ والوں نے کی۔

سب سے پہلے یورپ میں ۱۶۱۵ء میں ایک فرانسیسی مصنف مونشرٹین نے پولٹیکل اکانمی شائع کی۔ اس کتاب کو فنِ معاشیات کا سنگِ بنیاد کہا جاتا ہے۔ کم و بیش اسی زمانہ میں اٹلی میں بھی انٹونیو سرا نے ایک کتاب معاشیات کے متعلق شائع کی۔ اس کے بعد اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط میں بہت ساری کتابیں اس فن کے متعلق شائع ہونی شروع ہوئیں اور معاشیات کی علمی شان پیدا ہونے لگی۔ انگلستان میں ۱۷۶۷ء میں

سر جیمس اسٹوارٹ اور اس کے نو سال کے بعد آدم اسمتھ نے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب نے انگلستان میں بہت بڑا رسوخ اور اثر پیدا کیا۔ اسی وجہ سے اس کتاب کے مصنف کو مادر معاشیات کا خطاب دیا گیا۔ یہ کتاب انگلستان میں معاشیات کا سنگِ بنیاد تسلیم کی گئی۔ اس کے بعد خالص علمی رنگ میں جو کتاب سب سے اول ۱۸۰۳ء میں شائع ہوئی وہ ایک فرانسیسی جین بپٹسٹ سے کی تصنیف تھی۔ اس کتاب میں خوبی یہ تھی کہ اس میں بیان کی صفائی و سلاست، تسلسل مضامین اور ترتیب بیان نے خاص طور پر علمی شان پیدا کر دی۔ اسی وجہ سے اس کتاب کا ترجمہ اکثر یورپی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مذکورۂ بالا مصنفین اور معاشین ہیں جنھوں نے اس صنف میں خاصہ ذخیرہ رکھ چھوڑا ہے۔ چنانچہ اس فن کے خاص خاص مسائل کے متعلق چند مصنفین مستند اور قابلِ قدر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ریکارڈو کا مسئلہ رگان، مالتھس کا مسئلہ آبادی خاص طور پر مشہور اور مستند ہے۔

ہندوستان میں بالخصوص اُردو زبان میں اس علم کے متعلق بہت ہی کم ذخیرہ ہے کیونکہ پہلے تو ہندوستان میں اس قسم کے عُلماء اور معاشین کی کمی تھی اور دوسرے یہ کہ یہاں وہ معاشی جد و جہد کہاں جو یورپ اور امریکہ جیسے ممالک میں ہے۔ البتہ ڈاکٹر سر اقبال نے علم الاقتصاد کے نام سے اُردو میں ایک مختصر سا رسالہ شائع کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جامعہ ملیہ نے مبادئ معاشیات کے نام سے چند انگریزی کتب کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ مگر پروفیسر الیاس برنی صاحب نے اس علم کے متعلق گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ صاحبِ موصوف نے بذریعہ تراجم، تالیفات و تصانیف علمی لحاظ سے اُردو کو جس قدر مالا مال کیا ہے اس سے اُمید ہے کہ آئندہ نسلیں برابر مستفید ہوتی رہیں گی۔ ہمیں توقع ہے کہ پروفیسر صاحب ممدوح اس مفید سلسلہ کو برابر جاری رکھیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ جامعہ عثمانیہ

کے فارغ التحصیل طلبہ سے اُمید ہے کہ وہ اپنی ذہنی قابلیتوں سے اس علم میں تحقیقات کرکے نئی نئی کتابیں شائع کریں گے۔ یہ علم اس قدر وسیع اور اس میں اس قدر گنجائش موجود ہے کہ ابھی بہت سارے معاشی مسائل کو ممنون تحقیق کرکے کتابیں شائع کی جاسکتی ہیں۔ غرض یہ طلبہ کے ذوق اُن کی قابلیت اور اُن کے حوصلہ وہمت کا سوال ہے۔

الغرض ہمیں یہ امر تسلیم کرنے میں کسی قسم کا پس وپیش نہ ہوگا کہ دنیا کا پہلا انسان جب پہلے پہل دنیا میں قدم رکھا تو سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی وہ براہِ راست معاشیات ہی سے متعلق ہوگی۔ اس لئے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے معاشیات پیدا ہوئی اور جس قدر بھی دوسرے علوم وفنون پیدا ہوئے وہ انسان کی ترقی تمدن، ارتقائے تہذیب، انقلاب خیالات کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ دیگر علوم وفنون کا وجود فطری اور اصلی ضرورت کے اصول پر مبنی نہیں تھا بلکہ انسانی ارتقائے تہذیب وتمدن کا نتیجہ تھا۔ مگر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ اس فن کو پیدا ہوئے۔ بہ مشکل تین سو برس ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے کہ اسکا سائنٹیفک مطالعہ شروع ہوکر کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا یہی وجہ ہے کہ معاشیات نے بہت تھوڑی عمر پائی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ گزشتہ زمانہ کے معاشی معلومات سے انکار کیا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں معاشی معلومات کسی نہ کسی طرح موجود تھے۔ چنانچہ یہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ "مزدور خوشدل کند کار بیش"۔ اس کے علاوہ ان معلومات کی جھلک شاعری میں بھی نظر آتی ہے جیسے "لعل قیمت کو پہونچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر" اگرچہ بظاہر یہ شاعری معلوم ہوتی ہے مگر غور کیا جائے تو اس میں معاشیات کے زبردست اصول

پوشیدہ ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ فن اسقدر اہم اور ضروری اور انسان کی زندگی سے اسقدر متعلق ہونے کے باوجود کیوں اس کو وجود میں آنے میں دیر لگی۔ یہ ایک نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان اُس چیز سے زیادہ تر ناواقف رہتا ہے جو اُس کے قریب تر ہو۔ ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو انگلستان کے دستور سے آگاہ، امریکہ کی طرز حکومت سے واقف، اٹلی کی مطلق العنانی اور آمریت سے باخبر، غرض ہر اُس شے اور ہر اُس ملک سے ہم بخوبی واقف ہیں جن کا ہم سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں مگر خود اپنے گھر کے نظم و نسق اور اُس کی تنظیم و انتظام سے بے خبر ہیں۔ اس کو دیکھئے کہ ایک انسان موجودات عالم کے ذرہ ذرہ پر بحث کرسکتا ہے اس کی ترکیب و ترتیب کا علم رکھتا ہے۔ اگر اُس سے یہ سوال ہو کہ وہ خود کیا ہے تو یقیناً کوئی معقول اور تشفی بخش جواب نہیں دے سکتا۔ وجہ یہی ہے کہ اکثر و بیشتر انسان اپنی قرب و نواح کی چیزوں سے ناواقف رہتا ہے۔ اس لئے معاشیات نے باوجود اہم اور ضروری ہونے کے اس قدر تھوڑی عمر پائی ہے۔

معاشی مباحث کی پیچیدگی اور اس کی وسعت معلوم کرنے کے لئے یہ امر پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ انسان کا مطالعہ ہے، اشیا کا مطالعہ نہیں اگرچہ اسمیں اشیا سے بھی بحث کیجاتی ہے مگر اشیا مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ اس کا نفس مضمون انسان کی اجتماعی زندگی اور اس کے مختلف معاشی پہلو کو واضح کرنا ہے۔ جو احتیاجات کہ انسان میں پیدا ہوتی ہیں اُن کے پورا کرنے کے ذرائع اور وسائل معلوم کرنا۔ اس کے تنوع اور اختلافات کا بھی عجیب حال ہے۔ معاشی مصنفین میں اس کے مسائل پر زمانہ دراز سے نزاع چلی آرہی ہے۔ کوئی اس کا موضوع احتیاجات انسانی بتاتا ہے اور کوئی اس کو علم دولت کہتا ہے۔ بہرحال اب تو اس کے نفس مضمون پر اتفاق رائے ہوگیا ہے۔ یہ ظاہر کیا جاچکا ہے کہ معاشیات انسان سے بحیثیت ایک فرد جماعت کے

بحث کرتا ہے اور انسانی جماعت عبارت ہے مہذب و متمدن گروہ سے۔ اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانی تہذیب لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے اور اس میں اسقدر پیچک اور پیچیدگی ہے کہ کوئی قطعیت کی راہ اختیار کرنی محال ہے کیونکہ انسان کا خیال ہر وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے اور اس انقلاب خیالات کا یہ اثر ہے کہ کل کی معاشرت آج باقی نہیں رہ سکتی اور آج کی تہذیب و تمدن کا کل موجود رہنا مشکل ہے۔ دنیا کا یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ زمانہ کبھی بھی سکون کی حالت میں نہیں رہ سکتا۔ ہر وقت ترقی پر ترقی، تبدیلی پر تبدیلی اور انقلاب پر انقلاب ہوتا رہتا ہے اور گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تغیر و انقلاب کا پیکر ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ معاشیات میں کوئی قطعیت پیدا کی جا سکے اور اس کے حدود معین کئے جا سکیں۔ یہ نہ دو اور دو چار کا سوال ہے اور نہ اس کے مطالعہ کیلئے کوئی معمل یا کوئی تجربہ خانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد تو انسان کے تموج خیز اور تلاطم انگیز حالات و واقعات پر ہے۔ اور معاشیات کو تو رفتار زمانہ کی ہوا کے ساتھ ساتھ چلنا ناگزیر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فن انسانوں کی جماعت اور ان کی مجموعی زندگی سے متعلق ضرور ہے مگر ہر ملک کے انسانوں کا طور و طریق جدا، معاشرت الگ، تہذیب و تمدن مختلف تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کے اصول و قوانین دنیا کے کل انسانوں پر صادق آسکیں۔ اسی لئے ایک معاشی نے اس تنوع اور اختلافات کو دیکھ کر کہدیا تھا کہ انگلستان کے معاشی اصول دیگر ممالک پر کبھی منطبق نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہر معاشی مصنف لازمی طور پر چند مفروضات قائم کرلیتا ہے جس پر اُس کتاب کی بنیاد ہوتی ہے اور ان ہی مفروضات پر سارے معاشی مسائل کی عمارت کھڑی کردیتا ہے جب ہم معاشیات کی کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو مختلف امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ مصنف نے معاشیات کا موضوع کیا قرار دیا ہے۔ اس کا زاویۂ

نگاہ کیا ہے۔ نوعیت بحث کیا ہے کیونکہ تاوقتیکہ ہم ان امور سے واقف نہ ہوں ہمارا مطالعہ ادھورا اور نامکمل رہتا ہے اور یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس میں کن کن علوم سے کس حد تک مدد لی گئی ہے۔ غرض مطالعہ کے وقت ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جہاں تک معاشی اصول کا تعلق ہے اس میں کچھ عمومیت بھی ہے یا نہیں۔ یقیناً چند اساسی مسائل ایسے بھی ہیں جو اپنی عمومیت کے لحاظ سے ساری دنیا پر حاوی ہیں۔ کیونکہ ایسے بنیادی اصول تو ہر ملک اور ہر جگہ یکساں طریقہ پر منطبق ہو سکتے ہیں جیسے مسئلہ لگان، قانون تقلیل حاصل، عاملین پیدائش، اضتیاجات اور ان کی نوعیت وغیرہ یہ ایسے مسائل ہیں جو ہر جگہ منطبق ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصول کو منطبق کرنے میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے بظاہر اصول غلط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر اس سے اصول میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ اس اصول کو منطبق کرنے میں ہر ملک کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ جہاں تک حیثیت نوعی کا تعلق ہے معاشیات کے عام اصول ساری دنیا پر یکساں حاوی ہیں۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ اصول میں معیاری رنگ غالب ہوتا ہے اور ان اصول کو منطبق کرنے میں ایجابی عنصر زیادہ شامل ہوتا ہے۔

الحاصل اس سے واضح ہوگیا کہ معاشیات کی علمی وسعت کس قدر ہے اور اس کے حدود کس قدر وسیع ہیں۔ اس کی وسعت وہی معلوم کر سکتا ہے جو اس کی تحقیقات کرنے کا تہیہ کرے۔ لب ساحل کھڑے ہونے والے کو کیا معلوم کہ اس سمندر میں کس قدر گہرائی ہے اس کی وسعت نظر اس سے آگے بڑھ نہیں سکتی جہاں اُفق اس سمندر سے

جاملتی ہے۔ اس کی وسعت کو وہی پاسکتا ہے جو اپنی تحقیق کی کشتی کو اس سمندر میں ڈالدے
اس کے بعد اب ہم معاشیات کی عملی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے۔

معاشیات کے دو پہلو۔ پہلے اس امر کیجانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ معاشیات کی تصویر
کے دو رخ ہیں اس کا پہلا رُخ تو اصولی ہے جس کو معیاری کہہ سکتے ہیں اس کا دوسرا رخ عملی یا
ایجابی ہے۔ جہانتک کہ معیار اور اصول کا تعلق ہے یہ دکھایا جاتا ہے کہ کیا ہونا چاہئے اور عملی اعتبار سے
یہ بتلایا جاتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہاں چونکہ ہمیں اس کی عملی اہمیت دکھانی مقصود ہے اسلئے اسکی
تصویر کے پہلے رخ پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اس سے پہلے ہم نے اس کی
اصولی حیثیت بخوبی واضح کردی ہے۔

اس کی عملی اہمیت دکھانے سے پیشتر چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں ایک
تو یہ کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے اس علم کا عملی پہلو اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرے
یہ کہ انسانی زندگی سے اس کا تعلق کس حد تک ہے اور اس کا اثر انسانی زندگی پر کیا پڑتا
ہے۔ ان امور پر اگر روشنی ڈالی جائے تو خود بخود اس علم کی عملی اہمیت ظاہر
ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس علم کے نفس مضمون ہی میں دراصل اُسکی اہمیت مضمر ہے۔
چونکہ اس کا موضوع خود انسان اور اس کی معاشی جدوجہد ہے اس لحاظ سے اس کی عملی
تصویر کا رخ بہت زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع
واقع ہوا ہے۔ یہ چیز اس کی جبلت میں داخل ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے مل جل
کر رہے اور باہمی تعلقات پیدا کرکے اپنی زندگی کی بنیاد کو تمدن پر قائم کرے اگر ہم
دنیا کی کل آبادی کو پیش نظر رکھیں اور اس کی زندگی پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ فیصدی
پانچ نفوس بھی ایسے نہ مل سکیں گے جنہیں تمدنی زندگی مرغوب نہ ہو۔ اور واقعہ یہ ہے

کہ انسان تمدنی زندگی بسر کرنے پر کچھ اس طرح مجبور کیا گیا ہے کہ آپس میں مل جل کر رہنا اس کیلئے لازمی اور ناگزیر ہوگیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیوں مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔ آیا اس کا یہ میل ملاپ خود ساختہ ہے یا فطرت کا منشاء ہی ایسا ہے کہ وہ اپنے ہمجنسوں سے تعلقات قایم رکھکر اپنی زندگی بسر کرے۔ اگر ہم غور کریں تو اس نتیجہ پر بہ آسانی پہونچ سکتے ہیں کہ تمدنی زندگی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ وہ اپنے ہمجنسوں سے علحدہ رہکر زندگی نہیں گزار سکتا چنانچہ مشہور مقولہ ہے۔

کند ہمجنس باہمجنس پرواز کبوتر با کبوتر باز با باز

جب حیوانوں تک میں مل جل کر رہنے کی عادت ہے تو انسان جو اشرف المخلوقات ہے یہ صفت اس میں بدرجہ اتم ہونی چاہئے اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو دوسرے حیوانوں سے اسکی برتری کی بڑی وجہ یہی ہے۔ اسی سے اسکی قوت ہے اور یہی اس کی غیر معمولی طاقت کا سبب ہے۔ ورنہ بحیثیت فرد کے وہ کسی معمولی جانور سے بھی مقابلہ کی قوت نہیں رکھتا اور نہ جسمانی اعتبار سے اس کو کسی قسم کی فوقیت حاصل ہے۔ اسی لئے اس کا متمدن ہوکر رہنا ضروری ہے اور یہی تمدنی زندگی معاشیات کا مطمح نظر ہے اور یہی اسکی عملی اہمیت کا آئینہ ہے۔

موجودہ علوم وفنون میں شاید ہی کوئی ایسا علم ہوگا جو براہ راست انسانی زندگی پر اسقدر زبردست اثر ڈالتا ہو جیسا کہ معاشیات۔ کیونکہ ایک طرف تو انسان کی احتیاجات ہیں اور دوسری جانب دولت کی ایک کثیر مقدار ہے جس سے یہ احتیاجات وابستہ ہیں چند تارک الدنیا لوگوں کو خارج کرنیکے بعد دنیا کے کون سے گوشہ میں ایسے انسانوں کی آبادی موجود ہے جنمیں احتیاجات محسوس نہیں ہوتیں اور جو دولت سے بے نیاز اور مستغنی ہیں۔ انسانوں کی یہ لاتعداد احتیاجات اور بے شمار ضروریات آخر کن چیزوں سے پوری ہوتی ہیں معاشی اصطلاح میں یہی تو وہ دولت ہے جسمیں انسان نہایت بری طرح جکڑا ہوا ہے

اور اسی پر اسکی موت وزیست کا انحصار ہے اور اسی سے اسکی جد وجہد اور زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ غرض اس کے جتنے مسائل، مباحث، مسلمات اور جزئیات وغیرہ ہیں وہ ہر ایک بجائے خود اسقدر اہم ہے کہ اس سے انسانی زندگی کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔

معاشیات میں مقصد کے اعتبار سے اصول اور عمل فی نفسہ کوئی علٰحدہ علٰحدہ شئے نہیں ہیں۔ اس لئے کہ مدعا دونوں کا ایک ہی ہے یعنی یہ کہ انسان کی معاشی جد وجہد کی توجیہ اور تشریح کرکے ایک اس کو مختلف حالات کے لحاظ سے کسی ملک پر منطبق کرنا اور اس سے نتائج کا استنباط کرنا اسکی ایک اہم غرض ہے۔ چونکہ انسان کی ابتدائی زندگی بالکل سادہ تھی اسلئے قدیم زمانہ میں نہ یہ علم پیدا ہوا اور نہ بہ حیثیت فن کے اس کی طرف کوئی توجہ کیگئی۔ مگر جب انسان تمدن کے ارتقائی منازل طے کرنے لگا تو سہولت اور آسانی کی خاطر اس کا دو حیثیتوں سے مطالعہ کرنا پڑا اصول معاشیات جس کو معاشیات مطلق بھی کہتے ہیں ایک الگ چیز قرار پائی اور اسکے ذریعہ سے اسکے مسائل کو انسانوں اور ملکوں پر منطبق کرنے میں اس کی ایک علٰحدہ علمی حیثیت پیدا ہوگئی۔

معاشیات مطلق میں جب اصول کا عملی اعتبار سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان مسائل کی سائنٹفک طریقہ پر توجیہ کیجاتی ہے تو ہمارے پیش نظر کوئی خاص ملک یا کسی خاص انسانی گروہ کے حالات، عادات واطوار، تہذیب وتمدن، معاشرت اور اونکی ذہنیت نہیں ہوا کرتی بلکہ اصول میں بلحاظ عمومیت کل دنیا کے ممالک اور انسان پیش نظر رہتے ہیں۔ معاشیات مطلق میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ امریکہ کا انسان اپنی بھوک کیونکر رفع کرتا ہے یا افریقہ کا حبشی اپنی بھوک کی احتیاج کو کن اشیاء سے پورا کرتا ہے اس میں تو صرف اس امر سے بحث ہوتی ہے کہ ہر انسان کو بھوک کی احتیاج محسوس ہوتی ہے اور یہ صفت دنیا کے کل انسانوں میں مشترک طور پر موجود ہے۔ اس کو اس امر سے کوئی مطلب نہیں کہ کوئی شخص

جوار سے اپنا پیٹ بھرتا ہے کوئی چاول کھاکر اپنا پیٹ پالتا ہے کسی کی مرغوب غذا سبزی ترکاری ہے اور کس کے نزدیک جانورون کا گوشت اسکی لذیذ غذا ہے۔ مگر جب ہم کسی ملک کی معاشی حالت کا اندازہ کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ تو انہیں اصول کو اس پر منطبق کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ تا وقتیکہ ہم اصول اور قوانین سے بخوبی آگاہ نہ ہون کسی ملک کی معاشی حالت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ قائم نہیں کر سکتے اور نہ کسی ایسے نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں جس سے ملک کی حقیقی معاشی حالت کا اندازہ ہو سکے۔

زر اور اس کی اہمیت

اس سے قبل یہ بیان کیا گیا ہے کہ معاشیات کو علم دولت بھی کہا جاتا ہے اگر علم دولت کے مفہوم سے عوام کی غلط فہمیون کو خارج کر دیا جائے تو واقعاً یہ علم علم دولت ہی ہے۔ یہان ہم اسکی جزئیات اور تفصیلات کو نظر انداز کر کے صرف زر کی اہمیت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ معاشیات کے عملی پہلو میں یہی وہ چیز ہے جو ساری دنیا کے لئے مرکز توجہ بنی ہوئی ہے اور دنیا نے ابتک معاشرتی، تمدنی، اور معاشی ترقی کے جو منازل و مراحل طے کئے ہیں وہ سب صرف اسی زر کی بدولت ہیں واقعہ یہ ہے کہ سائنس نے اپنی ایجادات و اختراعات کے ذریعہ سے جو اثر انسان کی متمدن زندگی پر چھوڑا ہے اس سے کہیں بڑھکر زر کی ایجاد نے انسان کی ترقی میں مدد دی ہے۔ اب بھی اگر سائنس کی ساری ایجادات کو برقرار رکھکر زر کی قوت کو سلب کر لیا جائے یا اسکو معدوم اور ناپید اکر دیا جائے تو با وجود ان اختراعات کی موجودگی کے انسانی تمدن کئی صدی پیچھے ہٹ جائیگا اور دنیا کی یہ ساری ترقیان پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائینگی۔ انسانی تمدن کا برقرار رہنا نہ صرف محال بلکہ ناممکن ثابت ہوگا کیونکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ انسانی ترقی کا دار و مدار بالکل اس کی ایجاد پر ہے۔ معاشرت و تہذیب بھی اسی بنیاد پر کھڑی ہوئی دکھائی دیگی۔ اس میں

شبہ نہیں ہے کہ سائنس کی ایجادات نے تو سارا عالم حیرہ کر دیا ہے اور اسکے انکشافات چشم حیرت کو کھلا رکھنے کیلئے کافی ہیں لیکن زر کی ایجاد انسانی دماغ کا وہ معجزہ ہے جس نے کل ایجادات کو ممکن بنا دیا۔ اسی لئے معاشیات میں نہ صرف علمی بلکہ عملی لحاظ سے بھی اسکی اہمیت خاص طور پر قابل التفات و جاذب توجہ بنگئی ہے۔ اگرچہ علمی اعتبار سے وہ مبادلہ دولت کے ضمن میں ایک ذیلی چیز ہے مگر اس کی عملی حیثیت کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیجاسکتی۔ اور چونکہ اس کی اہمیت ایک عالمگیر پہلو لئے ہوئے ہے اور معاشیات میں اس کا مطالعہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے اور موجودہ زمانہ میں اس کا مسئلہ سارے عالم کیلئے مرکز توجہ بنگیا ہے اور بہترین دماغ اسکی گتھی کو سلجھانے میں مصروف و مشغول ہیں اسلئے ہم بھی معاشیات کے دیگر مسائل کو نظرانداز کرکے زر کے مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالنی مناسب سمجھتے ہیں۔ اسلئے فی الحال وہ سب امور ہماری بحث سے خارج ہیں جو خاصکر علمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے صرف اس کی عملی اہمیت دکھانی مقصود ہے تاکہ اسکی اہمیت کا کچھ سرسری اندازہ قایم کیا جاسکے۔

زر کس قدر پیارا لفظ ہے، کتنی ہر دلعزیز شے ہے، اس کی حقیقت کس قدر دلخوش کن ہے عوام کے نزدیک اس کی اصلیت کتنی جاذب توجہ ہے۔ سارے عالم کا تمدن، تہذیب اور معاشرت سب اسی محور پر گھوم رہی ہے اس کی دوستی انسان کو بلند سے بلند مرتبہ پر پہونچادے سکتی ہے اور پھر اسی کی دشمنی اس کو افلاس اور نکبت کے عمیق ترین غار میں گرادے سکتی ہے۔ فساد کی جڑ بھی یہی خوبیوں کا منبع بھی یہی ہے۔ دیوانہ بھی اسکی محبت میں گرفتار ہے اور سیانا بھی اسکی سحر آفرینیوں پر مفتون ہے۔ دنیا کے کسی شخص کو لیجئے اور کسی مرتبہ کے آدمی کو تلاش کیجئے اس کے حصول کیلئے حیران و سرگردان نظر آئیگا۔ عزت کا معیار بھی یہی ہے ذلت کی کسوٹی بھی یہی ہے۔ اسکے متعلق کسی نے یہانتک کہدیا۔ ع

اے زر تو خدائی ولیکن بخدا ستار العیوب وقاضی الحاجاتی

اور بعضوں کے نزدیک یہ جان سے بھی زیادہ پیارا ہے چنانچہ ایک شاعر نے زر کی نسبت یہ خیال ظاہر کیا ہے ۔ ع

گر جان طلبی مضایقہ نیست گر زر طلبی سخن درین است

بہت ممکن ہے کہ زر کی حقیقت بیان کرنے میں لوگوں کو مبالغہ نظر آئے اور ممکن ہے کہ اس کو لوگ ادیبانہ افسونگری یا شاعرانہ تخیل سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے ناقابل تردید اصلیت ہے ہمارا روزمرہ مشاہدہ بھی اس کی تصدیق کر سکتا ہے زر کی یہ خصوصیت بھی عجیب و غریب ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بیکار اگر کوئی شے ہو سکتی ہے تو وہ یہی زر ہے ۔ انسانوں کو اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے ۔ ہمیں فی نفسہٖ زر مطلوب نہیں ہے اسلیئے کہ ہماری کوئی احتیاج اس سے براہ راست رفع نہیں ہو سکتی ۔ روپیہ کو انسان کھا نہیں سکتا ، پی نہیں سکتا ، پہن نہیں سکتا غرض کوئی احتیاج اور کوئی ضرورت اس سے پوری نہیں ہوتی ۔ اگر ایک شخص کو شدت کی پیاس ہو رہی ہو اور اسکی وجہ سے وہ جان بلب ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں اس کے سامنے سکوں کی بڑی سی بڑی ڈھیر بھی لگا دیجائے تو وہ اس بھاری رقم کو ایک قطرۂ آب کے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہے ۔ اگر ایک آدمی بھوک سے بیتاب ہو رہا ہو اس کے نزدیک زر کی ایک کثیر مقدار بھی ایک دانۂ خوراک کا مقابلہ نہیں کر سکتی تعجب ہے کہ انسان ایسی بیکار شے کے پیچھے اپنی جان کھپائے اور اسکو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھے ۔ آخر غور کرنا چاہیئے کہ آیا یہ محض ایک عالمگیر دیوانگی ہے یا انسان کا یہ جنون حق بجانب ہے اور سوچنا چاہیئے کہ اس میں کیا راز پوشیدہ ہے کہ جس کے پیچھے سارا عالم دیوانہ ہو رہا ہے ۔ لیکن زر کی تصویر کا یہ نہایت ہی تاریک رخ ہے جس طرح زر بظاہر بیکار شے معلوم ہوتی ہے اس سے کہیں

زیادہ کارآمد اور اہم ہے کیونکہ اسی سے زندگی سنورتی ہے معیار زندگی قائم رہتا ہے اسی سے انسان کی احتیاجات بالواسطہ پوری ہوتی ہیں۔ یہی زر مبادلہ دولت میں آلۂ مبادلہ کا کام دیتا ہے۔ یہی انسانی احتیاجات کے مابین اور باہمی مبادلہ کے درمیان ثالث کا کام انجام دیتا ہے اور یہی انسانوں کی باہمی ضروریات کے جھگڑوں کا ناقابل اپیل فیصلہ کرتا ہے۔ اس کا فیصلہ قطعی اور اٹل ہے اگر ہم معاشی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ معاشیات کی تاریخ میں یقیناً ایک دور ایسا گزر چکا ہے کہ اشیا کا تبادلہ اشیا سے کیا جاتا تھا کیونکہ اس زمانہ کے لوگوں کی ضروریات محدود اور انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں مگر موجودہ زمانہ میں احتیاجات اور اسکی نوعیت اس درجہ بدلگئی ہے اور انکی تعداد میں اسقدر اضافہ ہوگیا ہے کے اشیاء کا تبادلہ اشیاء سے ناممکن ہوگیا اور ضروریات میں اسقدر تنوع پیدا ہوگیا کہ مبادلہ کے لئے زر کی ایجاد لازمی اور ناگزیر ہوگئی۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کے پاس سواری موجود ہے اس کو کھانے کیلئے چاول کی ضرورت ہے۔ اور ایک ایسے شخص کے پاس چاول اور اشیاء مایحتاج موجود ہیں۔ سواری والا شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ بھائی میرے لئے چاول دیدو اسکے معاوضہ میں میں تمھیں اپنی سواری میں لیجاؤنگا حالانکہ شخص ثانی الذکر کو سواری میں بیٹھکر کہیں جانے کی ضرورت نہ ہو تو ان حالات میں دونوں کی باہمی ضروریات کا کیونکر تصفیہ ہو اور ان کا قصہ کون چکائے اور کسطرح یہ دونوں ایک دوسرے سے باہمی مبادلہ کر سکیں۔ اور جب ہر ایک ضرورت کا یہی حال ہو تو زندگی کسقدر مشکل پیچیدہ اور اجیرن معلوم ہوگی اور انسانی زندگی ایک ناقابل برداشت مصیبت دکھلائی دیگی حقیقت یہ ہے کہ زر نے ہی انسانی زندگی کو ممکن بنا دیا۔

آج کل زر کا مسئلہ نہایت عالمگیر اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ وہ زمانہ گزر گیا جبکہ تلوار کو سلطنتوں اور قوموں کی طاقت و قوت کا معیار سمجھا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانہ میں ہر قسم کی

وقوت کا اظہار صرف زر پر رہگیا ہے گویا زور پر زر غالب آگیا ہے اور زر ہی حقیقت میں زور بنگیا ہے اور زر ہی کسی ملک کی غیر معمولی قوت کا موجب ہوسکتا ہے جس ملک کی مالی حالت کمزور ہو اسکی معاشی زندگی کے دن قطعاً گنے جا چکے ہیں۔ امریکہ کو ساری دنیا پر جو فوقیت حاصل ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اسکی مالی حالت دنیا کے سارے ممالک کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی ہے۔ انگلستان اسی لئے طاقتور ملک ہے کہ وہ دولتمند ہے۔ فرانس، اٹلی، جاپان، جرمنی وغیرہ ممالک کی ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے مگر آہ! ہندوستان تو کسقدر مفلس ہے تیری دولت کے تاریخی واقعات آج افسانوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تیری دولت کے قصے قصۂ پارینہ بنگئے۔ تیری دولتمندی صرف خواب بنکر رہگئی ہے۔ تیرا طرۂ امتیاز تجھ سے چھن گیا۔ آج تو مفلس نظر آرہا ہے۔ تو کبھی خبت نشان کے رشک کن لقب سے ممتاز تھا اب تیری حالت پر غریبی آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ تیرے بیس کروڑ بچے تیری قدرتی دولت سے محروم ہیں۔ تیرے سارے وسائل معاش غیروں کیلئے وقف ہیں مگر تیری زمین پر چلنے والے تیری گود میں پلنے والے تہیدست وتہی دامن پھر رہے ہیں اگر کسی قوم یا ملک کو اس دنیا میں زندگی کی سانس لینی ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ معاشی مسائل اور خصوصاً زر کی جانب اپنی توجہ صرف کردے ورنہ اس کا زندہ رہنا غیر یقینی ہے۔ جدہر نظر اٹھاکر دیکھو اسی کی قوت کارفرما نظر آئیگی اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں یہ جو ہلچل اور چہل پہل نظر آرہی ہے یہ سب حضرت زر کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں زر کا مسئلہ اسقدر پیچیدہ نازک اور اہم ہے کہ اگر اس کو سمجھنا چاہیں اور اسکے مختلف شعبہ جات کا مطالعہ کرنا چاہیں تو اس کیلئے ہماری موجودہ عمر بھی ناکافی ہے۔ اسکی ذرا ذرا سی تبدیلی تمدن کے عروج وزوال کا باعث ہوسکتی ہے۔ حالیہ جنگ میں جرمنی کی شکست کی بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جرمنی کے (MARK) کی قیمت گرگئی تھی اور اسکی ساکھ

درجہ صفر سے بھی گھٹ گئی تھی جسکی وجہ سے اس کا مالی توازن قایم نہ رہ سکا اور اوس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ زر ایک ایسی زنجیر ہے جو مختلف ملکوں اور قوموں کو باہم لپیٹتی اور ملاتی ہے اسی سے زر کا مسئلہ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے اور سکہ کی آزادی کو ملک و قوم کی آزادی کے مرادف سمجھا جاتا ہے جس ملک کا سکہ اپنا نہ ہو اس کی آزادی معرض خطر میں ہے اور وہ معاشی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالے ہوئے ہے۔ غرض موجودہ دور ترقی میں اسی کا زبردست ہاتھ کام کر رہا ہے اور بنک کی اہمیت تو اسدرجہ بڑھی ہوئی ہے کہ بڑے بڑے ماہرین معاشیات اسکے مسائل پر متعدد ضخیم سی ضخیم کتابیں لکھ چکے ہیں حقیقت میں بنک کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے انسان کے جسم میں دل کی ہوا کرتی ہے۔ جہاں اسکی حرکت بند ہوگئی اس ملک پر معاشی موت کا طاری ہوجانا یقینی ہے۔ اسلئے مغربی ممالک میں بنک کا رواج نہایت عام ہوگیا ہے اور اس میں یہانتک ترقی ہوئی ہے کہ کوئی کاروبار بغیر بنک کے چل نہیں سکتا۔ اور کل معاشی معاملات اسی مرکز پر گھوم رہے ہیں اگرچہ ہندوستان میں بنک کا طریقہ رواج پا رہا ہے مگر یہاں اسکی حالت ابھی ابتدائی ہے۔ توقع ہے کہ مستقبل میں اس طریقہ کو عمومیت حاصل ہوجائیگی۔

زر کے بھی مختلف دور اور زمانے گزر چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ کوڑیاں اور اور ایسی قسم کی دوسری چیزیں زر میں شامل تھیں۔ جوں جوں انسانی تہذیب نے آگے قدم بڑھایا اس میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہیں ایک زمانہ میں زر کو سونا چاندی کی شکل میں محفوظ رکھا جاتا تھا اور اس کی اشیاء کی حفاظت کیلئے زمین میں دفن کیا جاتا تھا۔ اسی لئے بعض معاشیین نے ہندوستان کے اصل کو شرمیلا کہا ہے۔ اس زمانہ میں سود کا الٹا منقلب طریقہ رائج تھا یعنی لوگ اپنی دولت کو کسی کے پاس محفوظ رکھنا چاہتے تھے تو اس حفاظت کے عوض انھیں کچھ معاوضہ دینا پڑتا تھا۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ ملک میں کوئی

باقاعدہ مرکزی گورنمنٹ موجود نہ تھی امن وامان کا فقدان تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں ہر جگہ امن اور آزادی حاصل ہے۔ لوگ نہایت آزادی کے ساتھ کاروبار اور معاملات کرسکتے ہیں۔ اسلئے اصل کے استعمال کے معاوضہ میں شرح سود لینے کا آغاز ہوا اور آج کل تو بلحاظ اہمیت سود ایک اہم مسئلہ بنگیا ہے۔

تقسیم دولت کی اہمیت معاشیات کے مباحث بالعموم چار قسموں میں تقسیم کئے جاتے ہیں پیدائش دولت یا تو پیدا کیجاتی ہے یا صرف کیجاتی ہے یا اس کی تقسیم ہوتی ہے یا اس کا استبدال کیا جاتا ہے۔ معاشیات کے کل مسائل ان چار مباحث میں سے کسی نہ کسی بحث میں آجاتے ہیں اسلئے معاشیات کا کوئی مسئلہ ان مباحث سے خارج نہیں ہے یوں تو ہر ایک مبحث فی نفسہ بہت اہم ہے لیکن تقسیم دولت کا مسئلہ موجودہ زمانہ میں اسقدر اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا کے سیاسی مسئلوں میں عظیم الشان انقلابات ہو رہے ہیں پیدائش دولت پر جھگڑا نہیں ہے کیونکہ وہ ہر زمانہ میں متفقہ کوششوں سے پیدا ہوتی رہی ہے۔ صرف دولت پر مناقشہ نہیں ہے کیونکہ جو شخص جس حد تک دولت پیدا کرسکتا ہے اس کو صرف کرنے کا اختیار اسکو ہر طرح حاصل ہے۔ مبادلۂ دولت کا مسئلہ بھی کچھ ایسا مابہ النزاع نہیں ہے لیکن تقسیم دولت کا مسئلہ ہی ایسا پیچیدہ ہے کہ جس کی وجہ سے ساری دنیا میں ایک ہلچل برپا ہے اور سارا عالم اس سے تہ وبالا ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت نے ساری دنیا کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ معمولی فہم وادراک کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب چند آدمی متفقہ کوشش سے دولت پیدا کرتے ہیں اور اپنے اشتراک عمل سے اس میں بہت کچھ اضافہ کرتے ہیں لیکن جب اس طرح پیدا شدہ دولت کی تقسیم کی نوبت آتی ہے تو ان کی نگاہیں کس طرح بدل جاتی ہیں اور ہر شخص خود غرضی کی بنا پر اپنی روٹی پر دال کھینچنے کی فکر کرتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں

زبردست آویزش شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ چوروں کا گروہ بھی جب چوری کا مال جمع کرتا ہے تو ان میں اتحاد عمل باقی رہتا ہے مگر جونہی تقسیم کی نوبت آتی ہے تو انکی یہ افراتفری انہیں پولیس کے زبردست چنگل میں پھنسا دیتی ہے۔ غرض تقسیم دولت کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے جو انسانوں کیلئے معیار اخلاق بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ تقسیم دولت کے کون کون مستحق قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اصولی اعتبار سے دولت انہیں پر تقسیم ہونی چاہئے جو اسکی پیدائش میں حصہ لیتے ہیں۔ معاشیات کا ہر متعلم اس سے بخوبی واقف ہے کہ پیدائش دولت کے چار عاملین ہیں۔ یعنی زمین محنت اصل اور تنظیم اور مجموعی حیثیت سے پیدائش دولت میں صرف انہیں چار عاملین کا حصہ ہے اور جہاں تک معاشی لحاظ سے پیدائش دولت کا تعلق ہے دنیا میں یا تو زمیندار کا طبقہ ہے یا مزدور پیشہ لوگ ہیں یا سرمایہ دار ہیں جنہیں اصلدار بھی کہا جاتا ہے یا آجروں کی جماعت ہے جن کے ذمہ تنظیم کا کام سپرد ہوتا ہے۔ اگر دنیا کی آبادی کو پیدائش دولت کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو انہیں چار طبقوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس امر کا فیصلہ کہ پیدائش دولت میں ہر ایک کا حصہ کسقدر ہونا چاہئے نہایت مشکل اور اہم ہے۔ یہی معرکتہ الآراء اور مابہ النزاع مسئلہ ہے جس پر ابتک دنیا کسی صحیح اور اصولی نتیجہ پر نہ پہونچ سکی اور دنیا کے بہترین معاشی اور سیاسی دماغ اس کی پیچیدگیوں کو صاف کرنے اسکی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہیں لیکن کوئی مطمئن فیصلہ نہ کر سکے۔ اور چونکہ یہ دور معاشی ترقی کا دور کہلاتا ہے اور پیدائش دولت کے اعتبار سے دنیا کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے اور اس مسئلہ پر خود انسانی زندگی اور اسکے معیار کا انحصار ہے اسلئے ساری دنیا کی سیاست بھی معاشیات کی انگلیوں پر کٹھ پتلی کی مانند ناچتی ہوئی نظر آتی ہے اور اسی معاشی مسئلہ نے سیاسیات کو اس طرح اپنی بغل میں دابا ہے کہ ذرا ذرا سی معاشی تبدیلیاں

سیاسی مسلکوں میں تبدیلی وانقلابات کا باعث بنجاتی ہیں اور جسکی وجہ سے دنیا کی سیاسیات پر معاشیات کا غلاف چڑھا ہوا دکھائی دیتا ہے اور معاشیات کا رنگ سیاسیات پر کچھ اس طرح چھا گیا ہے کہ سیاسیات کے اصلی خد و خال نظر آنے مشکل ہو گئے ہیں۔ اور ہر سیاسی مسئلہ ایک زبردست معاشی مسئلہ بنا ہوا ہے اور موجودہ دور میں معاشیات اور سیاسیات کچھ اس طرح مخلوط ہو گئے ہیں۔ کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔

انفرادیت۔ اشتراکیت۔ اشتماریت بالشویزم اور سرمایہ داری یہ چند سیاسی مسلک ہیں جو موجودہ معاشی دور کی پیداوار ہیں۔ عاملین پیدایش دولت میں سے زمین یا طبقۂ زمینداران کو چھوڑ دیجئے کیونکہ زمین جس کا معاوضہ لگان کہلاتا ہے وہ بہت کچھ قوانین قدرت کا پابند ہے اور اس میں تقلیل حاصل کا اصول کام کرتا ہے کیونکہ لگان کا زیادہ تر انحصار انسان کی کوششوں اور اسکے قوت بازو پر نہیں بلکہ بیشتر عطیہ قدرت پر ہے۔ اس لئے زمیندار اسی قدر معاوضہ لے سکتا ہے جس قدر کہ قدرت اس کو دے سکتی ہے۔ لیکن اصل کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے اور یہ قانون تکثیر حاصل کا پابند ہے اور اس میں انسانی کوششوں کو خاص طور پر دخل ہے اس میں جسقدر چاہے اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ محنت اور اصل کی متفقہ کوشش پیدایش دولت کو۔ انی سے پر بیت نبا سکتی ہے اور اسی طرح اعلیٰ تنظیم کی مدد سے دولت کثیر سے کثیر مقدار میں پیدا کیجا سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس پیدا شدہ دولت میں اصل کا معاوضہ کیا ہو محنت کی اجرت کیا قرار دیجائے معاوضہ تنظیم کسقدر رکھا جائے۔ یہی وہ سوالات ہیں جن کا تشفی بخش جواب دینے سے دنیا عاجز نظر آرہی ہے اور یہی سوال اعلیٰ سے اعلیٰ سیاسی مدبرین کو پریشان کر رہا ہے۔ سیاسیات اسی محور پر چکر کھا رہی ہے اور یہی سوال

خواب متوحش بنکر دنیا کو ستا رہا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ملک بھی ایسا موجود ہے جو باوجود اسقدر سیاسی اور معاشی ترقی کے چین و آرام کی سانس لیتا ہو۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری یا اشتمالیت اور استعماریت یہ ایسے زبردست مسلک ہیں جن میں سخت ترین تصادم ہو رہا ہے ان دونوں میں زبردست ٹکر ہو رہی ہے جس کی وجہ سے دنیا ایک ہولناک بھنور میں غلطان ہو رہی ہے۔ سرمایہ دار اشتراکیت پسندوں سے سہمے ہوئے ہیں اور اشتراکیت پسندوں کو سرمایہ داروں سے بیزاری ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ سرمایہ دار یہ سمجھتے ہیں کہ پیدایش دولت میں اُن کے سرمایہ کا بہت بڑا حصہ شامل ہے اسلئے وہی زیادہ منافع کے مستحق ہیں۔ اور مزدور پیشہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اصل تاوقتیکہ محنت اس میں شامل نہ ہو بالکل بیکار شے ہے اسلئے پیدایش دولت میں ان کا معاوضہ بڑھ چڑھکر ہونا چاہیے اور یہ سرمایہ دار جو بغیر ہاتھ پاؤں ہلانے کے خواہ مخواہ بہت بڑی مقدار اصل کے مالک بن بیٹھے ہیں اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ پیدائش دولت میں سے من مانے منافع ہتیا لیں اور بیچارے مزدور منہہ تکتے رہجائیں جنگ عظیم کے بعد سے ان خیالات کی اشاعت نے زور پکڑا اور روس میں لنین جیسا شخص پیدا ہو گیا جس نے سرمایہ داری کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کی وہ انفرادی ملکیت کا سخت مخالف تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ سارے وسائل آمدنی پر حکومت کا قبضہ ہو اور کل معاشی ذرائع گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہیں۔ کسی کو کسی پر معاشی فوقیت حاصل نہ ہو آزاد مسابقت کے اصول کا خاتمہ کردیا جائے اور حصول معاش کے لحاظ سے سب لوگ مساوی رہیں۔ چنانچہ انقلاب روس کے بعد ان اصولوں پر سختی سے عملدرآمد کیا گیا لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ اس کی یہ انتہائی پالسی کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ آخر میں مجبوراً لنین نے ایک عظیم الشان جلسہ کے آگے اپنی تقریر میں صاف صاف کہدیا تھا کہ سرمایہ داری کو رد کیا نہیں جا سکتا البتہ اسکے

خطرات کو ایک حد تک کم کیا جا سکتا ہے الغرض اوس کو اپنی پالسی میں معتدل ہونا پڑا اس دس سال کے عرصہ میں اوس کے باشندوں کو عجیب و غریب حالات کا سامنا کرنا پڑا ۔ قحط نمودار ہو گیا لوگوں کو کھانے کیلئے روٹی کا ملنا دشوار ہو گیا ۔ حکومت کو لوگوں کے معاشی نظام میں یکسانیت برقرار رکھنا ناممکن معلوم ہونے لگا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اوس نے اپنی اس پالسی کو بدل دیا مگر اس دس سال کے عرصہ میں اتنا تو ضرور ہوا کہ اسکے اس مسلک کا اثر تقریباً ساری متمدن دنیا پر پڑا اور جہاں کہیں بھی استعماریت نے اپنا دباؤ ڈالا اسکے خلاف ایک زبردست سد آہنی سرمایہ داروں کے خلاف قائم کر دیگئی ۔ فی الحال ہمیں اوس کی اس ناکام پالسی پر تفصیلی نظر ڈالنی مقصود نہیں ہے بلکہ نتائج پر غور کرنا چاہئے اور دیکھنا یہ چاہئے کہ اس مسلک کا اثر معاشی حالات پر کیا ہوا سب سے پہلے مبادلہ دولت کے سلسلہ میں سکہ کو خارج کر دینے کا اثر یہ ہوا کہ گوناگوں احتیاجات اور اسکی پیچیدگیوں کی وجہ سے مبادلہ میں سخت دقت واقع ہو گئی اجرت صحیحہ کا تعین نہایت دشوار صورت اختیار کرنے لگا ۔ لوگوں کی کارکردگی جو پیدائش دولت پر زبردست اثر ڈالتی ہے رخصت ہوتی گئی ۔ لوگوں کا معیار زندگی برقرار رہنا مشکل ہو گیا ۔ کارگزار اور کاہل ایک ہی درجہ میں آ گئے ۔ کارکردگی کا کوئی معیار قایم نہ رہ سکا ۔ اشیاء میں گرانی پر گرانی ہوتی گئی حتیٰ کہ قحط نے ان پر ستاران اشتراکیت کی آنکھیں کھولدیں ۔ عوام کی حالت تباہ ہونے لگی ۔ لینن اور ٹراٹسکی جیسے خداوندان اشتراکیت حریت کو بھی معترف ہونا پڑا کہ سرمایہ داری کی روک کرنے والی چیز نہیں البتہ اسکے جو تباہ کن اثرات ہیں ان کو صرف کم کیا جا سکتا ہے ۔ یہاں تو اس مسلک نے زور پکڑا اور دوسری جانب انگلستان میں انتہا درجہ کی استعماریت پیدا ہو گئی اور تنازع للبقا (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے اصول پر عملدرآمد شروع ہوا ۔ سرمایہ دار لوگوں کا اقتدار بڑھنا شروع ہوا اور پیدائش

دولت کے ذرائع پر ظالمانہ قبضہ کیا گیا اور مزدوروں کی اجرت صرف اس حد تک دی جانے لگی کہ جس سے صرف مزدوروں کی گزر اوقات ہو سکے۔ آخر تنگ آکر مزدوروں نے انجمن اتحاد مزدوران (TRADE UNION) قائم کی اور رفتہ رفتہ اس انجمن نے اسقدر قوت حاصل کی کہ آج انگلستان کی سیاسیات میں مزدوروں کا زبردست عنصر شامل ہے جن کی آواز کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بہرحال موجودہ معاشی اصول اور خصوصاً تقسیم دولت نے اسقدر عملی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ معاشیات کا یہ مبحث نہ صرف معاشین بلکہ سیاسی مدبرین کیلئے بھی جاذب توجہ ہو رہا ہے اور اسی مسئلہ نے دنیا کے سیاسی اور معاشی حالات میں تغیر و انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اسی سے اس مسئلہ کی عملی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

موجودہ معاشی رفتار اور اس کا مستقبل اٹھارہویں صدی عیسوی مختلف معاشی، صنعتی، تجارتی، معاشری اور سیاسی تغیرات و انقلابات کا زمانہ ہے، اور یہ وہ عہد ہے جس میں ہر لحاظ سے انسانی معاشی زندگی ایک نئے قالب میں ڈھلنے لگی۔ ان بے شمار تغیرات اور تبدیلیوں کی وجہ سے پرانے دور کا قایم رہنا اور رکھنا دشوار بلکہ ناممکن ہو گیا۔ اسلئے یہ صدی متعدد انقلابات کا مجموعہ ہے۔ سیاسی اور معاشری تبدیلیوں کے قطع نظر معاشی لحاظ سے یہ صدی ایک نئے دور کا سنگ بنیاد کہی جا سکتی ہے۔ پیدائش دولت پر انقلاب صنائع کا اسقدر گہرا اور زبردست اثر پڑا کہ قدیم معاشی حالات اور ان کے اثرات کا باقی رہنا محال ہو گیا۔ سائنس کی نئی نئی ایجادات، اختراعات اور اسکے انکشافات نے دنیا کی معاشی رفتار کو بے انتہا تیز کر دیا اور معاشی حالات جلد جلد تبدیل ہونے لگے جغرافیائی تحقیقات کا سہرا اگرچہ ایشیا کو حاصل ہے اور بیرونی اور علامہ ابن خلدون جیسے اشخاص ایشیا میں پیدا ہو گئے تھے لیکن ان تحقیقات سے عملاً یورپ

ہی نے کماحقہ فائدہ اٹھایا ادہر ایک طرف تو امریکہ دریافت ہوگیا اور دوسری جا
مختلف ممالک کے بحری راستے تلاش کئے گئے اور بڑے بڑے دخانی جہاز
تعمیر کئے گئے جسکی وجہ سے آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہوگئیں۔ ان وسائل آمدورفت
کا اثر معاشی حالات پر نہایت زبردست ہوا۔ تجارت خارجہ میں جان پڑگئی۔
پیدائش دولت کے طریقے بالکل بدل گئے۔ صنعت و حرفت میں دستکاری کی بجائے
مشین اور کلوں سے کام لیا جانے لگا۔ بھاپ اور برق جیسی قدرتی طاقتوں کا استعمال
ہونے لگا۔ پیدائش بربیمانہ کبیر پر عملدرآمد شروع ہوا۔ تقسیم عمل کی کافی گنجایش نکل آئی۔
بڑے بڑے کارخانے قایم ہوئے جہاں سامان بکثرت عمدہ اور ارزان تیار ہونے
لگا مصنوعات میں بیحد اضافہ ہونے لگا اور ان مصنوعات کی کھپت کیلئے وسیع بازاروں
کی ضرورت پیش ہوئی۔ اتفاق سے حالات نے یورپ کی مساعدت کی مگر بدقسمتی
سے ایشیا ان معاشی تغیرات سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ ایشیا کا یہ سکون خود اسکے
لئے سم قاتل ثابت ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ نے اپنے معاشی ڈورے پھیلے
پھیل ایشیا پر ڈالنے شروع کئے۔ اس معاملہ میں انگلستان سب سے پیش پیش رہا۔ اگرچہ اٹھارہویں
صدی کے معاشی انقلاب نے سارے یورپ کو متاثر ضرور کر دیا تھا لیکن انگلستان کو خصوصیت
کے ساتھ بہت اچھے مواقع ہاتھ آئے ملک میں لوہے اور کوئلہ کی وہ بہتات ہوئی اور
وہ قدرتی خزانے ابل پڑے کہ جسکی وجہ سے آج تک انگلستان کو اپنے صنعتی ملک ہونیکا
فخر ہے اور چونکہ ہندوستان جیسی سونے کی چڑیا انگلستان کے سیاسی چنگل میں تھی ہی
بس پھر کیا تھا مصنوعات کیلئے ایک وسیع بازار انگلستان کے ہاتھ لگ گیا اور دیکھتے
دیکھتے انگلستان نے وہ معاشی ترقی حاصل کر لی کہ دولت کے سرچشمے بہ نکلے جس کا دوسرے
ممالک خواب بھی نہ دیکھ سکے اور اسی وجہ سے وہ یورپ کا معلم اول کہلانے لگا۔

انگلستان کی اس معاشی ترقی کو دیکھکر یورپ کے دوسرے ممالک کو بھی ترقی کا خیال پیدا ہوا۔ ابتدا میں اگرچہ انگلستان کا کوئی حریف موجود نہیں تھا لیکن بعد میں جرمنی، فرانس اور امریکہ انگلستان کے مدمقابل بنگئے اور یورپ و امریکہ میں معاشی ترقی کا ایک دور شروع ہو گیا اور ملکوں میں باہم تجارتی مسابقت ہونے لگی جسکو اس کا ایک لازمی نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ ان ممالک کی ساری سیاست سمٹ سمٹا کر معاشی مسائل جیسے تجارت آزاد و مامون درآمد و برآمد، محصول، تجارت خارجہ، شاہی ترجیح وغیرہ میں جذب ہونے لگی اور ہر ملک ایک دوسرے کی ترقی کو رقیبانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ نوآبادیات کیلئے آپس میں سخت کشمکش ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی معاشی ترقی کا یہ سیلاب ایشیا، افریقہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور مصر وغیرہ ممالک کی جانب بہ نکلا اور خاص کر جرمنی نے حصول نوآبادیات کی خاص طور پر کوشش شروع کی اور یورپ کی اس جوع الارضی نے سارے عالم کو پریشان اور مبتلائے مصائب کر دیا۔ اپنی اس معاشی ترقی کی وجہ سے جرمنی یہ چاہتا تھا کہ اسکو بھی تجارت کیلئے کوئی وسیع آماجگاہ ہاتھ لگے تاکہ اس کی مصنوعات کی کھپت ہو سکے۔ اس معاشی ہوس پرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں آتش جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے اور تقریباً چھ برس تک دنیا کو امن و امان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس جنگ عظیم کے نتائج جو کچھ بھی ہوں لیکن یورپ کی معاشی رقابت نے لاکھوں بندگان خدا کو خونی سمندر میں غرق کر دیا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ یورپ نے حیرت انگیز ترقی کی لیکن وہ ان خطرات کا سدباب نہ کر سکا جو اس دوران ترقی میں پیش آنیوالے تھے اور ان خطرناک نتائج کا اندازہ نہ کر سکا جو اندر ہی اندر اس معاشی ترقی کے سلسلہ میں آتش فشانی مادہ کی طرح پک رہے تھے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ یورپ کی اس ترقی اور استعماریت نے نوع انسانی کو کس حد تک فائدہ پہونچایا۔ یہ ہیں یورپ کی معاشی ترقی کے وہ ہولناک

نتائج جس سے دنیا کو ایک زبردست دھکا لگا نا قابل تلافی نقصان پہونچا جس کے تباہ کن اثرات کی یاد ابھی تک لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔

اٹھارہویں صدی سے لیکر جنگ عظمیٰ تک معاشی ترقی کے منازل کا ذکر ہم نے مختصر طور پر کر دیا ہے اب یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کے بعد سے معاشی حالات کا رُخ کس طرف کو ہے۔ جونہی کہ جنگ عظیم ختم ہوئی لوگوں کے خیالات اور ذہنیت میں انقلاب پیدا ہو گیا ان خیالات کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے ممالک کا سیاسی ڈیچر ہی بدل گیا۔ اگرچہ اس جنگ میں اتحادیوں کو جرمنی پر فتح حاصل ہو گئی لیکن اتحادیوں کا اسقدر جانی اور مالی نقصان ہوا کہ جس کی وجہ سے وہ نڈھال ہو گئے جرمنی اپنی معاشی برتری کا جو خواب دیکھ رہا تھا اسکی تعبیر خود اسکے حق میں الٹی نکلی۔ اس شکست کے بعد سے اتحادیوں نے جرمنی کو معاشی اور سیاسی حیثیت سے بیحد کمزور کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی بادشاہت جمہوریت سے بدل گئی اٹلی میں آمریت (مطلق العنانی) پیدا ہو گئی۔ روس میں شہنشاہیت اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا گیا اسکی جگہ اشتراکیت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ایشیا پر یورپ کے اس سیاسی اور معاشی دباؤ کا نہایت زبردست اثر پڑا۔ ترکی میں جمہوریت قایم ہو گئی ایران میں پرانے شاہی خاندان نے پہلوی خاندان کیلئے جگہ خالی کر دی۔ افغانستان بھی معاشی ترقی پر گامزن ہونے لگا (اگرچہ حال میں خانہ جنگی کی وجہ سے ان امیدوں پر پانی پھر گیا لیکن شاہ نادر خاں پھر اس کو ایک بلند سطح پر لانیکی کوشش کر رہے ہیں) مصر میں آزادی کیلئے زبردست کشمکش شروع ہو گئی اور بہت بڑی حد تک آزاد بھی ہو گیا۔ چین نے بھی خانہ جنگی کے بعد غلامی کا جوا اپنی گردن سے اُتار پھینکا اور اسکو معاشی چین نصیب ہو گیا عرب میں بھی اسی قسم کے تغیرات رونما ہو گئے۔ ہندوستان اگرچہ مجبور اور بے بس ہے مگر پھر بھی آزادی و حریت سے ہم آغوش ہونیکی مقدور بھر کوشش کر رہا ہے۔

بہرحال یہ وہ حالات ہیں جن کو جنگ عظیم کے اثرات اور اسکی صدائے بازگشت سمجھنا چاہئے۔ دنیا کے کل ممالک میں جن دو ملکوں نے حقیقی معاشی مفاد حاصل کیا وہ مغرب میں امریکہ اور مشرق میں جاپان ہے اور آج امریکہ کو ساری دنیا پر معاشی تفوق حاصل ہے اور جاپان کا شمار بھی اول درجہ کی طاقتوں میں ہونے لگا ہے۔ دنیا ن کی اس سیاسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ معاشی حالات میں بھی تغیر ہوتا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں سیاسیات اور معاشیات دونوں ساتھ ساتھ اور متوازی راہوں پر چلے چلتے ہین اور سیاسی تبدیلی معاشی تغیرات کی مرادف ہوگئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ آج کل معاشی ترقی سیاسی ترقی پر مقدم ہوتی جارہی ہے۔ خاص کر وہ ممالک جو معاشی ترقی کے لحاظ سے ابھی نوخیز ہیں اپنی توجہ کی باگ کو سیاست سے زیادہ معاشیات کی جانب موڑ رہے ہیں اور دنیا کے ہر ایک ملک میں تقریباً یہ معاشی احساس پیدا ہوچکا ہے اور ہر ملک مالی لحاظ سے مستحکم اور معاشی اعتبار سے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا چاہتا ہے سیاسی خودداری کے دوش بدوش معاشی خودداری بھی پیدا ہورہی ہے چنانچہ ترکی میں غازی مصطفےٰ کمال اور ان کے رفقاء بہ ظاہر اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ملک کی قسمتوں کا فیصلہ آخر میں چل کر معاشی سطح ہی پر ہوگا۔ ترکی حکومت اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کئے ہوئے ہے کہ وہ عسکری فتح جو ترکی نے ابھی ابھی یونان اور متحدین پر حاصل کی ہے بیکار ہوگی اگر معاشی فتح اسکو تاجپوش نہ کریگی۔ حکومت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اسی وقت سے کرنے لگی تھی کہ تجارت و حرفت کی فکر کریں نہ کہ صرف فوج ولشکر اور سیول ملازمت کی۔ ترکی حکومت کی یہ مدبرانہ دعایتیں ان چھ سالوں میں برابر پھل لارہی ہے۔ ان حالات و نتائج کے لحاظ سے ترکی کا مستقبل نہایت امیدافزا اور شاندار کہا جاسکتا ہے۔ ایران کی بھی تقریباً یہی حالت ہے وہ بھی اپنی ہمسایہ سلطنتوں سے

سبق حاصل کر رہا ہے۔ ہندوستان بھی اسی معاشی انتظام کے ذریعہ حصول آزادی کی کوشش میں مصروف ہے خدا کرے کہ اسکو اس میں کامیابی ہو۔ روس تو اپنی اشتراکی پالیسی کی وجہ سے یورپ کے ایوان استعماریت میں زلزلہ ڈال رہا ہے۔ الغرض مشرق میں معاشی ترقی کا احساس کافی طور پر پیدا ہو چکا ہے اور اسی کے حصول میں وہ راتدن کوشاں ہے وہ زمانہ دور نہیں جبکہ مشرق بھی اپنی ترقی سے یورپ کا سا مرتبہ حاصل کر لیگا اور اسی سے ایشیا کا مستقبل امید افزا نظر آرہا ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ یورپ کی معاشی ترقی سے سبق حاصل کرے اور سرمایہ داری کے وہ زہریلے اثرات کا علاج قبل از قبل سوچ لے جو اس ترقی کے دوران میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ بخوس پرست یورپ کی آنکھ میں ایشیا کی یہ ترقی خار کی طرح کھٹک رہی ہے وہ نہیں چاہتا کہ یورپ کی طرح ایشیا بھی معاشی ترقی کے منازل طے کرنے لگے وہ مشرق کی بیداری اور ترقی کو اپنی بربادی اور زوال کا پیش خیمہ سمجھ رہا ہے۔

یورپ جس معاشی مسلک پر گامزن ہے اسکو ہم نے تقسیم دولت کے سلسلہ میں بیان کر دیا ہے صرف چھ ممالک ہی ایشیا و یورپ میں ایسے ہیں جنہیں معاشی اور سیاسی اعتبار سے اول درجہ کی طاقت کہہ سکتے ہیں یعنی انگلستان، فرانس، اٹلی، جاپان، روس اور جرمنی لیکن امریکہ اس معاشی دور میں ان چھ دول سے بھی سبقت لیگیا۔ یورپ کے معاشی نظام میں کچھ ایسی خامی موجود ہے جسکی وجہ سے اصلداروں اور مزدوروں میں باہم سخت کشمکش ہوتی رہتی ہے اور آئے دن مزدوروں کی ہڑتالیں اصلداروں کو چین نہیں لینے دیتیں۔ اس کا ایک اور اثر یہ بھی ہے کہ یورپ میں بیکار لوگوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور انگلستان کو یہی مسئلہ بیکاری بہت پریشان کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے اشتراکیت کا مسلک یورپ میں عام الناس اور خاص کر مزدور پیشہ طبقہ میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے جسکے خوف سے یورپ کے سرمایہ دار لرزہ براندام ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ ملکوں میں اسقدر سخت معاشی اور

سیاسی کشمکش ہو رہی ہے کہ ایک ملک کی ترقی کو دوسرا ملک شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھتا ہے انگلستان یہ چاہتا ہے کہ یورپ کے کل ممالک میں توازن قوت قایم رہے۔ فرانس اپنی بقا و فنا کا انحصار بری فوج پر سمجھتا ہے کیونکہ اس کو ہر وقت جرمنی سے خطرہ لگا ہوا ہے۔ ادھر اٹلی کی آمریت ماضی کی عظمت حاصل کرنا چاہتی ہے اور وہ نوآبادیات پر قبضہ جما کر حصول اقتدار کی فکر میں ہے۔ جرمنی اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے اگرچہ ان ممالک کے درمیان معاہدات کے ذریعہ پیمان دوستی قائم ہے لیکن اسکی بنیاد اسقدر نازک موادیہ پر اٹھائی جاتی ہے جو ایک ہی جھٹکے میں شکست ہو سکتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان ممالک کی یہ باہمی سیاسی دوستی بھی رقیبانہ اور حاسدانہ تار و پود سے بندھی ہوئی ہے اور ذرا سی بدگمانی بھی مواعید و پیمان مودت کو بالائے طاق اور باہم دست و گریبان ہونے کیلئے کافی ہے حقیقت یہ ہے کہ آجکل یورپ ایک نہایت ہی نازک دور سے گزر رہا ہے اور یہاں کا امن و امان بالکلیہ معاشی حالات کے رحم و کرم پر منحصر ہے اور کسی وقت ذرا سی تبدیلی بھی فقدان امن کا باعث ہو سکتی ہے۔ گزشتہ زمانہ میں بھی جنگیں برپا ہوئی ہیں ان کے اسباب زیادہ تر مذہبی اور سیاسی اختلافات ہوا کرتے تھے مگر آج زمانہ بدل گیا ہے اسکی ضروریات بدلگئی ہیں موجودہ زمانہ کی جنگوں کی نوعیت بدل چکی ہے مقاصد بدلگئے ہیں۔ آج جنگ اسلئے نہیں ہوا کرتی کہ ایک قوم کے مذہبی عقائد دوسری قوم کے مذہبی عقائد سے مختلف ہیں۔ ملک گیری قومی عظمت کا ذریعہ نہیں رہی یہ مقاصد آج مضحکہ انگیز معلوم ہوتے ہیں اور انکی وقعت جنون سے زیادہ نہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے تیل کے چشمے کوئلہ کی کانیں بنیاد جنگ قرار دئے جا سکتے ہیں اور یہی چیزیں موجودہ زمانہ کی بیش بہا دولت ہیں۔ جنگ اگرچہ یورپ میں بند ہو چکی ہے لیکن جنگ کے خطرات بدستور باقی ہیں۔ انہی خطرات کو محسوس کر کے یورپ نے جنیوا میں ایک بین الاقوامی انجمن قایم

کی ہے لیکن دنیا کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا اور نہ اس انجمن کا قیام دنیا کے امن وامان کیلئے کافی ضمانت ہوسکتا ہے۔ یورپ ہر ممکن طریقہ سے اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ خطرات ناپید ہوجائیں مگر اتنک اس کو اس معاملہ میں کامیابی نہیں ہوئی یورپ کی قوموں میں جبتک حرص وآز کا جذبہ موجود ہے اور جبتک یورپ کی نیت میں فتور باقی ہے ناممکن ہے کہ یہ خطرات رفع ہوسکیں بقول ایک شاعر کے۔ ع

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے نوع انساں کو اخوت کی زباں ہوجا محبت کا بیاں ہوجا

حالات سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ مستقبل قریب میں دوبارہ یورپ کو جنگ کے تباہ کن حالات سے مقابلہ کرنا پڑیگا ممکن ہے کہ اسکے بعد معاشی حالات میں پھر کایا پلٹ ہوجائے اور یورپ کو درس عبرت حاصل ہو۔ یورپ معاشی فوقیت کے تعاقب میں اپنی اخلاقی قوت بھی کھوتا جارہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ باوجود اسقدر ترقی کے چین وآرام کی زندگی مفقود ہے۔ طمانیت قلب کا فقدان ہے مشینوں اور کلوں میں کام کرتے کرتے وہ خود بھی ایک کل بنگیا ہے۔ یورپ والوں کا منتہائے مقصود صنعت وحرفت کی ترقی انکی زندگی اسکے لئے وقف ہوچکی ہے صنعت وحرفت ان کیلئے نہیں بلکہ وہ خود صنعت وحرفت کیلئے ہوگئے ہیں۔ انکی اس صنعتی زندگی کا اثر انکے اخلاق پر بری طرح مرتب ہورہا ہے۔ غرض یورپ کی ترقی کے یہ نتائج ہیں جسکی وجہ سے وہاں باشندوں کی زندگی تلخ ثمرات پیدا کررہی ہے۔

امریکہ کی حالت یورپ سے مختلف ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں اگر کوئی ملک حقیقی معنوں میں مرفع الحال ہے تو وہ صرف امریکہ ہے وہ اپنی سیاسی یکسانیت اور معاشی فوقیت کی وجہ سے یورپ پر چھارہا ہے۔ امریکہ کی صنعتی ترقی میں جس حدتک تعلیم کو دخل ہے ایک امریکن پروفیسر کا یہ دعوی مبنی برحقیقت ہے کہ امریکن یونیورسٹیوں کا

رجحان تعلیم ادب، فلسفہ اور فنون لطیفہ کی بجائے زیادہ تر صنعت وحرفت کی طرف ہے۔ امریکہ یورپ کے پایہ کا ادیب، شاعر، نقاد، فلاسفر یا آرٹسٹ پیدا نہیں کرسکا لیکن ڈالر کمانے کے فن میں دنیا اسکو آج کل معلم اول تسلیم کرتی ہے واقعہ یہ ہے کہ جنگ عظیم کے وقوع نے امریکہ کو ترقی کا کافی موقع دیا۔ جہاں یورپ کا صنعتی اور تجارتی نظام محاربۂ عظمیٰ کی جانگسل کشمکش سے ایک مدت تک معرض انتشار میں رہا وہاں امریکہ کو یورپ کے کھنڈرات پر ایک مہتم بالشان معاشی عمارت استوار کرنیکا موقع ملگیا ۱۹۲۱ء میں ماہرین معاشیات نے یہ فتویٰ صادر کیا تھا کہ جنگ یورپ کے بعد امریکہ کو جو صنعتی فروغ حاصل ہوا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے محض عارضی ہے اور اس کا ردعمل امریکہ کیلئے تباہی بخش ثابت ہوگا۔ لیکن جب امریکہ کی حیرت انگیز خوشحالی سال بسال ترقی کی نئی منزلیں طے کرنے لگی تو یورپ والے تو کجا خود اہل امریکہ حیران رہگئے ایک مبصر نے امریکہ کی بے پایان دولت کا یہ راز بتایا کہ وہاں سیاست کا دوسرا نام معیشت ہے۔ وہاں کے اہل سیاست ارباب صنعت کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ واشنگٹن کے بعد ریاستہائے متحدہ کرسی صدارت پر اس وقت تک اٹھائیس پریزیڈنٹ متمکن ہوچکے ہیں جس میں انیس قانون دان چار سپاہی تین سپاہی ایک ایڈیٹر اور ایک پروفیسر تھا۔ خود واشنگٹن پیشہ کے اعتبار سے انجنیر تھا، پریزیڈنٹ ہارڈنگ اخبار نویس تھا اور ولسن پروفیسر۔ یہ حقیقت کسقدر جاذب توجہ ہے کہ موجودہ صدر جمہوریہ یعنی ہربرٹ ہوور نہ قانون دان ہے نہ ماہر سیاسیات نہ کسی اخبار کا مدیر ہے نہ کسی کالج کا پروفیسر تو پھر کیا وجہ ہے کہ جمہور امریکہ نے صدارت کیلئے ایسے شخص کا انتخاب کیا جو امریکن صدارت کی روایتی قابلیتوں سے معرا ہے۔ اس سوال کا جواب امریکن تمول کے اسباب پر متجسس شعاعوں کا کام دیگا۔ اہل امریکہ کا سابقہ تجربہ شاہد ہے کہ تجارتی اور صنعتی ترقی

کیلئے قانون، سیاست، فن حرب، ادارت اور پروفیسری سے زیادہ ماہر معاشیات کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حکومت کی باگ ایک ایسے شخص کے حوالہ کی ہے جو زمانہ حاضرہ کے صنعتی نظام کا ماہر خصوصی ہے۔ زمانہ حاضرہ کا معاشی نظام ایک مشین کی اندرونی مشنری سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور اس کی پیچیدگیوں کو ایک ماہر معاشیات کا ناخن ہی سلجھا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج دنیا کی نوے فیصدی موٹر کاریں امریکہ میں تیار ہوتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امریکہ کی سیاسیات عملی طور پر اسکے ارباب صنعت کے زیر اثر ہے یا بالفاظ دیگر حکومت عملاً معاشی واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک انتخابی تقریر کے دوران میں مسٹر ہوور نے کہا تھا "گورنمنٹ کا صریح فرض ہے کہ وہ تعمیری کام میں عوام کی رہنمائی کرے اور ساتھ ہی اس امر کو مدنظر رکھے کہ یہ رہنمائی انفرادی اولوالعزمی اور تحرک کیلئے مانع کا ثابت نہ ہو کیونکہ قوم کی بہبودی اسی اولوالعزمی اور تحرک پر مبنی ہے"۔ غرضکہ صنعتی ترقی کیلئے کسی سیاست دان کی قانون سازی سے زیادہ ضروری ایک ماہر معاشیات کا مشورہ ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کے مشہور صنعتی ماہر و سرمایہ دار مسٹر چارلس شوویب نے امریکہ کی تعجب انگیز دولتمندی کے کئی اسباب بیان کئے ہیں جن سے چند حسب ذیل ہیں پہلا سبب یہ ہے کہ امریکن مزدور کو جو اجرت ملتی ہے وہ عدیم النظیر ہے۔ یہ اجرت نہ صرف اجرت متعارفہ کے لحاظ سے بلکہ اجرت صحیحہ کے حساب سے بھی دیجاتی ہے اور ایک مزدور کی جیب میں اتنے روپے ہوتے ہیں کہ ایک آرام دہ زندگی کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ سرمایہ دار، مزدور اور اجرون کے مابین مشترکہ مفاد اور ذمہ داری کا کامل احساس موجود ہے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ امریکہ نے اس اصول کو سمجھ لیا ہے کہ زیادہ اجرت اور معاشی

خوشحالی کا باہم نہایت گہرا تعلق ہے جس کا اثر یہ ہے کہ مزدور کو دو طرح سے فائدہ حاصل ہوتا ہے ایک تو اجرت کی بیشی سے دوسرے ضروریات کی ارزانی سے۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ صنعتی کارخانوں کی ملکیت اور حصہ داری کا دائرہ نہایت وسیع ہے پانچواں سبب یہ ہے کہ عام تعلیم کا رجحان صنعتی اور معاشی ہے۔ اس اشتراک سے فائدہ سرمایہ دار اور مزدور دونوں جانتے ہیں کہ نفع اور اجرت مشترکہ تھیلی میں سے نکلتے ہیں اور اس میں سے جتنی رقم نکالی جائے اُسے اُسی تناسب سے پُر کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ اور مزدوری کی جداگانہ حیثیت مٹ رہی ہے۔

بہرحال امریکہ نے ایک نیا معاشی ضابطہ دنیا کے آگے پیش کیا ہے اسکے مطابق مزدور کو معقول معاوضہ دینا ہی کافی نہیں بلکہ اس سے یہ مقصود ہے کہ عام سوسائٹی کا معیار زندگی ہر روز بلند ہوتا جائے۔ ہنری فورڈ کا قول ہے کہ ہر مزدور اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ ہر قسم کی صنعتی پیداوار سے مستفید ہو سکے۔ فورڈ ایک اعلیٰ کاروباری دماغ کے ساتھ ایک نہایت ہمدرد دل بھی رکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دل اور دماغ کا یہ اجتماع نہایت شاذ ہوتا ہے اور یہی بات یورپ میں مفقود ہے۔ امریکہ کا قول محض قدرتی ذرائع یعنی لوہے، تیل، کوئلہ اور زرخیز زمین کی فراوانی پر موقوف نہیں روس میں ان سب چیزوں کی افراط کے باوجود وہاں صنعتی قحط طاری ہے۔ امریکہ میں انسانی معاشی زندگی کے ان مسائل کو حل کرنیکی کوشش کیجاتی ہے جو موجودہ تمدن اور معاشی ترقی کے دوران کے ہر مرحلہ پر پیش آتے ہیں۔ ہربرٹ ہوور نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "امریکن انفرادیت" میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وہ معاشی نظام جو محض سائنس اور مزدوری کا مجموعہ ہو بے جان ہو بے معنی ہے جبتک اس نظام میں ہر فرد کو انفرادی حیثیت سے انتہائی ترقی کرنیکا موقع حاصل نہ ہو۔ امریکن سوسائٹی میں ہر شخص کیلئے ترقی کا دروازہ

کھلا ہوا ہے۔ امریکہ کی اس معاشی ترقی اور اسکے بہتر نظام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ یورپ کے معاشی طریقہ کار اور امریکہ کے طرز عمل میں کسقدر زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ ہر قسم کے مہیب اور ہولناک خطرات میں گھرا ہوا ہے اور امریکہ نے سب کیلئے معاشی ترقی کا عام دروازہ کھولکر اس قسم کے تباہکن اور مہلک خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہے۔

موجودہ زمانہ جس میں قدم قدم پر مختلف و متعدد معاشی مسائل سے انسان کو سابقہ پڑتا رہتا ہے اور یہ مسائل جن کا اثر انسان کی عملی زندگی کے پہلو پر بہت زیادہ نمایاں ہے یہ ضروری ہے کہ معاشیات سے واقفیت حاصل کرنیکی کوشش کیجائے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کے پیدا ہونیکے پیشتر سے لیکر مرنے کے بعد تک بھی اس کا ساتھ چھوٹنا ایک امر محال ہے تو پھر کس طرح ان سے ناواقف اور بے خبر رہکر ایک انسان اپنی زندگی کو اس کشمکش میں گزار سکتا ہے۔ چنانچہ ایک طالب علم کو جب وہ اپنی تعلیم ختم کر چکتا ہے تو سب سے پہلے اسکے سامنے یہی مسائل درپیش ہوتے ہیں کہ وہ اپنا معیار زندگی کس طرح قایم رکھے اور اسکو قائم رکھنے کیلئے کونسی راہ اختیار کرے۔ اگر وہ ملازمت کے دائرہ میں داخل ہونا چاہے یا تجارت، پیشہ زراعت اختیار کرنا چاہے یا صنعت غرض کوئی پیشہ اپنی زندگی کیلئے اختیار کرے ان سب کا تعلق معاشیات ہی سے ہوگا یہ امر قابل لحاظ ہے کہ آج کل تعلیم محض تعلیم کی خاطر بہت کم حاصل کیجاتی ہے بلکہ تعلیم کو حصول معاش کا ایک ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ ہمیں اس امر سے بحث نہیں کہ آیا یہ اصول تعلیم صحیح ہے یا غلط لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر متعلم تعلیم سے پیشتر اپنا آئندہ معاشی نصب العین پہلے ہی سے سوچ لیتا ہے کیونکہ موجودہ زمانہ میں تلاطم انگیز معاشی رو میں انسانی زندگی کی کشتی بہی جا رہی ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جس کا رخ ایک عالمگیر معاشی ماحول کی جانب ہو چکا ہے اور انسان کیلئے یہ امر

تقریباً ناممکنات سے ہے کہ وہ اس معاشی فضا سے علٰحدہ ہوکر رہے اور معاشی اصول کے نتائج سے الگ تھلگ رہ سکے۔ اور جب اسکو اس معاشی سمندر میں رہنا ہے تو اسکے لئے یہ لازمی امر ہے وہ کچھ نہ کچھ پیراکی سے بھی واقف ہو۔ مذکورہ بالا تفصلات سے معلوم ہوا کہ نہ صرف اجتماعی بلکہ انفرادی حیثیت سے بھی اسکی اہمیت نظر انداز نہیں کیجا سکتی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ خود معاشیات کی علمی وسعت اسکی عملی اہمیت کا ایک پیمانہ ہے۔ اور اسی سے اسکی عملی اہمیت کا اندازہ بھی ہوسکتا ہے فقط

محمد فیض الدین
متعلم سال چہارم کلیہ جامعہ عثمانیہ

عناصر کی پیدائش اور انکا انجام

از مولوی سید شاہ محمد صاحب متعلم ایم۔ایس۔سی عثمانیہ

کائنات کی پیدائش اور اس کے انجام کا مسئلہ ہمیشہ انسانی غور و فکر کے زیر بحث رہا۔ مفکرین سائنس نے بھی اس پر اپنی پوری توجہ صرف کی البتہ جیسا کہ ان کی عادت ہے انہوں نے خیالی گھوڑے دوڑانے سے احتراز کیا اور اپنے خیالات اور نظریات کو واقعات اور تجربات پر منطبق کرنے کی کوشش کی، اشیائے کائنات کی ماہیت کا مطالعہ عموماً سائنس کی اس شاخ سے مختص سمجھا جاتا ہے۔ جسے کیمیا کہتے ہیں، کیمیائی نقطہ نظر سے کائنات کے ابتدائی اجزاء عناصر ہیں اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ خود ان کیمیائی عناصر کی ساخت کیا ہے، ان کی پیدائش کس طرح ہوئی پوائنکارے (POINCARE) نے بجا طور پر کہا "فطرت کی سادگی پر ایقان کوئی منطقی چیز نہیں بلکہ ایک عقیدہ ہے" یہی وجہ ہے کہ کائنات کی پیدائش کے متعلق ابتداء سے سادہ ترین خیالات پیش کئے گئے جن کا لب لباب یہ ہے کہ کائنات کی تشکیل محض ایک اولین عنصر سے عمل میں آئی۔ اس کو ایک قسم کا نظریۂ وحدانیت سمجھنا چاہئے۔

ابتدائی خیالات قدیم یونانی حکما کا خیال تھا کہ مادہ کا مبدا ایک ہے جس کو (PRIME MATERIA) اولین مادہ سمجھا جاتا ہے اولین مادہ کے مختلف طریق اجتماع سے مادہ کی مختلف ہیئتیں اور شکلیں نمودار ہوتی ہیں۔ فیثا غورث اور اس کے متبعین کے نزدیک تمام مادی "ذرات" کیفی طور پر یکساں تھے صرف ان کے اشکال میں اختلاف تھا۔ لیوکی پس (LEUCIPUS) اور دیمقراطیس (DEMOCRITUS)

کے خیال میں تمام اشیاء کے جواہر یک ذات اور متجانس ہیں یعنی ماہیت اور کیمیائی اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں لیکن اپنی جسامت اور شکل میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ الغرض تمام حکمائے قدیم اس بات پر متفق تھے کہ کائنات میں مادہ کی تمام شکلیں ایک ہی ابتدائی یا اصولی عنصر سے ماخوذ ہیں لیکن مختلف لوگوں کے نقطۂ نظر سے "اصولی عنصر مختلف تھے۔ چنانچہ اگزامینس (ANAXIMENES) نے ہوا کو، ہیراقلیطس (HERACLITOS) نے آگ کو، فری کیڈیز (PHERECIDES) نے خاک کو اور تھیلس (THALES) نے پانی کو ابتدائی عنصر قرار دیا۔

اگر ہم قدیم ہندی حکماء کے خیالات کا بھی یہاں تذکرہ کریں تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ہند کے قدیم سنسکرتی ادب میں تقریباً ۶۰۰ ق م ایک شخص کانا ڈا (KANADA) کا نام ملتا ہے جس کے لفظی معنی "جواہر خوار" کے ہیں۔ وہ مہاتما بدھ کا شاگرد سمجھا جاتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جوہر ابدی ہیں اور آخری (ULTIMATE) جوہر سادہ ہے۔ اسی طرح (KAPILA) کاپیلا نے بھی مادہ کی پیدائش کے متعلق اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے۔ سر پی سی رے (SIR.PC.RAY) نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "ہسٹری آف ہندو کیمسٹری" میں بتایا کہ مادہ کی ساخت کے متعلق قدیم یونانی حکماء کے خیالات قدیم تر آریائی خیالات سے ماخوذ ہیں اور یہی رائے جرمنی کے مشہور ماہر سنسکرت ڈاکٹر ماکس میولر (MAX MULLER) نے ظاہر کی۔

ازمنہ وسطیٰ میں کیمیا گری کا دور دورہ تھا۔ کیمیا گروں کو ادنیٰ دھاتوں سے سونا بنانے کی دُھن تھی بالفاظ دیگر ان کے نزدیک مادہ کی ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیلی ممکن تھی۔ یہ خیال اسی وقت بجا ہو سکتا ہے جب کہ مادہ کی تمام شکلوں کو ایک ابتدائی عنصر سے ماخوذ سمجھا جائے۔

خیالات جدید جدید سائنس کے علمبردار نیوٹن (NEWTON) بائل (BOYLE) وغیرہ نظریہ وحدانیت کی طرف مائل تھے۔ ڈالٹن (DALTON) نے ۱۸۰۳ء میں اپنا کیمیائی نظریہ جو بہت مستند کیا اور اس کے بعد سویڈن کے مشہور کیمیا داں برزیلیس نے (BERZELIUS)

معلومہ عناصر کے اوزان جواہر کی فہرست شائع کی۔ اس کے چند دنوں بعد (۱۸۱۳ء تا ۱۸۱۴ء) ولیم پراؤٹ (PROUT) نے ایک جدید نظریہ پیش کیا۔ چونکہ ہائیڈروجن کا وزن جوہر تمام معلومہ عناصر میں سب سے ہلکا ہے اس لئے اس نے خیال ظاہر کیا کہ "عناصر ہائیڈروجن جواہر کے مختلف مجموعے ہیں" یعنی مختلف عناصر ہائیڈروجن کے مضاعف ہیں پراؤٹ کے نظریہ نے اپنی سادگی کی وجہ اکثر علماً کی تائید حاصل کی لیکن بعضوں نے اختلاف کیا۔ اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ اگر ہائیڈروجن جوہر کا وزن ایک ہو تو دیگر عناصر کے اوزان صحیح اعداد ہوں گے لیکن جدول ادوار عناصر (PERIODIC TABLE OF ELEMENTS) کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر عناصر کا وزن جوہر صحیح عدد نہیں۔ چنانچہ پراؤٹ کے نظریہ پر یہی بڑا اعتراض کیا گیا۔ اس کے بعض معاصرین نے مختلف عناصر کا وزن جوہر نہایت دقیق اور نازک تجربات سے دریافت کیا۔ ان میں سب سے مشہور فرانسیسی عالم جے، ایس سٹاس (J. S. STAS) کے تجربات ہیں جسنے کلورین کا وزن جوہر ۳۵،۴۶ معلوم کیا۔ اور بیان کیا کہ "میں اس کامل ایقان پر پہنچ گیا ہوں کہ پراؤٹ کا کلیہ دھوکہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یہ محض ایک قیاسی چیز ہے جس کی تجربہ تردید کرتا ہے۔ اس طرح پراؤٹ کا نظریہ عام بے توجہی کا شکار ہوتا گیا۔ تاہم مشہور کیمیا دان مارگنیس (MARIGNACE) نے خیال ظاہر کیا کہ "پراؤٹ کا نظریہ تجربہ سے بالکل مطابق نہ ہوتا ہو تو وہ کم از کم یہ بتاتا ہے کہ عناصر کے اوزان کے مابین کیا رشتہ ہونا چاہیئے۔ مادہ کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم فرض کر سکتے ہیں کہ ایک نامعلوم سبب جو ابتدائی مادہ کے ذرات کے اجتماع سے ہمارے معمولی جواہر کی پیدائش میں ممد ہوتا ہے وہی اس طریق پر اثر رکھتا ہے جس کے تحت یہ جواہر کو ثباتی تجاذب کے قانون کی پابندی کرتے ہیں اس طرح ان کا ترکیبی وزن ابتدائی ذرات کے اوزان کا صحیح مجموعہ نہیں ہوتا۔" اس میں شک نہیں کہ پراؤٹ کا نظریہ عام بے قدری سے نہیں بچ سکا۔ تاہم اس کی بنیادی صداقت سے انکار نہایت مشکل تھا۔

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں سر ولیم کروکس نے پراؤٹ کے نظریہ کو تازہ کرنیکی

کوشش کی ۱۸۸۸ء میں کروکس (CROOKES) نے نادر ارضوں پر اپنی تحقیقات شایع کیں جس میں اس نے بتایا کہ ایسے اشیا، کی بڑی تعداد موجود ہے جو فطرت میں ایک ساتھ پائے جاتے ہیں اور خواص میں مشابہ ہوتے ہیں۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ نادر ارضیں ایک ہی عنصر کی مختلف بہروپی شکلیں ہیں۔ اسی خیال کو وسعت دیکر اس نے یہ نظریہ قایم کیا کہ مادہ کی تمام شکلیں ایک اولین عنصر سے ماخوذ ہیں۔ جسے اس نے پروٹائل (PROTYLE) کا نام دیا۔ کروکس نے اسطرح نظریہ وحدانیت اور غیر نامیاتی ارتقا، کے نظریہ کو قایم کرنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد ہم بعض تجربی اور مشاہداتی واقعات کو لے کر بتائیں گے کہ وہ کس طرح متذکرہ نظریہ پر استدلال اور اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

(الف) بہت سے عناصر کے اوزان جواہر صحیح اعداد ہیں!

اوزان جواہر کے بین الاقوامی تختہ میں بانوے ۹۲ عناصر پائے جاتے ہیں اور ان میں سے چالیس سے زیادہ کامل اعداد ہیں پس یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ واقعہ محض اتفاقی نہیں ہوسکتا اور سٹرٹ (STRUTT) کا بیان ہے: "لاپلیس کے الفاظ میں ہمارے پاس پراؤٹ کے کلیہ کی کسی ترمیم شدہ شکل کو ماننے کے لئے اس سے زیادہ وجوہات ہیں جن سے ہم بہت سے تاریخی حالات کو واقعی اور صحیح مانتے ہیں"۔ حال میں پروفیسر ساڈی کی کوششوں نے عناصر کی ہم مقامی (ISOTOPY) پر روشنی ڈالی۔ تابکار عناصر کے سلسلہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوری جدول کے ایک ہی خانہ اور مقام پر ایک سے زیادہ عناصر (عموماً مختلف الاوزان) واقع ہوتے ہیں۔ انہیں ہم مقام عناصر کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایونیئم، تھوریئم ایک ہی مقام پر واقع ہیں۔ غیر تابکار عناصر کی صورتوں میں بھی مثبت شعاعی تشریح (POSITIVE RAY ANALYSIS) کی مدد سے کئی ہم مقاموں کا وجود بتایا گیا۔ مشہور مثال سیسہ ہے۔ پس پراؤٹ کے نظریہ پر سے اس کا جو زبردست اعتراض تھا وہ دور ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے عناصر کے اوزان جواہر صحیح اعداد ہونا چاہئے۔ لیکن اگر فطرت میں ایسے عناصر ملتے ہیں جن کے اوزان اعداد صحیح نہیں ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں

کہ غالباً ان کے چند ہم مقام (ISOTOPES) وجود پذیر ہیں اوران کا وزن جوہر اپنے ہم مقاموں کے بین بین ہے ۔ چنانچہ پروفیسر آسٹن نے بتایا ہے کہ کلورین جس کا معمولی وزن جوہر ۳۵٫۴۶ ہے دو ہم مقام عناصر کے غیر مساوی تناسبوں کا آمیزہ ہے جن میں سے ایک کا وزن ۳۵ اور دوسرے کا ۳۷ ہے ۔

(ب) اکثر عناصر خاندانی تعلقات کا اظہار کرتے ہیں !

اگر عناصر ایک دوسرے سے بالکل مختلف الذات ہوں اوران میں کوئی مشترک چیز نہ ہو تو ناممکن ہے کہ بعض عناصر خواص کے لحاظ سے آپسمیں مشابہ ہوں اوراس طرح عناصر کی جماعت بندی بے معنی چیز ہو جاتی ہے ۔ سب سے پہلے دوبے رائینر (DOBEREINER) نے اصُول ثلثۃ (LAW OF TRIAD) پیش کیا جس میں اس نے تین تین عناصر کا ایک ایک گروہ بنایا اوران کے خواص کی مشابہت کو واضح کیا ۔ اس کے بعد مینڈلیف (MENDELEEF) نے اپنا مکمل نظام دوری پیش کیا ۔

لوہے خاندان کے ثلثہ پروفیراڈے کا ریمارک قابل یادداشت ہے :-

اُس طرح ہم پر یہ بات روشن ہوتی ہے کہ عناصر کے بعض گروہ ایک دوسرے میں تغیر پذیر ہیں لیکن ایسے حالات جن کے تحت یہ تغیر ہو سکتا ہے ابھی تک ہمارے مشاہدے میں نہیں آسکے "

عناصر کے ثلثہ اور نظام دوری کے گروہ بتاتے ہیں کہ مشابہ عناصر کے خاندانوں کا مشترک مبدا ہے ۔ چنانچہ رائٹ نے بیان کیا کہ معمولی عناصر ابتدائی مادہ کے بہروپی اشکال ہیں اور ایک دوسرے سے اس بات میں مختلف ہیں کہ ان میں فی اکائی کمیت مخفی توانائی کی مقدار مختلف ہوتی ہے ۔

(ج) مشابہ عناصر فطرت میں ایک ساتھ پائے جاتے ہیں !

یہ بات عام طور پر دیکھی جاتی ہے کہ مشابہ عناصر اور مرکبات ایک جا پائے جاتے ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے ۔ مثلاً کوبالٹ و نکل کبھی ایک دوسرے سے بالکل آزاد نہیں ملتے ۔ چاندی عام طور پر سیسہ کی کچ دھاتوں یا سونے کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے

کیڈمیم زنک کے ساتھ بسلینم گندک کے ساتھ ہوتے ہیں اسی طرح پلاٹینم خاندان کے تمام عناصر یک جا پائے جاتے ہیں اور تمام نادر ارضیں ایک جگہ پر ہوتی ہیں۔ نادر ارضوں کا ایک جا پایا جانا محض اتفاق پر منحصر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ عناصر نہ تو کثیر طور پر منتشر اور پھیلے ہوئے ہیں اور نہ اُن میں ایک دوسرے کے ساتھ کیمیائی رغبت پائی جاتی ہے۔ پس یہ قرین قیاس ہے کہ عناصر زیر بحث غالباً ایک مشترکہ مادہ سے تقریباً یکساں حالات کے تحت وجود میں آئے ہوں گے۔ اور حالات میں خفیف تبدیلیاں ان مشابہ عناصر کی تشکیل کا باعث ہوئیں۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماحول سے عناصر کے ارتقاء کا پتہ چلتا ہے، اور تمام عناصر ایک سادہ عنصر کی مختلف طور پر ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

طیفی تشریح طیفی تشریح سے بھی عناصر کی ساخت کے متعلق نظریہ وحدانیت کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ بنسن (BUNSEN) نے سب سے پہلے بتایا کہ کسی عنصر کا طیف اس کے وزن جوہر کے مانند اس کی اساسی خاصیت ہے، مختلف عناصر کے طیوف مختلف ہوتے ہیں۔ بعض عناصر کے طیف سادہ ہوتے ہیں مثلاً ہائیڈروجن ہیلیم وغیرہ لیکن اکثر عناصر کے طیف پیچیدہ ہوتے ہیں ان میں طیفی خطوط کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ طیف پیدا کرنے والے اہتزاز پیچیدہ ہوتے ہیں۔ سر نارمن لاکی ایر (SIR NORMAN LOCKEYER) کے خیال کی رو سے ان خطوط کا تعلق جوہر کے مختلف حصوں کی مختلف اہتزازی طاقتوں سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جوہر ذرات کا ایک پیچیدہ مجموعہ ہے اور رولینڈ نے بجا طور پر کہا کہ ایک بڑا پیانو جوہر کے مقابلہ میں سادہ تر ساخت رکھتا ہے پس ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "جوہر خود ایک پیچیدہ نظام ہے جو اہتزاز کرنیوالے جسمیوں پر مشتمل ہوتا ہے"۔ اس کے ثبوت میں دیگر مختلف واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں چنانچہ مشابہ عناصر کے طیوف قدرتی یا مماثل گروہ بناتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ "نہ صرف کسی عنصر کا جوہر ذرات کے مشابہ مجموعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بلکہ اور مشابہ عناصر کے جوہر ذرات کے مشابہ گروہوں سے بنے ہوتے ہیں" اور مشابہ عناصر کے طیوف میں مشاہدہ کردہ اختلافات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ جوہر کے اندر ان گروہوں یا مجموعوں کی ترتیب کا انداز

مختلف ہوتا ہے۔ زی مان کے اثر (ZEEMAN'S EFFECT) سے بھی اس کی تصدیق کر سکتے ہیں اس نے بتایا کہ طاقتور مقناطیسی میدان میں طیفی خطوط دہرے تہرے شش خطی یا اس سے پیچیدہ تر ہو جاتے ہیں۔ اس کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے کہ مقناطیسی دباؤ کے تحت زیر جوہری ذرات کے اہتزازی اندازمیں اختلاف واقع ہوتا ہے چونکہ طیف کے مختلف حصو نپر (خطوط پر) مقناطیس کیوجہ سے مختلف اثر ہوتا ہے اس لئے طیف پیدا کرنے والے عنصر میں مختلف قسم کے ذرات موجود ہونے چاہئیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اعلیٰ تپش پر عنصر کے جواہر سادہ تر زیر جواہر (SUB-ATOMS) میں افتراق کرتے ہیں جو غالباً برقائے ہوتے ہیں۔ اسی طرح مشابہ عناصر میں متناظر خطوط پر مقناطیس کا یکساں اثر پڑتا ہے یعنی مشابہ عناصر کے جوہر وہیں بعض جیسے یا زیر جواہر مشترک ہوتے ہیں۔ پریسٹن (PRESTON) نے خوب کہا:-

"یہ مشاہدات اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ مادہ کی مختلف قسمیں یعنی معلومہ عناصر ایک ہی اساسی شئے سے خاص طریقے سے بنائی جا سکتی ہیں"

بیان بالا سے واضح ہو گیا ہوگا کہ مادہ کی تمام شکلیں ایک ابتدائی سادہ شئے سے ماخوذ ہیں اور اسکی افزونی پیچیدگی کے مختلف درجوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی کو عام طور پر غیر نامیاتی ارتقاء کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ عناصر کے بعض خواص اور ان کے طیوف کے مطالعہ سے ہم نے اس کو واضح کرنے کی کوشش کی اب بتائیں گے کہ کونیاتی کیمیا سے اس نظر کا کس طرح ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

کونیاتی مظاہر

اے، یم، کلارک (A.M. CLERKE) کے قول کے مطابق سورج ستارے نیبولے (NEBULAE) ایسے آسمانی تجربہ خانے ہیں جہاں ہم کیمیائی عناصر کی ماہیت اور باہمی تعلقات کی زیادہ صحیح تحقیق کر سکتے ہیں۔ ستاروں کے طیف کے مطالعہ سے ہم ان کی کیمیائی ساخت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ گرم ترین ستاروں میں جن کی تپش غالباً ۲۵۰۰۰° ہوتی ہے نسبتاً تھوڑے کیمیائی عناصر نظر آتے ہیں۔ ان سے کمتر تپش والے ستاروں میں خطوط طیف

زیادہ ہوتے ہیں اوران میں زیادہ عناصر پائے جاتے ہیں اگر گرم ستاروں کے سرد ہونے کے دوران میں ہر درجہ پر اُن میں نئے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں اور اسی طرح جب سرد ستارہ گرم ہونے لگتا ہے تو اُس میں سے چند عناصر غائب ہو جاتے ہیں اگر مختلف سورج اور ستارے ایک سلسلہ میں ترتیب دیئے جائیں تو نئے ہونے والے ستاروں میں عناصر کے ظاہر ہونے کا سلسلہ وہی ہے جو انکے بڑھتے ہوئے وزن جوہر سے ظاہر ہوتا ہے گرم ستاروں میں ہلکے عناصر پائے جاتے ہیں جیسے جیسے وہ ٹھنڈے ہوتے جاتے ہیں پیچیدہ اور بھاری عناصر وجود میں آتے ہیں عناصر میں زیادہ قیام پذیر شکل میں تبدیلی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس فرضیہ کے مطابق ہے کہ جواہر ذرات سے بنتے ہیں جو تپش کی کمی کے ساتھ پیچیدہ اور پیچیدہ تر مجموعے بناتے ہیں۔ کاربن غالباً مستثنیٰ ہے گو کہ اس کا وزن جوہر کم ہے لیکن اس کا سالمہ نہایت پیچیدہ ہوتا ہے۔ یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ وہ عنصر جو نامیاتی ارتقا، اور حیات کے لئے ضروری ہے غیر نامیاتی ارتقا میں سب سے آخر میں ظاہر ہوتا ہے۔ لاکی یر نے ستاروں کو اپنی کیمیائی ساخت کی افزونی پیچیدگی کے لحاظ مختلف گروہوں میں تقسیم کیا ہے، اسکی جدول نہایت دلچسپ ہے۔

(۱) گیسی ستارے   اعلیٰ ترین تپش   ہائیڈروجن ہیلیئم ایسٹریئم (ASTERIUM)

(۲) دھاتی ستارے   متوسط تپش   ہائیڈروجن ہیلیئم کسی قدر ہوتے ہیں۔
آکسیجن سلیکن میگنیشیم کیلیشیم۔ لوہا مینگنیز نکل تانبا وغیرہ

(۳) کاربنی ستارے   پست ترین تپش اور تاریک۔ بالاعناصر کے علاوہ کاربن اور اس کے مرکبات

ستاروں وسحابیوں کے طیوف کو مناسب طریقہ سے ترتیب دیکر لاکی یر نے ایک نظریہ پیش کیا۔ "کیمیائی جواہر ابتدائی بالائے جوہری (ULTRA-ATOMIC) گیس کی تکثیف کے دوران میں پیدا ہوئے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ غیر مرئی بھاپ سے بارش کے قطرات بن جاتے ہیں" ہائیڈروجن کے ظہور سے پہلے غالباً بعض اور ہلکے عناصر وجود میں آئے۔ اس کے بعد ہائیڈروجن و ہیلیئم سے لے کر یورانیم تک کے عناصر کا ایک سلسلہ پیدا ہو گیا۔ تپش کی مزید کمی سے پیدا شدہ عناصر آپس میں ملنے لگے، اور اس طرح سالمات، اور مرکبات کی تشکیل ہوئی۔ تپش کا اضافہ کر کے

غالباً اس عمل کو منعکس کیا جاسکتا ہے لیکن اتنی اعلیٰ تپش حاصل نہیں ہوئی جس سے عناصر کی تحلیل اور ان کا افتراق سادہ تر اجزا میں ہوسکے۔

زیر جوہری مظاہر

طیفی تشریح اور کونیاتی کیمیاء کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ تمام اشکال مادہ کا ابتدائی ماخذ یکساں ہے لیکن اس کی ماہیت کیا ہے اور اس کے خواص کیا ہیں؟ ان سوالات کا جواب مشکل ہے۔ کیمیا کی ایک جدید شاخ اس خصوص میں ہماری تھوڑی بہت رہبری کرتی ہے اس سے ہماری مراد زیر جوہری کیمیا (Sub Atomic Chemistry) سے ہے اس میں وہ تمام حالیہ تحقیقات شامل ہیں جن سے مادہ کی ساخت پر بہت کچھ روشنی پڑی۔ مثلاً کیتھوڈ شعاع۔ لاشعاع۔ تابکاری۔

گولڈ اسٹائن (Goldstein) نے خلائی نلی میں کیتھوڈ شعاع کا مشاہدہ کیا۔ اس نے خیال کیا کہ یہ بعض قسم کے ایتھری تموج ہیں لیکن سر ولیم کروکس نے ان کو "اشعاعی مادہ" کے ذرات قرار دیا سر جے۔ جے۔ تھامسن نے بتایا کہ کیتھوڈ شعاع منفی طور پر برقائے ہوئے ذرات ہیں یا ایسے جیسے جو خلائی نلی کے اندر والی گیس کے جواہر کے استحالہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر ذرہ کی برقی بار (Charge) تمام معلوم برقی باروں سے کمتر ہوتی ہے۔ پس ہر ذرہ کو برق کا جوہر یا "برقیہ" سمجھ سکتے ہیں۔ برقیہ کی کمیت سر جے۔ جے۔ تھامسن کے تجربات سے ہائیڈروجن جوہر کی تقریباً ۱۸۴۰ ویں کسر ہوتی ہے۔ چونکہ برقیہ کا وزن تمام معلومہ عناصر کے اوزان سے ہلکا ہے اس لئے قرین قیاس تھا کہ عناصر کی ساخت کو برقیوں پر مشتمل سمجھی جائے۔ اس خیال کو اس واقعہ سے بھی تقویت ہوئی کہ خلائی نلی کے اندر خواہ کوئی گیس استعمال کی جائے یا کسی قسم کا برقیرہ رکھا جائے یکساں قسم کے کیتھوڈ ذرات (زیر برقیری ذرات) خارج ہوتے ہیں۔ یعنی برقیے مادہ کے مختلف اشکال کے مشترکہ اجزاء ہیں پس لارمور (Larmor) نے اعلان کیا "مادہ برقیوں کے گروہوں پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے اطراف مدوری حرکت کرتے ہیں"۔

رونٹگن (Rontgen) نے برقیوں کی ایک عجیب خاصیت معلوم کی جو علمی نقطۂ نظر سے بہت

اہم ثابت ہوئی۔ برقیے جب مادہ سے ٹکراتے ہیں تو لاشعاع پیدا ہوتے ہیں یہ نور کے مانند بہت چھوٹے طول موج کے تموجی اہتزازات ہیں۔ نور کے مانند ان میں انعطاف تقطیب اور انتشار ہوتا ہے اگر لاشعاع کی ذاتی سطح پر گرایا جائے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں اہتزاز پیدا ہو جاتا ہے اور معین طول موج کی مخصوص شعاع خارج ہوتی ہیں اس قسم کے اشعاع کا انحصار دھات کی نوعیت پر ہوتا ہے اسی کو لاشعاعی طیف کہتے ہیں۔ موزلے (Moseley) نے اکثر دھاتوں کے لاشعاعی طیف کا امتحان کیا اس نے بتایا کہ اکثر عناصر کی صورت میں طول موج وزن جوہر کے ساتھ گھٹتا جاتا ہے۔ لیکن اس طرح ترسیم کھینچنے پر سیدھا خط حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تعداد اہتزاز کے مربع کو طبعی اعداد کے بالمقابل مرتسم کیا جائے تو منحنی سیدھا ہوتا ہے۔ طبعی اعداد کو اعداد جوہر (Atomic number) کہا جاتا ہے۔ اور یہ اعداد جدول ادوار عناصر میں ان کے مقام سے مطابق ہوتے ہیں۔ موزلے نے بتایا کہ عدد جوہر سے حقیقت میں مرکز کے اندر پائے جانے والے آزاد برقیاروں کی تعداد مراد ہے اور یہ وزن جوہر کے مقابلہ میں عنصر کے لئے زیادہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ہائیڈروجن سے لیکر یورانیم تک اعداد جوہر ۱ تا ۹۲ ہوتے ہیں اس سے خود غیر نامیاتی ارتقاء کی تائید ہوتی ہے۔

لاشعاع کے انکشاف کے تھوڑے دنوں بعد بیکرل نے (Becquerel) یورانیم میں تابکاری کی خاصیت دریافت کی اس کے بعد بہت سے تابکار عناصر کا وجود معلوم کیا گیا جن میں سب سے مشہور ریڈیم ہے۔ تابکار اشیائے سے خاص شعاع خارج ہوتے ہیں جنھیں الفا۔ بیٹا۔ جیما شعاع کہتے ہیں بیٹا شعاع حقیقت میں آزاد اڑنیوالے برقیے ہیں اور جیما شعاع غیر مادی ایتھری تموج ہیں جو بیٹا شعاع کے ٹکرانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ روتھرفورڈ (Rutherford) نے بتایا کہ الفا شعاع مثبت برقی ذرات ہوتے ہیں۔ ان کی کمیت ہیلیم جوہر کے برابر ہوتی ہے اور ان پر دو مثبت بار ہوتی ہے۔ روتھرفورڈ و ساڈی نے تابکاری کی توجیہ کے لئے نظریۂ انحلال (Theory of Disintegration) پیش کیا جس کی رو سے تابکار عناصر کے جواہر میں تغیر واقع ہوتا ہے وہ تحلیل ہو کر مسلسل طور پر الفا۔ بیٹا شعاع خارج کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے وزن میں کمی ہوتی ہے اور نئے عناصر وجود میں آتے ہیں۔ تابکاری کے واقعہ نے

جہاں عناصر کی تبدیلی اور استحالہ کو ممکن ٹھہرایا وہیں مادہ کی ساخت پر نئی روشنی ڈالی۔

عہ شعاع میں انتشار (Scattering) کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ سی۔ٹی۔آر۔ ولسن (C.T.R. Wilson) نے عہ شعاع کے راستوں کا عکس لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہ شعاع ہوا میں ایک خاص فاصلہ تک گزرنے کے بعد اپنے راستے سے اچانک طور پر مڑ جاتے ہیں۔ روتھر فورڈ نے اس کی توجیہ اس طرح کی کہ عہ ذرات اس وقت تک اپنا راستہ مستقیم رکھتے ہیں جب تک کہ کوئی مزاحم مثبت بار حائل نہ ہو جائے جو مادی جوہر کے اندر ہوتی ہے۔ روتھر فورڈ کے اس خیال سے مادہ کی ساخت کا جدید نظریہ مکمل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سر جے۔ جے۔ تھامسن نے اپنا مشہور نظریہ جسمیات (Electronic Theory of Matter) پیش کیا اسی کو نظریہ برقیات (Corpuscular Theory) کہا جاتا ہے اس کا بیان ہے: "ہر عنصر کا جوہر منفی طور پر برقائے ہوئے برقیوں کی بڑی تعداد پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ مثبت برق بھی ہوتی ہے، جو تمام برقیوں کی منفی بار کے مجموعہ کے معادل ہوتی ہے اور اس طرح برقی طور پر تعدیلی جوہر پیدا ہوتا ہے"۔ روتھر فورڈ نے تھامسن کے جوہر کے مثبت برقی حصے کی توضیح کی۔ اس نے بتایا کہ جوہر کے دو حصے ہوتے ہیں۔ (۱) مرکزہ جس پر مثبت برقی بار ہوتی ہے مرکزہ کا حجم بہت کم ہوتا ہے لیکن جوہر کی کمیت کا پورا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ مرکزہ میں برق پارے (Protons) ہوتے ہیں۔ (۲) مرکزہ کے گرد مداری حرکت میں منفی برقیئے ہوتے ہیں۔

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ معمولی جواہر برقیوں کے چھوٹے چھوٹے پیچیدہ نظام ہیں۔ مختلف عناصر کے خواص انہی ذروں، جوہری برقیوں کی تعداد اور ان کی ترتیب پر منحصر ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم تابکار عناصر کی خاصیت کی بھی توجیہ کر سکتے ہیں۔ تابکاری جوہری خاصیت ہے، غیر قیام پذیر بھاری جواہر کی تحلیل شعاع کے اخراج کے ساتھ ہوتی ہے جو فی الحقیقت مادی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ تابکار عناصر بے اختیار طور پر کئی درمیانی درجوں میں سے گزر کر قیام پذیر عناصر میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ پس تابکاری عناصر کے تنزل (Disintegration) کا مظہر ہے فلکیاتی طبعی مشاہدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرد ہونے والے ستاروں میں غیر نباتی ارتقاء واقع ہوتا رہتا ہے۔

زیر جوہری مظاہر کے مطالعہ سے معلوم ہو چکا کہ مادہ اور برق یک ذات و متجانس ہیں مادی عناصر کے مبدا برقیے ہیں لیکن برق کے متعلق حال میں بہت سی تحقیقات کی گئیں عموماً یہ فرض کیا جاتا ہے کہ برق ایتھر کا مظہر ہے اور جوہر برقیوں سے بنا ہوا ہے پس جے لارمر Larmor کے الفاظ میں جواہر ایتھری قوتوں کے مظہر ہیں یا مادہ ایتھر سے بنا ہوا ہے اور برقیوں کو ایتھر کے اندر برقائی قوتیں اور حلقے سمجھنا چاہئے ۔ جب ایتھر حلقوں میں تکثیف کرتا ہے تو تمام سمتوں میں فاصلہ کی کمی کی وجہ سے ایک تناؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور ان حلقوں کے درمیان باہمی اتصال پیدا ہوتا ہے ۔ اس طرح کشش یا تجاذب کا اظہار ہوتا ہے جو مادہ کی اساسی خاصیت سمجھی جاتی ہے ۔ الغرض ہم مادہ ۔ برق اور ایتھر کے اندرونی تعلق کو حسب ذیل طریقہ سے ظاہر کر سکتے ہیں :-

ایتھر ⇌ برقیے ⇌ جواہر ⇌ سالمات ⇌ کثیف مادہ

Matter en masse ⇌ Molecules ⇌ Atoms ⇌ Electrons ⇌ Ether

مادہ برق اور ایتھر کی باہمی تبدیلی دوری عمل کو ظاہر کرتی ہے یعنی مادہ کی تخلیق و تخریب کو دوری باہم متعاکس ہوتی ہے پس عناصر کا انجام نامعلوم ہے، ان میں انحطاط و ارتقا ہر دو واقع ہوتے رہتے ہیں یہ عمل لاانتہائی زمانوں سے چلا آرہا ہے، نہ معلوم کب تک چلتا رہے گا ۔

حسنِ ملیح

از جناب مولوی محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ایم۔ اے (عثمانیہ)

یوں تو ظاہر میں صباحت نہیں چہرے پہ ترے
نہ فروزاں ہے ترے گوش میں دُرِ شہوار
اور تو اور بشاشت نہیں چہرے پہ ترے
حسن کے واسطے سنتے ہیں کہ ہیں سولہ سنگھار

یوں تو عالم میں حسیں دیکھے ہزاروں ہیں نے
لیکن اتنا تو کسی سے بھی مجھے ربط نہ تھا
بات یہ کیا ہے کہ آنکھیں نہیں اٹھتیں تجھ سے
تجھ میں وہ کونسا جادو ہے بھرا یہ تو بتا

کیا حیا ہے تو کہ آئی ہے مجسم ہو کر
کیا تو آوازِ حسیں ہے کہ بنی ہے انساں
کیا کوئی حور ہے تو آئی ہے جوگن بن کر
راکھ مل کر ہے کیا حسن کو اپنے پنہاں

کیا تو ہی روح کوئی آئی ہے جو ہو کے خفا
کسی نازک سے بدن سے کہ تھا پابندِ قیود
یہ سبب کیا تری افسردگیٔ دل کا ہوا
نہ چمکتا تھا کثافت میں ترا رنگِ نمود

گرچہ چلتا ہے نمایش ہی سے ہستی کا پتا
ذرّہ ذرّہ بھی چمکتا ہے تڑپ کر پیہم
تو مگر چہرے پہ پردہ نہ ملاحت کا ہٹا
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ جل جائے نظامِ عالم

اسد خاں لاری

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ

اسد خاں لاری وزیر بیجاپور دکن کی ایک بہت بڑی شخصیت ہے اس کی بیمثال وفاداری و تدبیر مملکت تاریخ دکن تو کیا تمام ہندوستان کی تاریخ میں جواب نہیں رکھتی۔ عجیب اتفاق ہے کہ دکن میں قصبہ لار کے بیشمار آدمی آئے اور انہوں نے دکن میں بڑی بڑی خدمات انجام دیکر شہرت حاصل کی جس طرح دکن میں ہر طرف سے کار آمد آدمی آتے تھے اور دکھنی سلاطین کی خدمت اختیار کرتے تھے اسی طرح لار سے بھی دکن میں بہتیرے آدمی آئے اور اپنی غیر معمولی وفاداری اور اور جانبازی کا ثبوت دیا۔ ان میں اسد خاں لاری، عبدالرزاق لاری، ملا محمد لاری مشہور ہستیاں ہیں۔ لار کا قصبہ جو گورکھپور میں دریائے گھاگھرا کے کنارے واقع ہے قدیم زمانہ سے مردم خیز رہا ہے، گوتم بدھ یہیں پیدا ہوئے تھے، یہاں مسلمانوں کی آبادی اس زمانہ سے شروع ہوئی ہے جبکہ سندھ میں عرب سلطنت کا زوال ہوا جس زمانہ میں بغداد کی خلافت کمزور ہوگئی اور عرب حکومت میں زوال آگیا تو سندھ کے عربوں پر بھی عرصہ زندگی تنگ ہوگیا اور اکثر عراقی اور ثقفی خاندان سندھ کو خیرباد کہکر گورکھپور میں آباد ہوگئے، چنانچہ لار کی اکثر مسلمان آبادی انہیں عراقی خاندانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں افغان، ترک آکر شامل ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں جو نامور شخصیتیں پیدا ہوئیں وہ انہیں خاندانوں کی اولاد ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ لاریوں نے صرف خطہ دکن ہی کو اپنی جولانگاہ بنایا تھا۔ ہندوستان کے دوسرے خطوں میں ان کا کہیں نام نہیں [illegible]

اس کی ایک یہ وجہ تو ظاہر ہے کہ یہاں کے سلاطین لایق آدمیوں کی خاطر خواہ سرپرستی کرتے تھے جو لوگ باہر سے آتے تھے ان کی قابلیت کے مطابق کام دیکر ترقی کرنے کا موقعہ دیتے تھے۔

دکھنی سلطنتوں کی سیاسی حالت

جب پندرھویں صدی کے آخر میں سلطنت بہمنی کا شیرازہ بکھر گیا جو تمام دکن پر چھائی ہوئی تھی تو اس کے کھنڈروں پر پانچ سلطنتیں قایم ہوگئیں ان سلطنتوں میں بیجاپور کی سلطنت جو ۱۴۸۹ء میں خود مختار ہوئی سب میں پیش پیش تھی۔ بانی سلطنت یوسف عادل شاہ سے لیکر آخری زمانہ تک یہاں کے حکمراں بڑے زبردست دل و دماغ کے آدمی گزرے ہیں یہ لوگ نہ صرف خود لائق تھے بلکہ لایق آدمیوں کی جو باہر سے آتے تھے قدر کرتے تھے اور انکی خدمات سے فائدہ اٹھاتے تھے، اگرچہ ان باہر والوں سے نقصان بھی پہنچا لیکن فائدہ بھی پہنچا اس کے علاوہ دکن کی جس سمت میں سلطنت بیجاپور قایم ہوئی تھی وہ مغربی گھاٹ تھے اور یہ جنوب ہند کا وہ خطہ ہے جو کونکن کے نام سے مشہور ہے، یہاں کی کوہستانی آبادی بہت جنگجو اور جفاکش تھی یہی وہ خطہ ہے جہاں سے مہٹے پیدا ہوئے اور ترقی کرتے کرتے انہوں نے ہندوستان کے اندر ایک اودھم مچادی ان مرہٹوں اور برگیوں کی سب سے پہلی ترقی اسی سلطنت بیجاپور کی سرپرستی میں ہوئی تھی، اسی سلطنت نے سب سے پہلے ابراہیم عادل شاہ اوّل کے عہد میں مرہٹی زبان کو رواج دیا تھا۔ اس کے علاوہ ان بادشاہوں نے مرہٹہ عورتوں سے شادیاں بھی کیں، چنانچہ یوسف عادل شاہ کی بیوی ایک مرہٹہ عورت تھی جس کا نام بوبجی خاتون تھا، ان اسباب کی بنا پر بیجاپور کا اپنی دوسری سلطنتوں پر زیادہ طاقتور ہونا ایک قدرتی بات تھی۔

یہ عام فائدے جو بیجاپور کو حاصل تھے وہ احمد نگر اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کو حاصل نہیں تھے۔ اس سے یہ سلطنتیں بیجاپور کے مقابلہ میں بہت کمزور رہیں اور ان کا اتنا شاندار عروج نہیں ہوا۔ جتنا بیجاپور کا ہوا۔ برار اور بیدر کا تو کوئی ذکر نہیں۔ رقبہ کے اعتبار سے یہ اتنی چھوٹی سلطنتیں تھیں کہ بیجاپور سے ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، البتہ ضمیمہ کے طور پر

یہ ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوکر رقیبوں کی طاقت بڑھاتی ہیں۔ چونکہ یہ سلطنتیں پاس پاس واقع ہوئی تھیں اور ایک ہی کتاب کے مختلف اوراق تھیں، اس لئے قدرتی طور پر ان میں باہم جنگ و جدل ہونا ضروری تھا، کبھی تو ان کی لڑائی کا ماحصل دکھنی اور غیر دکھنی رقابت ہوتی تھی، کیونکہ احمدنگر کا نظام شاہی خاندان دکھنی تھا اور بیجاپور و گولکنڈہ کے خاندان غیر دکھنی تھے کبھی یہ لڑائی مذہبی اختلاف کی وجہ سے ہوئی، کیونکہ احمدنگر کا مذہب عرصہ تک سنی رہا اور دوسری سلطنتیں شیعہ تھیں۔ اور احمدنگر کی سنی سلطنت شیعہ سلطنتوں کے خلاف جنگ و جدل کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی، کبھی ان میں علاقوں کی نزاع ہوتی تھی سرحدی مقامات اور علاقوں کے لئے یہ سلطنتیں بارہا میدان میں آتی تھیں ان کے علاوہ قدرت کی سلطنت بیجانگر کی ایک اور طاقت تھی جو ان تمام اسلامی سلطنتوں کا تمام دکن پر ہندو پرچم اڑانا چاہتی تھی اسلامی سلطنتوں کو وقتاً فوقتاً اس ہندو سیلاب کی مدافعت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان تمام نزاعوں کی تہ میں "توازن قوای" کا مسئلہ کام کرتا تھا یعنے کمزور سلطنتیں آپس میں متحد ہوکر طاقتور سلطنت کو اس غرض سے نیچا دکھایا چاہتی تھیں کہ وہ غیر معمولی طاقت فراہم کرکے دوسروں کے لئے خطرناک نہ بن جائے۔ یہ اصول توازن دنیا کی ہر تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یورپ کی تاریخ تو اسی توازن قوت کی جنگ و جدل سے بھری ہوئی ہے۔

چونکہ اوائل میں سلطنت بیجاپور ہی سب میں پیش پیش تھی اور اس کے اولین حکمراں یعنے یوسف عادل شاہ اور اسمعیل عادل شاہ کے عہد حکومت میں اس سلطنت کا طوطی بولتا تھا تمام دکھنی سلطنتیں اس طاقت کو توڑنے کے درپے ہوتی تھیں چنانچہ ان سلطنتوں نے مختلف پہلوؤں سے بیجاپور پر حملہ کیا، اور بیجاپور کو بارہا ان حملوں کی مدافعت کرنی پڑی۔ بیجاپور پر ایسی گھنگھور گھٹائیں بارہا چھائی ہیں اور بیجاپور نے اپنے وفادار مدبروں کی مدد سے نہ صرف ان بادلوں کو ہٹایا بلکہ اپنی طاقت برابر بڑھائی۔ اگرچہ دکن کی تاریخ جنگ و جدل کی انہیں داستانوں سے پر ہے، لیکن اس تاریخ کا اگلا حصہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے اس اگلے حصہ کو ہم بتائے

سلطنت بیجا پور سے لیکر ۱۵۴۲ء تک قرار دے سکتے ہیں اسوقت تک اسد خاں اس سلطنت کی خدمت کررہا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ بیجا پور کی سلطنت انتہائی عروج پر تھی اور تمام سلاطین دکن اس کو کمزور کرنے کی ناکام کوشش کرتے تھے لیکن یہ کمزور نہیں ہوئی۔ گویا اس زمانہ کی تاریخ دکن صرف بیجا پور کی تاریخ ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں اسد خاں لاری کی صدارت اور سپہ سالاری بیجا پور کی پشت و پناہ تھی۔

اسد خاں کی ترقی اسد خاں کا اصل نام خسرو آقا تھا، قومیت کے اعتبار سے یہ ترک تھا لیکن فرشتہ کے الفاظ میں یہ "لاری الاصل بود" اس کی ترقی اسمٰعیل عادل شاہ کے عہد میں ہوئی سنہ ۱۵۱۰ء میں یوسف عادل شاہ کا انتقال ہوا۔ چونکہ اس کے انتقال کے وقت اس کے بیٹے اسمٰعیل کی عمر صرف (۱۲) سال کی تھی اس لئے مرحوم نے اپنے سامنے وزیر اعظم کمال خاں کو متولی سلطنت بنادیا تھا تاکہ اسمٰعیل کی کمسنی میں حکومت کا کام اطمینان سے چل سکے، لیکن کمال خاں کی خود غرضی اور بیوفائی نے خانہ جنگی کی بدترین صورت پیدا کردی۔ اسمٰعیل کی ماں پونجی خاتون کی تدبیر اور دلیری نے ان نازک حالات کی یکسوئی کردی، ورنہ خاندان شاہی کا مٹ جانا اور کمال خاں کا مالک سلطنت ہوجانا کوئی بات نہ تھی۔ پونجی خاتون نے نہایت بڑی پتیا سے اس مشکل کے حل کرنے کے لئے چند وفاداروں کو اپنے گرد جمع کرلیا اور ایک کو کمال خاں کے قتل کے لئے مقرر کیا، جونہی کمال خاں کا قلعہ ارک میں خاتمہ ہوگیا اس کے بیٹے صفدر خاں نے اپنی باپ کی فوج سے شاہی محل کا محاصرہ کرلیا جہاں پونجی خاتون اور اسمٰعیل مقیم تھے اس اڑے وقت کام آنے والے بہت سے وفادار لوگ تھے، منجملہ ان کے اسد خاں لاری بھی تھا، جب صفدر خاں محاصرہ میں پتھر کے صدمہ سے مرگیا تو اسمٰعیل کی بلا ٹل گئی اور اسمٰعیل کی خود مختار حکومت قائم ہوگئی جن وفاداروں نے اس آڑے وقت جان پر کھیل جانے سے دریغ نہیں کیا تھا ان کو بیش بہا انعامات دئے گئے، اسی سلسلہ میں خسرو کو بھی اسد خاں کا خطاب اور جلگام کی جاگیر دی گئی اور جب اس کے کارنامے چمکنے لگے یہ سپہ سالار اور ذی رتبت وزیر بنایا گیا۔

اسد خاں کی قابلیت

اگرچہ اسمعیل عادل شاہ کا تخت بیجاپور پر جلوس کرنا اسد خاں کا بڑا کارنامہ تھا لیکن اسکی تمام زندگی اسی قسم کے وفادارانہ کارناموں سے پر ہے، ایک تو اس کی حیرت انگیز وفاداری اس کو اپنے ملک اور مملکت کی ہر بڑی سے بڑی خدمت کرنے پر آمادہ کرتی تھی اور ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار کرتی تھی اس کے علاوہ سچی بات یہ ہے کہ اسد خاں اپنے زمانہ کا بہت بڑا مدبر تھا۔ اس زمانہ میں یہی ایسا شخص تھا جو دکن کی سیاست کو خوب سمجھتا تھا کہ بساط دکن کے کتنے مہرے ہیں اور وہ کیا چالیں چلتے ہیں اور بیجاپور کو کیا چال چلنی چاہئے، اسکی سیاسی پیچ اور دوربینی نے اس کو تدبر کے اس درجہ پر پہنچا دیا تھا کہ تمام دکن اس کا لوہا مانتا تھا۔ وہ اس بات کو خوب سمجھا ہوا تھا کہ ایک طرف مسلمان سلاطین کی باہمی رقابت، دکن کے لئے خطرناک ہے دوسرے طرف جنوب کی سلطنت بیجانگر کی طاقت علیحدہ قابل غور ہے، یہ بالکل صریح بات تھی کہ اگر بیجانگر کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ ہندو سلطنت مسلمانوں کو گھن کی طرح کھا جاتی اور بیجانگر کو اس نتیجہ تک پہنچنے میں کچھ دیر بھی نہیں لگتی تھی کیونکہ مسلمان سلاطین اپنی باہمی رقابت سے خود بخود کمزور ہو رہے تھے اور ان کو اس ہندو سلطنت کی طاقت کا کوئی احساس نہ تھا

اس سیاسی راز کو سب سے پہلے اسد خاں نے معلوم کیا تھا چنانچہ اس نے سب سے پہلے اسی مسئلہ کی طرف توجہ کی اور بیجانگر کے خلاف سلاطین دکن کے اتحاد کی بنیاد ڈالی اور حکمت عملی یہ قرار دی کہ سلاطین دکن کو آپس میں متحد کر کے ایک طرف تو خود ان کی طاقت کو قائم رکھے اور دوسری طرف اس اتحاد سے ہندو طاقت کو آگے بڑھنے نہ دے، اگرچہ اسد خاں کا منصوبہ اس کی زندگی میں کامیاب نہیں ہوا اور بیجانگر کی طاقت نہیں ٹوٹی تاہم اس حکمت عملی کا سہرا اسی کے سر ہے اور سب سے پہلے اسی شخص نے سلاطین دکن کے اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ اور ہم یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں سنہ ۱۵۶۴ء کا اتحاد جو اسد خاں کے مرنے کے کئی سال کے بعد ہوا اور اس اتحاد نے آخر کو بیجانگر کا خاتمہ کر دیا صرف اسد خاں کے منصوبہ کی تکمیل تھی، یہ منشا اسکا اگرچہ اس کی زندگی میں کامیاب نہیں ہوا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ سنہ ۱۵۶۵ء کی جنگ

تالیکوٹ میں اسی کی روح کام کرتی تھی۔ ہندو خطرہ کے متعلق جو اس نے احساس پیدا کیا تھا وہ برابر زندہ رہا اور کام کرتا رہا۔ اسد خاں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وجیانگر کے خاتمہ سے نہ صرف سلاطین دکن کو اطمینان نصیب ہوگا اور یہ آرام کی نیند سو جائینگے، بلکہ بیجاپور کو جس کی سرحد بیجانگر سے ملتی ہے بہت فائدہ پہنچیگا۔ چنانچہ جنگ تالیکوٹ کے بعد کرناٹک کا ایک بہت بڑا حصہ بیجاپور کو ملا، اس سے بیجاپور کو جو مالی اور جغرافی فائدے پہنچے ہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کرناٹک کے فتوحات کی ابتدا علی عادل شاہ نے جنگ تالیکوٹ کے بعد ہی کردی تھی، اور یہ رفتہ رفتہ محمد عادل شاہ کے عہد میں جاکر بہت وسیع ہوگئی، اور کرناٹک کی فتوحات اور وسعت سے بیجاپور کی سلطنت کو چار چاند لگ گئے، بیجاپور کی اس تمام عظمت کا سہرا اسد خاں کے سر ہے، اور بیجاپور کی تاریخ و سلطنت اس کے احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی، بیجاپور نے اپنی آپ حفاظت اور اپنی توسیع و ترقی میں جو فائدہ اٹھایا وہ سب اسد خاں کے منصوبے اور حکمت عملی کی تکمیل تھی۔

اسد خاں کی یہ تدبیر اور ہمہ گیر قوت عمل دکن پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ سیاست دکن کی تمام طاقتیں اسی کے ہاتھ میں سمٹی ہوئی تھیں، اور دکن کی تمام طاقتیں اپنی گرہ کشائی کے لئے اسکی تائید اور شرکت ضروری سمجھتی تھیں، نہ صرف مسلمان سلاطین بلکہ پرتگالی بھی اس سے مرعوب تھے یا تو سلاطین دکن بیجاپور کے خلاف اس کو اپنے ساتھ ملانیکی ناکام کوشش کرتے تھے، ناکام ہوکر چپ چاپ بیٹھ جاتے تھے کیونکہ جہاں اسد خاں کا تدبر ہوتا تھا اس کے مقابلہ میں کوئی طاقت آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ ایک دفعہ تو پرتگالیوں نے صاف کہدیا کہ جب تک اسد خاں ہمارے ساتھ نہ ہوگا ہم بیجاپور کے خلاف کوئی جنبش نہیں کرسکتے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسد خاں اپنے زمانہ میں دکن کی سیاست کا مالک تھا۔

اسد خاں کے کارنامے سنہ ۱۵۲۰ء کے بعد سے دکن میں بیجاپور کے خلاف جتنے معرکے ہوئے ان میں بیجاپور کی رہنمائی کرنے والا صرف یہی شخص تھا اور اس کی

شرکت سے نہ صرف بیجاپور اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب رہا بلکہ آیندہ زمانہ کے لئے ایک حکمت عملی مشخص ہو گئی۔ جب سنہ ۱۵۲۰ء میں اسمعیل عادل شاہ کو والئی بیجانگر کے مقابلہ میں رائچور پر جو دونوں سلطنتوں کے درمیان استخوان جدال تھا شکست ہو گئی تو اسد خاں جو پہلے سے ہندو سلطنتوں کے خطرہ کو محسوس کرتا تھا اس گتھی کو سلجھانے کے لئے آگے بڑھا اور اس زمانہ کی بڑی سلطنتوں کو بذریعہ ازدواج آپس میں متحد کرنے کی کوشش کی تا کہ ہندو خطرہ کی خاطر خواہ مدافعت ہو سکے۔ اس کی کوششوں سے برہان نظام شاہ کی اسمعیل کی بہن مریم سلطان سے شادی ہو گئی، دکن کی سیاست میں یہ اسد خاں کا پہلا قدم تھا جو اگرچہ اس وقت کامیاب نہیں ہوا، لیکن اسی بنا پر سنہ ۱۵۶۴ء میں کامیاب ہوا۔ بیجاپور اور احمدنگر کی رقابت اس شادی سے دور نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ شولاپور جو مریم کے جہیز میں دیا جانا ٹھیرایا تھا اس کو اسمعیل نے پورا نہ کیا تو سنہ ۱۵۲۱ء میں جنگ چھڑ گئی۔ برہان نظام شاہ نے والی برار عماد شاہ کی مدد سے شولاپور پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنی فوجوں سے اس اتحاد کا مقابلہ کیا پہلے عماد شاہ کو شکست ہو گئی اور یہ بھاگا تو برہان کو بھی میدان چھوڑنا پڑا۔ اسد خاں نے مفرورین کا پرینڈہ تک تعاقب کیا، اس فتح میں جو ہاتھی مال غنیمت میں ملے تھے، ان میں سے اکثر اسد خاں کو دئے گئے، اس شرم کو مٹانے کے لئے برہان نے دوسرے سال پھر حملہ کر دیا اور اس میں بھی اس کو شکست ہو گئی، اور سب سامان غنیمت بیجاپور کو ملا۔

چونکہ ان پہلی لڑائیوں میں برار کی حکومت نے نظام شاہی حکومت کا ساتھ دیا تھا اس لئے اسد خاں نے برار کو بیجاپور سے ملانے کی کوشش کی تاکہ اس سے نہ صرف بیجاپور طاقتور ہو جائے بلکہ نظام شاہیوں کو بیجاپور سے ٹکرانے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ ازدواج کے ذریعہ اس نے اتحاد کر دیا اسمعیل کی بہن خدیجہ سلطان کی علاء الدین عماد شاہ سے شادی کر دی۔ اگرچہ یہ اتحاد بہت دیرپا ثابت نہیں ہوا لیکن یہ ایک بڑے عرصہ کے لئے بیجاپور کے لئے مفید ثابت ہوا۔

بیدر کی تسخیر۔ بیدر کی تسخیر اسد خاں کے بڑے کارناموں میں شمار کی جا سکتی ہے، بریدی

خاندان اپنی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے دکن میں مشہور تھا، اسی خاندان کا سیاسی نفاق دکن کی تمام سیاسی فضا، کو گندلا کرتا تھا۔ آخر برید نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے ہمیشہ یہ کیا کہ دکن کے ایک نہ ایک حکمراں کو ملا کر دوسرے کے خلاف لڑائی کھڑی کر دی اور جنگ وجدل کا بازار گرم کر دیا اسد خاں نے اس امر کو مدنظر رکھ کر بریدی خاندان سے بیجاپور کا اتحاد جوڑنے کی کوشش کی تاکہ دکن کی باہمی رقابت کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن امیر برید کی دور بینی نے اس پاکیزہ مقصد تک پہنچنے نہیں دیا اور آخر کو بیجاپور نے ہی مناسب سمجھا کہ بیدر پر حملہ کر کے اس منافقانہ طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، چنانچہ ۱۵۳۹ء میں بیجاپوری فوج نے بیدر پر حملہ کر دیا اس حملہ اور تسخیر بیدر میں اسد خاں نے جو حصہ لیا تھا اس کو بیجاپور کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہی اسد خاں ہے جس نے شبخون مار کر امیر برید کو گرفتار کر لیا اور بیدر کی تسخیر بیجاپور کے لئے ایک معراج ترقی بنی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ بیدر کی تسخیر خود ایک کامیابی اور ایک جغرافی اضافہ بنا اور بیدر کا قلعہ بیجاپور کے مشرقی حدود کی حفاظت کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا بلکہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ بریدی خاندان کا زوال نہ صرف بیجاپور بلکہ دکن کے لئے صدائے امن تھی، اس سے ایک طرف بیجاپور کی طاقت مضبوط ہو گئی اور دوسرے احمد نگر کی تائید کے لئے کوئی طاقت باقی نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک امیر برید زندہ رہا اور اس کے بعد اس کے جانشینوں نے برابر ریشہ دوانیاں کیں اور ان کو ریشہ دوانیوں کا اس وجہ موقعہ ملتا تھا کہ ان کو معاف کر دیا گیا تھا اور بعد کو بیدر کا قلعہ ان کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن اس زوال کے بعد اس خاندان کا پرانا وقار اور طاقت باقی نہیں رہی جو ان کو پہلے حاصل تھی اس کے علاوہ بیجاپور کو بیدر کی تسخیر سے بہت کچھ مال غنیمت حاصل ہوا۔ اور یہ سب اسد خاں کی تدبیر کی بدولت تھا۔

یہی بیدر کی کامیابی تھی کہ اسکے بعد اسمٰعیل عادل شاہ بیجانگر پر حملہ کرنے کے قابل ہو گیا چنانچہ ۱۵۲۰ء میں رائچور اور مدگل پر حملہ کر کے ۱۵۱۰ء کے نقصان اور افسوس کی تلافی کی گئی

اور اس کامیابی کا سہرا بھی اسد خاں کے سر تھا چنانچہ اس موقع پر اسد خاں کی تمام خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ اور اس فتح رائچور کے بعد جو مجلس نشاط منعقد کی گئی تو اس میں اسد خاں کو بیٹھنے کا حکم دیا گیا اور خود بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے اس کو جام شراب عنایت کیا اور یہ اخلاص کا بہت بڑا اعزاز تھا جو اس کو تمام بیجاپوری وزرا اور امرا میں حاصل ہوا تھا۔

ابراہیم عادل شاہ اوّل کی تخت نشینی

عین کامیابیوں کے دوران میں ۱۵۳۴ء میں اسمٰعیل عادل شاہ کا انتقال ہوا تو اس وقت بھی اسد خاں کی وفاداری اور تدبیر کی ضرورت پیش آئی، اگر اس وقت اس کی وفاداری کام نہ کرتی تو بیجاپور کی پچھلی عظمت اور اسکی کوششوں کا ثمرہ خاک میں ملجاتا۔ اسمٰعیل عادل شاہ مرحوم کی وصیت کے مطابق ملو عادل شاہ کو تخت نشین کیا گیا تو بیجاپور کے زوال کی بھیانک صورت دکھائی دیتی تھی کہ اگرچہ ملو مرحوم کا بڑا بیٹا تھا۔ لیکن اس کی نالائقی و بدلطواری نے ملک کے اندر ایک سنسنی پھیلا دی، اور ہر ذی فہم شخص محسوس کرتا تھا کہ اگر ملو ہی برسر حکومت رہا تو بیجاپور کا خاتمہ ہوجائیگا اس وقت اسد خاں نے ملو کو تخت سے اتارنا ضروری سمجھا چنانچہ اس نے مرحوم بادشاہ کی وصیت کو بالائے طاق کر کے ملو کو تخت سے اتار دیا اور اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم عادل شاہ اول کو تخت نشین کر دیا ابراہیم کی تخت نشینی بیجاپور کے لئے ایک آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ جس طرح اسد خاں کی خدمات اسمٰعیل عادل شاہ کی تخت نشینی کے لئے ضروری اور ناگزیر تھیں اسی طرح ابراہیم کی تخت نشینی کے لئے ضروری تھیں اور یہ اسد خاں کا بہت بڑا کام تھا، اگر بیجاپور نے ابراہیم کے عہد میں گزشتہ زمانہ سے زیادہ ترقی نہیں کی تو کم از کم اپنی پچھلی عظمت کو ضرور برقرار رکھا۔

اسد خاں کا زوال

ان تمام واقعات سے جو اوپر لکھے گئے ثابت ہوتا ہے کہ اسد خاں اپنے زمانہ میں سلطنت بیجاپور کی روح رواں بنا اور اس زمانہ کا کوئی کام بغیر اسکے تدبر اور شرکت کے انجام نہیں پاسکتا تھا، سچ پوچھو تو بیجاپور کی حکومت کی باگ تمامتر اسی کے ہاتھ

میں تھی، حکومت میں اس کو اسقدر دخل تھا کہ بادشاہ کی بحالی اور برطرفی اسی کے اختیار میں تھی دوسرے الفاظ میں یہ بیجاپور کا بادشاہ گر تھا، خود اسمٰعیل عادل شاہ نے اس کو وصیت کی تھی کہ وہ ملو عادل کو تخت نشین کرے، بیجاپور کے باہر تمام سلاطین دکن اور راجگان بیجانگر اس سے مراسلت کرتے تھے، چونکہ اس کی حیثیت غیر معمولی ہوگئی تھی اور بیجاپور میں اسکی ٹکر کا کوئی آدمی نہ تھا، اس لئے چند حاسدوں نے اس کے خلاف بادشاہ کے دل میں زہر پھیلانا شروع کیا اور بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ اسد خاں کا اتنا زور ہے کہ وہ اپنی سلطنت قایم کرلے تو کوئی عجب نہیں اور کوئی طاقت اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ابراہیم عادل شاہ کے اس کے خلاف تیور بدل گئے اور اس کے خلاف بدگمانی ہونے لگی۔ اس بدظنی سے مایوس ہوکر اسد خاں ۱۵۴۲ء میں بیجاپور چھوڑکر اپنی جاگیر بل گام میں جاکر بیٹھ گیا۔

لیکن اسد خاں کے خلاف یہ بدظنی بالکل بیجا تھی۔ اُس آزمودہ ہستی کے متعلق گزشتہ تجربات نے ثابت کردیا تھا کہ اس سے کبھی بیوفائی نہیں ہوسکتی۔ اسد خاں وفاداری کی انتہائی مثال تھا۔ اگر وہ اپنی بیوفائی پر آجاتا تو اس کی اتنی طاقت تھی کہ آج سے برسوں پہلے بیجاپور پر قبضہ کرلیتا اور کوئی طاقت اس کو بیجاپور سے بیدخل نہیں کرسکتی تھی، اگرچہ وہ اسمٰعیل عادل شاہ کے عہد میں ایسا نہیں کرسکتا تھا تو ابراہیم کے عہد میں بہت موقعے حاصل تھے۔ اس کے خلاف حکومت بیجاپور کی بدظنی بالکل بیجا اور غلط تھی، ابراہیم کے بزرگوں کے عہد میں جو اس نے کارنمایاں کئے تھے وہ خود کافی تھے، پھر ابراہیم کا تخت نشین کرنا اس کی انتہائی وفاداری کی مثال تھی اس کے علاوہ خود ابراہیم عادل شاہ کے عہد میں ۱۵۳۵ء میں اسد خاں نے بیجانگر پر حملہ کرکے ہندو طاقت کی خاطر خواہ سرکوبی کردی تھی اور جنوب کی ہندو طاقت پر مسلمانوں کی ایک دھاک بٹھادی تھی، چنانچہ اس کے تمام نمایاں کارناموں کا اثر تھا کہ خود ابراہیم عادل شاہ نے اس کی خدمات کا اعتراف کرلیا تھا۔ اور اس کی بیٹی سے نہ صرف شادی کرلی تھی بلکہ یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ اسد خاں کی بیٹی کے بطن سے جو اولاد ہوگی وہ بیجاپور کی مالک ہوگی۔ لیکن آخر کو اس کے خلاف

صریح بدگمانی نہ صرف بے بنیاد بلکہ حکومت بیجاپور کی بے انتہا ناحق شناسی اور تنگ نظری کی دلیل تھی کہ ملک کے ایک بڑے محسن بلکہ سیاست دکن کے ایک بڑے علمبردار کو ملک سے باہر نکال دیا گیا، اگلے واقعات ثابت کریں گے کہ اسد خاں نے خانہ نشینی کے بعد بھی بیجاپور کی وفاداری کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بلکہ جہاں تک ہوسکا بلگام میں بیٹھکر بیجاپور کے تخت و تاج کی حمایت کی بلکہ بیجاپور کے دشمنوں کو مختلف طریقوں سے بچا دکھانے کی کوشش کی یہ وفاداری کی ایسی مثال ہے جو اور جگہ نہیں ملتی کہ حکومت کی ناحق شناسی کے بعد بھی ایک شخص اپنی وفاداری کو نہ چھوڑے بلگام میں بیٹھ کر اسد خاں کو پھر بیجاپور کی حمایت کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی جب کہ بیجاپور نے اس کے عام وفادارانہ کارناموں کو بھلا دیا تھا اور اس پر ظلم کیا تھا۔ بیرم خاں نے اپنے زوال کے بعد اکبر کے خلاف بغاوت کرنے کی ٹھانی تھی اور اس کے لئے مواد جمع کرنے کی کوشش کی تھی جو کامیاب نہیں ہوئی، لیکن اسد خاں مرحوم مرتے دم تک صرف بیجاپور اور بیجاپور کے تخت و تاج کا کلمہ پڑھتا رہا۔ اور بیجاپور کی یاد میں اس نے اپنی جان دی۔

اسد خاں بلگام میں۔ جس وقت اسد خاں بیجاپور سے علیحدہ ہوا بیجاپور کے دشمنوں نے اس کی علیحدگی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کیونکہ سب کو یہ معلوم تھا کہ صرف یہی شخص بیجاپور کی پشت و پناہ اور اس کی تمام طاقت کا محور تھا، نظام شاہ نے اپنی تمام گزشتہ شکستوں کا انتقام لینے کے لئے حملہ کی تیاریاں شروع کردیں، یہ اسد خاں کے لئے بڑی آزمایش کا وقت تھا۔ نظام شاہ اور دیگر سلاطین کو یہ توقع تھی کہ یہ شخص بیجاپور کی مخالفت میں ضرور ان کا ساتھ دیگا۔ چنانچہ ۱۵۴۲ء میں نظام شاہ ایک بڑی فوج لے کر بلگام پہنچا اور اسد خاں کو شرکت کی دعوت دی۔ اسد خاں دہوکہ دیکر نظام شاہ کے ساتھ تو ہوگیا مگر بیجاپور کے قریب آکر علاء الدین عماد شاہ کو چپکے سے بیجاپور کی امداد کے واسطے بلایا، اور جب عماد شاہ بیجاپور کی امداد کے لئے پہنچا تو نظام شاہ کی حالت خراب ہوگئی اور اس کو بیجاپور کی دیواروں کے پاس سے بھاگنا پڑا۔ اس وقت

میں اسد خاں کی وفاداری نے بیجاپور کی لاج رکھ لی اور ابراہیم کو یہ معلوم ہوگیا کہ حاسدوں کا اس کے خلاف کہنا سننا بالکل بے بنیاد تھا پھر اسد خاں کو بیجاپور میں بلاکر انعامات سے سرفراز کیا گیا اور دوسری طرف اس کی رائے سے علاؤ الدین کی دوسری بہن رابعہ سے شادی کرلی، اور برار سے اتحاد مضبوط کرلیا، لیکن اسد خاں برار میں بہت دنوں نہیں رہا۔

اگرچہ نظام شاہ نے ۱۵۴۲ء کی شکست کھانے کے بعد بیجاپور سے صلح کرلی تھی اور زرخیز اضلاع بیجاپور کے سپرد کردئے تھے، لیکن یہ شرم اس کے دل میں ہمیشہ چٹکیاں لیتی تھی اور انتقام کے لئے آمادہ کرتی تھی، چنانچہ ۱۵۴۶ء میں نظام شاہ نے بیجاپور کے حملہ کے لئے پھر تیاریاں شروع کردیں اور اس مہم کے لئے تمام سلاطین دکن سے اتحاد جوڑا جمشید قلی قطب والی گولکنڈہ علی برید والی بیدر اور رام راجہ والی بیجانگر اس اتحاد میں شریک ہوئے، قرار یہ تھا کہ چاروں طاقتیں چاروں سمتوں سے بیجاپور پر حملہ کریں، یہ بیجاپور کے لئے بڑا نازک موقعہ تھا، اگر اس آڑے وقت میں اسد خاں کی مدد نہ ہوتی تو بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، اس عقدہ کشائی کے لئے اسد خاں بلایا گیا، اسد خاں نے اپنی حکمت عملی سے کام لیکر ان کے مطالبہ کی تدابیر سوچیں چونکہ وقت واحد میں ان سب طاقتوں کا مقابلہ مشکل تھا اس لئے اسد خاں نے بعض طاقتوں کو علاقے دیکر ہموار کرلیا، چنانچہ نظام شاہ کو شولاپور دے کر اس اتحاد سے علحدہ کردیا اور دوسری طرف رام راجہ کو تحفے تحائف دیکر راضی کرلیا، ان دونوں کو اتحاد سے علحدہ کرنے کے بعد جمشید قلی قطب کو شکست دینا بہت آسان تھا، چنانچہ اسد خاں نے جمشید قلی قطب شاہ کا گولکنڈہ کی دیواروں تک تعاقب کیا اور اس قدر شکست فاش دی کہ گولکنڈہ اور جمشید نے اس شکست کو فراموش نہیں کیا، اس وقت بھی اسد خاں کی وفاداری سے بیجاپور بچ گیا، ورنہ ابراہیم تنہا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

اسی پر منحصر نہیں بلکہ اس کے بعد ۱۵۴۸ء میں بیجاپور اور ابراہیم عادل شاہ پر پھر ایک اور مصیبت آئی اور اس وقت میں اسد خاں نے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیا، اپنی کامیابیوں

سے سرشار ہو کر ابراہیم نے بڑی رعونت شروع کر دی تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ معمولی معمولی بدگمانی پر بہت سوں کو بھینٹ چڑھا دیا تھا اس بری کیفیت سے مجبور ہو کر اکثر امرا نے ابراہیم کی جگہ اس کے بھائی عبداللہ کو تخت نشین کرانا چاہا اور یہ سازش مکمل ہو گئی لیکن جب ابراہیم کو اس سازش کا پتہ چلا اور گرفتاریاں عمل میں آئیں تو اس روا روی میں عبداللہ بھاگا اور گوا میں جا کر اس نے پرتگالیوں کے ہاں پناہ لی، اب کیا تھا بیجاپور کے دشمنوں کو ایک موقعہ ملا اور نظام شاہ جو پہلے سے موقعہ کی تاک میں تھا بیجاپور پر وار کرنے کے لئے سلاطین دکن کی طاقتیں متحد کرنا شروع کیا تاکہ عبداللہ کے تخت نشین کرنے کے بہانے سے بیجاپور پر حملہ کیا جائے اور اپنا پرانا بخار نکالا جائے۔ چنانچہ قطب شاہ اور پرتگالی اس کے لئے تیار ہو گئے لیکن پرتگالیوں نے صاف کھدیا کہ جب تک اسد خاں اس معاملہ میں ہمارا ساتھ نہیں دے گا ہم عبداللہ کو کامیاب نہیں بنا سکتے، چنانچہ اسد خاں کو شریک اتحاد کرنے کے لئے ایک برہمن اس کے پاس، بلگام روانہ کیا، اور شرکت کی درخواست کی، اسد خاں اگرچہ بڈھا ہو گیا تھا اور علیل تھا، لیکن اس کی وفاداری اتنک مضبوط تھی اس نے برہمن سے کہا کہ تم ایک قاصد ہو اور یہی چیز تمھاری جان بخشی کا سبب بن رہی ہے، ورنہ میں تم کو فوراً قتل کر دیتا، لیکن اس کے پہلے سے پرتگالی عبداللہ کو لیکر بیجاپور کی طرف روانہ ہو چکے تھے اور ان کو یہ امید تھی کہ اسد خاں عبداللہ کی تائید پر آجائے گا، اس اثنا میں اسد خاں بیمار ہو گیا تھا اور نظام شاہ نے اپنی فوج کے ذریعہ بلگام کے قلعہ پر قبضہ کرنا چاہا اور خود قلعہ بلگام کے باہر ٹھہر کر اندر جاسوس روانہ کر دئے تھے، لیکن اس کمزوری کی حالت میں بھی اسد خاں کی سپہ سالاری برابر کام کرتی رہی اور اس نے نظام شاہ کے جاسوس کو قتل کر دیا، اس موقعہ پر اسد خاں کی اس وفاداری نے نہ صرف بیجاپور کے دشمنوں کو پیچھے ہٹا دیا اور پرتگالی بھی واپس ہو گئے اور سلاطین دکن کا منصوبہ خاک میں مل گیا بلکہ دوسری طرف بیجاپوری امرا نے بھی اسد خاں کی اس مثال سے اپنی سازشوں سے توبہ کی اور سمجھا کہ جب اسد خاں اس معاملہ کی تائید اور حمایت نہیں کرتا تو ظاہر ہے کہ یہ معاملہ

صریح غلطی پر مبنی ہوگا، اس طریقہ سے اور اسد خاں کی اس انتہائی وفاداری سے نہ صرف ابراہیم کی حکومت قایم اور مضبوط ہوگئی، بلکہ بیجاپور خانہ جنگی کی بلائے بے درماں سے بچ گیا۔

اسد خاں کا انتقال ان عظیم الشان کارناموں کے بعد یہ وفادار دولت بیجاپور ۱۵۴۹ء میں مرگیا۔ مرتے مرتے بھی اس پیکر وفاداری نے اپنے تاج و تخت اور بادشاہ کا کلمہ پڑھا، اور اپنی روح اور ضمیر کو خوش کرنے کے لئے ابراہیم عادل شاہ کے پاس ایک رقعہ بھیجا کہ بادشاہ بلگام میں تشریف لاکر اپنے دیدار سے مرنے والے کو خوش کریں۔ اپنے رقعہ میں اس نے یہ بیت لکھی تھی ؎

چو سرو ناز قدم رنجہ کن بدیں گلزار چو باد صبح گزر کن بدیں حدیقۂ انس

ابراہیم نے فرط محبت سے اس عریضہ کو پڑھا اور بلگام گیا، لیکن اس کے آنے سے پہلے دکن کی اس بڑی شخصیت کا انتقال ہوچکا تھا، ابراہیم نے اس کے پسماندگان کے ساتھ اظہار تعزیت کرکے ان کو انعامات واکرامات سے سرفراز کیا، بلگام میں اسد خاں کا مقبرہ ہے جو اس نے اپنی زندگی میں تیار کرلیا تھا، اس کے ذاتی اوصاف اور وفاداری کا یہ اثر ہے کہ اس کا مقبرہ مرجع خاص و عام ہے اور لوگ اس کو ولی مانتے ہیں، ہندو اور مسلمان یکساں اس کی زیارت کو آتے ہیں اسد خاں کی عمر سو سال سے بھی متجاوز تھی اور ۴۵ سال اس نے بیجاپور کی اس قدر وفادارانہ خدمت کی کہ تاریخ بھی اس کی مثال نہیں پیش کرسکتی۔

اسد خاں کی معاشرت اسد خاں نے بڑی تزک و احتشام کی زندگی بسر کی، فرشتہ کا بیان ہے کہ ڈھائی سو صرف اس کے خانگی نوکر تھے۔ دو سو سے زیادہ ہاتھی اس کے پاس تھے جن میں کچھ قدآور اور باقی چھوٹے قد کے تھے، اور اس کے اصطبل میں عربی اور ایرانی کوئی چار سو گھوڑے تھے، اور اس کے علاوہ ہندوستانی گھوڑوں کی خاصی تعداد تھی اسی مورخ فرشتہ کے الفاظ میں یہ پہلا شخص ہے جس نے ہاتھی کے لئے لگام تجویز کی تھی، اور دکن میں اس کے اختراعات میں سے قبا، خنجر و زین بہت مشہور ہیں۔

اسد خاں کے متعلق یہ وثوق کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ باوجود اپنے اقتدار اور عروج کے نہایت ذی اخلاق آدمی تھا اور اسی کا اثر تھا کہ جب تک اسد خاں زندہ رہا بیجاپور اور بلگام دونوں جگہ اس کا گھر مرجع خلایق رہا، اکثر آدمی اس سے ملنے آتے تھے اور خوش ہوکر جاتے تھے اور عجیب و غریب چیز یہ ہے کہ بیجاپور کے دوسرے امرا، اس سے کبھی بدظن نہیں ہوئے۔ حالانکہ دنیا کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ جب کوئی امیر بڑے رتبہ پر پہنچتا ہے تو دوسرے امیر اس کے دشمن ہوجاتے ہیں، اور اس کی بیخ کنی کے درپے ہوتے ہیں لیکن تمام بیجاپوری امرا نہ صرف اسد خاں کے ہمدرد بلکہ اس کے پروانے تھے، اور تمام بیجاپوری امارت اس کا لوہا مانتی تھی، جب کبھی حکمت عملی کا سوال پیدا ہوتا تھا جملہ ایران بیجاپور اسد خاں کی طرف دیکھتے کہ یہ کس طرف رخ کرتا ہے، چنانچہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ امرا نے پہلے عبداللہ کے لئے سازش کی لیکن اسد خاں کی مثال نے ان کا رویہ بدل دیا، اس سے نہ صرف اسد خاں کے پاکیزہ اخلاق بلکہ اس کی عظیم الشان عظمت معلوم ہوتی ہے، جو دکن میں کسی کو حاصل نہ تھی اور نہ تاریخ اس کی وفاداری کی مثال پیش کرسکتی ہے۔

شباب

از جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
یہ نظم جشن یوم کلیہ بابتہ ۱۳۴۰ف کے مشاعرے میں پڑھی گئی۔ (خوب دادملی)

نگاہ میں ایک ابھار ہے، نگاہ میں شرار ہے
نہ عقل پر عناں کوئی، نہ دل پہ اختیار ہے
یہ دور وہ ہے جس میں زہدِ خشک ننگ و عار ہے
یہ آدمی کی زندگی کا موسم بہار ہے

ہر اک صدا ہے نغمہ زا، نگاہ مے فروش ہے
جو شورشِ حیات ہو وہ نغمۂ سروش ہے
پسند تلخیاں ہیں اور نیش اُس میں نوش ہے
کہ لطف گلفشاں ہے گر تو غم بھی لالہ پوش ہے

ہے دل کی تربیت رہے جو شغلِ دلگداز میں
ہے زندگی وہی بسر جو کچھ ہو سوز و ساز میں
جنابِ شیخ سے کوئی کہے یہ بات راز میں
رگوں میں خوں ہے موجزن تو لطف ہی نماز میں

لئے ہے آرزوئے بدر قلب میں ہلال بھی
ترے شگوفہ و ثمر ہیں حال اور مآل بھی
ترے پروں سے پرفشاں ہے عرش پر خیال بھی
غرض کہ دم سے ہے ترے جمال بھی جلال بھی

جو زاہدوں کا خلد ہے شباب ہی کا خواب ہے
وہ منتظر ہیں اور یہ جواں ہیں بس یہ کامیاب ہے
مرا شباب کیا خبر سراب ہے کہ آب ہے
فریب ہے کہ اصل ہے یہ جو ہے لاجواب ہے

بزرگ کہنہ سال ہیں خیال احتیاط کا
جو صاف پوچھئے تو ہے ثبوت انحطاط کا
خطر ہے عاقبت کا کچھ نہ خوف پل صراط کا
ہے مذہب اُس کا اور ہی جو اہل ہو نشاط کا

جہاں میں عشق اور عمل سے جوہرِ حیات ہے
اسی کے کاروبار پر مدارِ کائنات ہے
اسی سے روز عید ہے تو رات شب برات ہے
لپک کے لے جو چاہے کہ دہر بے ثبات ہے

ترے لئے ہر اک طرف یہاں کشادہ راہ ہے
یہ عہد وہ ہے جس میں ایک یاس ہی گناہ ہے
نظر فلک شگاف ہے جو کوہ ہے وہ کاہ ہے
وہ حوصلہ ہے تجھ میں جس سے فرد خود سپاہ ہے

پپیہا اور عورت

از جناب مولوی علی حسین صاحب زیبا متعلم کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

آتشِ الفت کا چھوٹا سا شرر
دردِ دل کی کائناتِ مختصر

آب و گل کا پیکرِ آشفتہ حال
اہلِ دنیا کو پیامِ برشگال

اک پپیہا ہستیٔ نوحہ طراز
رنگ و بو کی بزم کا ہنگامہ ساز

جس کا ہے دن رات نالہ "پی کہاں"
جانے رہ جاتا ہے اس کا جی کہاں

کر رہا ہے دعوتِ گوش و نظر
آم کی جھکتی ہوئی اک شاخ پر

بادل اودے اودے ہیں چھائے ہوئے
جی اُٹھے ہیں پیڑ مرجھائے ہوئے

ہے محرک خون میں ہیجان کا
کھیت لہریں لے رہا ہے دھان کا

جیسے فطرت دے رہی ہے لوریاں
کر رہی ہیں ہم سے منکولیاں

ایک عورت پیکرِ حسن و شباب
جیسے پھولوں میں تر و تازہ گلاب

اپنا نازک ہاتھ رکھے شاخ پر
سرنگوں ہے دیر سے زیرِ شجر

کھوئی کھوئی ہجر کی روداد میں
اپنے پردیسی پیا کی یاد میں

آم کے مانند چہرہ زرد ہے
رنگ کہتا ہے کہ دل میں درد ہے

اللہ اللہ حسنِ دلکش کا اثر — رہ گئی ہے کائنات اک حال پر
محوِ غم کس درجہ یہ رنجور ہے — جیسے اس منظر سے کوسوں دور ہے
اس کا منظر اس کی دنیا انتظار — رس بھری آنکھوں سے پیدا انتظار
پر پپیہے کی سی آزادی نہیں — "نقشِ فریادی" ہے "فریادی" نہیں
اس کی فریادوں میں کتنا جوش ہے — اس کا نالہ کس قدر خاموش ہے

نسلِ انساں کیلئے عزت ہے یہ
ضبط کی پتلی ہے اک عورت ہے یہ

ستاروں کے بعد کی پیمائش

از جناب مولوی نصیر احمد صاحب ایم۔ اس۔ سی پروفیسر طبیعیات عثمانیہ کالج

علم ہیئت کے متعلق ایک ماہر فن کا قول ہے کہ " ہیئت کی کل کائنات رات کو اختر شماری اور دن کو عدد شماری ہے۔" اس میں شک نہیں کہ کسی ہیئت داں کی یا رصاد کی زندگی کا نقشہ اس سے بہتر نہیں کھینچا جا سکتا، البتہ یہ ضروری ہے کہ بعض رصاد صرف اختر شماری میں مہارت رکھتے ہیں۔ بعض عدد شماری یعنی حساب میں ملکہ بہم پہنچاتے ہیں اور بعض دونوں پر دماغ سوزی کرتے ہیں

اس آخری قسم کے کام کی ایک عمدہ مثال ستاروں کے بعد کی پیمائش میں ملتی ہے اس سلسلہ میں امریکہ میں بہت کچھ کام کیا گیا ہے۔ اور اسی پر ہم ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

جو اصول اس پیمائش میں استعمال کیا جاتا ہے وہ کچھ بھی پیچیدہ نہیں، بلکہ سادہ ترین ہے۔ فرض کرو کہ تمھارے کمرہ میں ایک کھڑکی ہے جس میں کھڑی سلاخیں لگی ہوئی ہیں اب اس کھڑکی میں سے باہر کی دنیا پر ایک نظر ڈالو اور اپنے سر کو ایک طرف ذرا ہٹا دو، پھر دوسری طرف لیجاؤ۔ تو تم کو محسوس ہوگا کہ جب تم سر کو داہنی طرف لے جاتے ہو تو کھڑکی کی سلاخیں بائیں جانب حرکت کرتی نظر آتی ہیں اور جب تم بائیں جانب سر کو حرکت دیتے ہو تو سلاخیں داہنی جانب حرکت کرتی ہیں پس معلوم ہوا کہ بعید اشیا کے مقابلہ میں قریب کی اشیا سمت مخالف میں حرکت کرتی نظر آتی ہیں اس اصول کو بھی بعدوں کی پیمائش میں استعمال کرتے ہیں، اصطلاحاً اس اصول کو اختلاف

منظر"(Parallax) کہتے ہیں، یعنی اشیاء کے منظر میں جو یہ ظاہری اختلاف پیدا ہوتا ہے اس کی بناء پر ہم اصول مساحت کی مدد سے ان کے بعد یا فاصلے دریافت کرسکتے ہیں، یہی وہ اصول ہے جو جدید دوربینوں (Rangefinders) میں کام میں لایا جاتا ہے، جن کی بری و بحری فوجوں میں شدید ضرورت ہوتی ہے، ہیئت میں اس اصول سے کام لینے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو مرصد ہونا چاہئے جہاں سے رصد یا مشاہدہ کیا جائے۔ اس کی حرکت معین ہونی چاہئے دوسری ایک بعید پس منظر (Background) ہونا چاہئے جس کے محاذ میں اختلاف منظر دیکھا جاسکے۔ جب ہم کو چاند یا قریب کے سیاروں کا مشاہدہ کرنا ہوتا ہے تو مرصد کی تبدیلی ہم یوں پیدا کرتے ہیں کہ زمین کے مختلف مقامات سے مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن جب ہم کو ستاروں سے سابقہ پڑتا ہے تو ایک طویل تر مرصد کی ضرورت لاحق ہوتی ہے خوش قسمتی سے یہ مرصد ہم کو زمین کی مداری حرکت میں مل جاتا ہے زمین کا فاصلہ سورج سے ۹,۳۰,۰۰,۰۰۰ (نو کروڑ تیس لاکھ) میل ہے، پس زمین جب اپنے مدار میں گھومتی ہے تو ایک مرتبہ سورج کے ایک طرف اس قدر فاصلہ طے کرآتی ہے، اور پھر دوسری طرف بھی اتنا ہی فاصلہ طے کرآتی ہے، اس طرح ہم کو دگنی مسافت کا ایک مرصد مل جاتا ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ ایسے طویل مرصد سے بھی تھوڑے ہی سے ستاروں کا اختلاف منظر دریافت کیا جاسکتا ہے۔ باقی ستارے اس قدر بعید ہیں کہ ان میں جو نقل مکان پیدا ہوتا ہے وہ محسوس ہی نہیں ہوتا۔

اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں، کیونکہ آسمان پر جو ستارے مدہم سے بکثرت نظر آتے ہیں ہم ان کو بطور پس منظر استعمال کرسکتے ہیں، بیان کردہ طریقہ میں اس کی بھی اشد ضرورت ہے، نظری حیثیت سے یہ معیار تصوری (Ideal) نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی پس منظر مطلق طور پر ساکن ہو تو یہ بعید ستارے بھی خفیف سا اختلاف منظر دکھائیں گے، لیکن عملاً اس میں کوئی دقت واقع نہیں ہوتی، کیونکہ ہمارے پاس ایسے ذرائع ہیں، جن کا انحصار زیادہ تر فضا میں سورج کی حرکت پر ہے، جن کی مدد سے اس خفیف اختلاف کی اوسط قیمت ہم دریافت کرسکتے ہیں اور پھر اس کا

لحاظ کر سکتے ہیں ۔

یہاں تک تو اصول سے نظری طور پر بحث تھی لیکن جب ہم اس اصول کو فلکیات میں تاروں کے بعد کی پیمائش کے لئے کام میں لانا چاہتے ہیں تو ہم کو متعدد دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی دقت تو یہ ہے کہ اپنے سالانہ اختلاف کو ظاہر کرنے کے لئے تارے ایک جگہ قیام نہیں کرتے بلکہ برابر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اس کو ہم یوں رفع کرتے ہیں کہ اپنے مشاہدات دو تین یا تین برسوں پر پھیلا دیتے ہیں اور پھر ہم کو اس تارے کے لئے اس "حرکت خاص" کا علم ہو جاتا ہے، اور ہم اس کا لحاظ کر سکتے ہیں اس سے بڑھ کر دقت یہ ہے کہ اختلاف منظر کی وجہ جو نقل مکان واقع ہوتا ہے وہ بہت ہی خفیف ہوتا ہے جس سے لازم آتا ہے کہ ہمارے مشاہدات بدرجہ غایت دقیق اور صحیح ہوں، اس دقت کو یوں رفع کیا گیا ہے کہ بڑی بڑی دوربینیں استعمال کی جاتی ہیں اور مزید برآں فوٹوگرافی سے مشاہدات میں مدد لی جاتی ہے ۔

جدید فلکیات میں یہ انکشاف ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں کہ کسی دوربین میں فوٹو کی تختی لگا کر تاروں کے فوٹو لئے جائیں اور تختی پر ان کے خیالوں (Images) کے درمیان فاصلہ پیمائش کر لیا جائے تو مشاہدات زیادہ صحیح حاصل ہوتے ہیں بہ نسبت اس صورت کے کہ دوربین میں خردہ پیما (Micrometer) لگا کر براہ راست تاروں کے فاصلے دریافت کئے جائیں جب تک حقیقت میں اسطرح کے فوٹو نہ لئے گئے اس وقت تک کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ فوٹو کی تختی ان خیالوں کے محلوں کو جو اس پر مرتسم ہوتے ہیں اس طرح محفوظ رکھتی ہوگی ۔

آج کل جدید فوٹوگرافی میں کسی منفرد ستارے کے خیال کے محل میں ایک انچ کے دس ہزار ویں ($\frac{1}{10000}$ انچ) حصہ سے کم ہی کی خطا واقع ہوتی ہے ۔ اب اگر اس کا خیال کیا جائے کہ ترتیب (Development) تثبیت (Fixation) تجفیف (Drying) کے علاوہ میں تختی کی جھلی کو نہ جانے کن کن تغیرات سے سابقہ پڑتا ہے تو خطا کا اس قدر کم ہونا حیرت میں ڈال دیتا ہے ۔

بایں ہمہ فوٹو کی تختی ستاروں کے خیالوں کو کتنے ہی صحیح طریقہ پر کیوں نہ مرتسم کرلے اس کی پیمائش بغیر خرد بین کے ممکن نہیں اور خرد بین بغیر خردہ پیما کام نہیں کرسکتی یہ واقعی تعجب انگیز ہے کہ اس طرح جو بدد واسطہ پیمایش ہوتی ہے وہ اس سے صحیح تر نتایج پیدا کرتی ہے جو دوربین میں خردہ پیما کے براہ راست لگانے سے حاصل ہوتے۔ اس کی توجیہ یوں ہی کی گئی ہے کہ ہوائی انعطاف (Atmospheric Refraction) کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے دوربین میں ستاروں کے خیالات برابر اہتزاز کرتے رہتے ہیں، آنکھ سے دیکھنے میں راصد اپنے تار عنکبوت (جو دوربینوں میں نشاندہی وغیرہ کی غرض سے لگا رہتا ہے) کو خیال پر جماتا ہے اور کسی ایک لمحہ کا خیال دیکھ لیتا ہے اب فوٹو کی تختی کئی دقیقوں تک روشنی کے زیر عمل رکھی جاتی ہے، اس وجہ سے اس میں بہت فائدہ رہتا ہے اور تختی خود بخود ہی خیالات کے اہتزازات کا اوسط اثر دکھلا دیتی ہے اور جب ایک ہی میدان میں کئی ستاروں کی وضعیں پیمائش کرنا ہوں تو ایک بڑا نفع یہ رہتا ہے کہ تختی سب ستاروں کی ایک ہی وقت کی حالت کو بتلاتی ہے، اس کے مقابلہ میں عینی مشاہدات میں یہ نقص ہے کہ مشاہدات ایک ہی وقت کی بجائے باری باری سے لینے پڑتے ہیں اور پھر ہر صورت میں مختلف خطائیں واقع ہوتی ہیں۔

اختلاف منظر کے کام میں اب سوائے فوٹو کے طریقہ کے کوئی دوسرا طریقہ استعمال ہی نہیں ہوتا، لیکن راصد کی دقتوں کا آغاز تو اس وقت سے ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی دوربین درست کرلیتا ہے اور اپنے عدسوں (Lenses) کو مناسب ترتیب میں لے آتا ہے، سب سے پہلے اس کے آلے کو آسمان پر ستاروں کی روزانہ حرکت کا پورے طور پر تابع رہنا چاہئے تاکہ جتنی دیر تک تختی روشنی کی زد میں رکھی جائے اتنی دیر میں کسی ایک ستارے کا خیال تختی پر ایک ہی جگہ واقع ہو، یہ شرط اس قدر سخت ہے کہ عمدہ سے عمدہ گھڑی بھی اس کو پورا نہیں کرتی، جب ستاروں کی باقاعدہ حرکت کا یہ حال ہو تو انعطاف (Reflections) کی وجہ سے خیالوں کی بے قاعدہ حرکت کا ساتھ کیونکر دیا جاسکتا ہے، اس وقت کو رفع کرنے کے لئے اختلاف منظر کا راصد فوٹو

کی تختی گیر کو دوربین میں اس طرح لگاتا ہے کہ دو باریک پیچوں کے ذریعے اس کو اوپر نیچے یا دائیں بائیں حرکت دی جا سکے۔ تختی گیر کے باہر لیکن اس سے کسا ہوا ایک چشمہ (eyepiece) ہوتا ہے جو اس طرح لگا ہوتا ہے کہ راصد اس کے ذریعے سے کسی مدہم ستارے کے خیال کو دیکھ سکے چشمہ میں دو بہت باریک تار صلیب کی شکل کے لگے ہوتے ہیں۔ تختی کو روشنی کی زد میں رکھنے سے پہلے راصد اس ستارے کے خیال کو صلیبی تاروں پر منطبق کر لیتا ہے پھر اپنی عقابی نظروں سے اس خیال کو دیکھتا ہے اور خفیف سے خفیف انحراف کو نگاہوں سے بچنے نہیں دیتا، جہاں انحراف معلوم ہوا اس نے پیچ گھمائے کہ تختی گیر اور چشمہ دونوں حرکت میں آگئے اور خیال اپنی جگہ پر آگیا۔ ایک تجربہ کار راصد اس طرح بہت سی خطاؤں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ورنہ نجمی خیالوں پر ان خطاؤں کا زبردست اثر ہوتا ہے۔ ان تمام احتیاطوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نجمی خیالات قصیر، صاف اور مدور حاصل ہوتے ہیں، اگر سوئے اتفاق سے خیالوں میں یہ اوصاف نہ پائے جائیں تو وہ تختی مسترد کر دی جاتی ہے اور اس سے کوئی پیمائش نہیں لی جاتی۔

عمدہ خیالات حاصل کرنے کے لئے نہ صرف مذکورۂ بالا احتیاطوں کی ضرورت ہے بلکہ صحیح مدت تک روشنی کی زد میں رکھنا بھی لازمات میں سے ہے، اگر تختی کم مدت کے لئے زد میں رہیگی تو خیال خاکی اور منتشر ہوں گے، اگر زائد مدت کے لئے تختی پر زد رہے گی تو خیال بڑے، غیر واضح اور ملائم نہیں گے۔ ان دونوں صورتوں میں پیمائش ممکن نہیں، جب وہ ستارہ جس کا اختلاف منظر ہم دیکھنا چاہتے ہیں بہت مدہم ہو تو اس کی وجہ سے کوئی خاص دقت واقع نہیں ہوتی۔ ایک یا دو تختیوں کو امتحاناً رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے کہ اختلاف منظر والے ستارے کے اچھے خیال حاصل کرنے کے لئے کتنی مدت تک زد میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور تختی پر جو دوسرے ستارے نظر آتے ہیں ان میں اتنی درخشانی پائی جاتی ہے کہ وہ مقابلہ کے ستارے سمجھے جا سکیں اور پس منظر کے لئے پھر یہ کافی ہوتے ہیں۔

لیکن ممکن ہے کہ اختلاف منظر والا ستارہ خود درخشاں ہو مثلاً کلب الجبار (Sirius)

اور مقابلے کے لئے جو ستارے ہوں وہ ممکن ہے کہ درخشانی میں سوواں یا ہزارواں حصہ ہوں پس لازم آیا کہ ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ایک کی درخشانی دوسروں کو غیر مرئی کئے بغیر کم کی جاسکے ۔ اس غرض کے لئے بالعموم ایک "احتجابی قرص" (Occulting disc) استعمال کرتے ہیں اس کا قطر کم و بیش ایک انچ ہوتا ہے ، اس کے دو حصے ہوتے ہیں جو اس طرح سے ترتیب دئے جاتے ہیں کہ ایک درجہ سے لے کر ۱۸۰ درجہ تک کی ہر مطلوبہ چوڑائی کا ایک قطعہ بیچ میں رہ سکتا ہے اور بقیہ قرص حجاب کا کام دیتی ہے ۔ یہ قرص تختی کے سامنے کے حصے کے قریب لگائی جاتی ہے ، جہاں اختلاف منظر والے ستارے کا خیال بنتا ہے ۔ یہ قرص ایک ننھی سی موٹر یا گھڑی کی کل کے ذریعہ سے تیزی کے ساتھ گردش میں رکھی جاسکتی ہے اگر قطعہ کا دہانہ (۱/ن) محیط ہو تو جتنی دیر تک مدہم مقابلے والے ستارے زد میں رہیں گے جو درحقیقت مسلسل زد میں رہیں گے ۔ اس سے مجموعی طور پر (۱/ن) مدت تک اختلاف منظر والے ستارے زد میں رہیں گے ۔

اس آلہ کی مدد سے بہت ہی روشن ستاروں کی روشنی ہلکی کر کے مدہم روشنی کے برابر کی جاسکتی ہے ۔ ساتھ ہی اس میں کوئی نقص نہیں رہتا ، یہی وجہ ہے کہ یہ طریقہ بالکلیہ کامیاب ثابت ہوا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلب البحار جیسے روشن ستاروں پر جو مشاہدات اس کی مدد سے کئے گئے وہ اتنے ہی صحیح نکلے جتنے کہ مدہم ستاروں کے مشاہدات جن کے لئے اس آلہ کی ضرورت نہیں ۔

لیکن ایک دقت باقی رہ گئی اور وہ یہ ہے کہ انعطاف کی وجہ سے ستاروں کے خیال کسی قدر بلند ہوتے ہیں ۔ سرخ ستاروں کے مقابلے میں سفید ستاروں میں یہ بلندی زیادہ پیدا ہوتی ہے ۔ اگر اختلاف منظر والے اور مقابلے والے ستارے ایک رنگ کے نہ ہوں جیسا کہ اکثر واقع ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے ایک میں دوسرے کے لحاظ سے اضافی نقل مکان واقع ہوگا ۔ جب تک یہ نقل اضافی ایک ہی سمت میں رہے اور اس کی مقدار بھی نہ بدلے

اس وقت تک اختلاف منظر کے راصد کو کوئی دقت اس وجہ سے پیدا ہو گی۔ لیکن اگر مختلف سمتوں میں یہ مختلف ہو تو پھر اس میں اور صحیح اختلاف منظری نقل مکان میں التباس واقع ہو جائے گا، اور پھر کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مضمون ہو گا۔ اس سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ راصد کسی زیر نظر ستارے کو ہمیشہ ایک ہی وضع میں دیکھے، بہتر یہ ہو گا کہ نصف النہار پر اُسے دیکھے تاکہ انعطاف کی وجہ سے جو خطا واقع ہو وہ ہمیشہ ایک ہی رہے۔

جب یہ سب احتیاطیں کام میں لائی جائیں اور دو یا تین برس کے عرصے میں مناسب وقتوں پر (۱۲) یا (۲۰) فوٹو لئے جائیں تو پھر اختلاف منظر دریافت کیا جا سکتا ہے اور اس میں خطا ($\frac{1}{10}$) ثانیہ (Second) سے بھی کم ہو گی زاویوں کی جتنی پیمائشیں اب تک کی گئی ہیں ان میں صحیح ترین یہی پیمائش ہے۔

اختلاف منظر پر کام کرنا بہت دقت طلب ہے، ایک سمت میں ہٹاؤ دریافت کرنے کے لئے شام ہوتے ہی ستاروں کے فوٹو لے لینے چاہئیں۔ یہاں تک تو آسان ہے لیکن ایسے فوٹو کا مقابلہ دوسرے فوٹو سے کرنا چاہئے جو سال کے کسی اور وقت علی الصباح پو پھٹنے سے قبل لئے گئے ہوں۔

یہ تو گویا رات کا کام ہوا اب دن کا کام یہ ہے کہ جب عمل تربیت کے بعد تختیاں صحیح تصور کی جائیں تو ان سے پیمائشیں لی جائیں اس میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ درحقیقت اگر کوئی اچھی دوربین ہو اور موسم بھی اچھا ہو اور راصد بھی محنت سے نہ گھبراتے ہوں تو پھر جلد جلد تختیاں تیار کی جا سکتی ہیں۔ ایک سہولت یہ بھی ہے کہ روزمرہ کے کام کی طرح پیمائش کا کام مددگاروں کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور حساب کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اگرچہ سادہ ہے، تاہم مقدار میں بہت ہوتا ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں ہزاروں تختیوں سے کام پڑتا ہے۔

اس طریقہ کا پیشوا ولندیزی فلکی کیپٹن (KAPTEYN.) تھا، جس نے سب سے پہلے انعطاف کی خطاؤں سے بچنے کا طریقہ تبلایا، آج کل جو طریقے کام میں لائے جارہے ہیں وہ زیادہ تر رصدگاہ ییل (امریکہ) کے ناظم پروفیسر شیلے زنگر (SCHLESINGER.) کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ جنھوں نے سب سے پہلے احتجابی قرص کا استعمال کیا اور حساب کے وہ طریقے نکالے جو آجکل تقریباً ساری دنیا میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جامعہ ورجنا (امریکہ) کی رصدگاہ کے ناظم پروفیسر میچل نے کوئی ہزار ستاروں کے اختلاف منظر کو دریافت کیا ہوگا، حالانکہ رصدگاہ مذکور میں دوربین اوسط طاقت کی ہے۔ دوسرے فوٹو کے کام میں یہ دوربین سُست ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی دوسری رصدگاہوں میں بھی سینکڑوں کی تعداد میں ستاروں کے اختلاف منظر دریافت کئے گئے ہیں۔

(ماخوذ)

مطربہ

از جناب محمد امیر صاحب بی اے۔ بی ٹی سابق معلم کلیہ

شب کی خموشیوں میں سوئی ہوئی ہے دنیا
چپ چاپ ہیں ستارے خاموش آسماں ہے
لیکن اے مطربہ! تو بیدار ہے ابھی تک
اک اضطراب دنیا دل میں ترے نہاں ہے
بستی سے دور آکر بیٹھی ہے کیوں لب جو
بربط بغل میں کچھ گنگنا رہی تھی
نغمہ سرائیوں پر آمادہ تھی طبیعت
آہٹ کو میری پاکر خاموش ہو گئی ہے
آنے سے میرے شاید برہم ہوئی خلوت
میں بوئے نغمہ پاکر آیا تھا غم بھلانے
منہ موڑ کر جہاں سے پھرتا ہوں مارا مارا
مصروف جستجو ہوں منزل سے بے خبر ہوں
دنیا کے گلستاں کا بھٹکا ہوا ہوں طائر
جو شاخ سے نہ ٹپکا وہ رس بھرا ثمر ہوں
رنگیں نوائیوں سے دل کی لگی بجھا دے
پھر چھیڑ اپنا بربط پھر ہوش میرے لوٹا دے
نغموں سے تیرے گونجے ساری فضائے صحرا
روح القدس کے شہپر راگ اپنا بھول جائیں
جنت کے طائروں میں ایک حشر سا ہو برپا
تیرے سروں کو سن کر تھم جائیں بہتے دریا

ہر تان تیری گویا ہے آبشار نغمہ ‏ سحر حلال ہے یہ ۔ یا ہے ترا ترنم
تیری دبی صدا ہے یا پڑ رہی ہے شبنم ‏ تیری دھنیں نہیں ہیں ۔ غنچوں کا ہے تبسم
تیری خموشیاں بھی کیا رس بھری ہیں گائن

گر چھیڑ دے اے جوگن میرا بھی تو دوتارا ‏ ہو جائیں زندگی کے نغمے ہزار پیدا
ڈھل جائے رُوح میری سرمست زمزموں میں ‏ موسیقی ابد کے دل میں ہوں تار پیدا
ہاں چھیڑ دے دوتارا میں کب سے منتظر ہوں

اقبال

حیات اور شاعری

جناب عبدالقادر صاحب سروری، ام اے، ال ال بی، مددگار پروفیسر اردو

(یہ مضمون " اردو شہ پارے " جلد سوم کا ایک حصہ ہے)

"طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اردو میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔"

(حالی " مجموعہ نظم ")

جدید اردو ادب کا متعلم کسی موجودہ شاعر یا انشا پرداز کے متعلق کچھ لکھنا چاہے تو جب تک سرسید احمد خان اور حالی کی خدمات کا اعتراف نہ کرلے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ حق یہ ہے کہ نثر کے لئے سرسید نے اور شاعری کے لئے حالی نے جو عہد آفریں خدمت انجام دی ہے، وہ تاریخ ادب اردو کے صفحات سے محو نہیں ہوسکتی۔ ان بزرگوں کے اثرات موجودہ نسلوں میں آج تک زندہ ہیں۔ قدیم شاعری اور اسالیب انشا پردازی سے بغاوت کے جو تخم انہوں نے بوئے تھے وہ ہر وقت ایک نئے بار آور درخت کی صورت میں نشو و نما پا رہے ہیں۔ زندہ شاعروں میں اس

عہد آفرینی کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مظہر خود اقبال کی شاعری ہے جس کی اپنی تخم ریزی گذشتہ سے زیادہ اہم نتائج پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔

ادبیات ہمیشہ قومی زندگی کا عکس سمجھی گئی ہے مغل ہندی تمدن کے زوال کے بعد ہم میں سے وہ جوہر مفقود ہو چکا تھا جس کی موجودگی کسی قوم کی طبعی اور ذہنی ترقی کی سرمایہ دار ہوتی ہے۔ حالی اور سرسید سے پہلے ہندوستان میں کوئی بڑی ہستی شاید ہی نمودار ہوئی ہو۔ اور یہی حقیقت اس امر کی توجیہہ بھی ہے کہ دور تنزل کے بعد سے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ پا سکا جو دنیا کے ادبی شہ کاروں کے ساتھ باقی رہ سکے۔

یہ کہنا تو زیادتی ہے کہ قدیم اردو شاعری جو بیشتر غزل گوئی پر مشتمل ہے کسی خوبی سے عاری ہے۔ یا یہ کہ اس میں فطرت مفقود ہے۔ فطرت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں کائنات کی ہر شے داخل ہو جاتی ہے اردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے جس طرح وہ ولی سے پہلے اور میر کے زمانہ تک فطری تھی۔ حالی کے زمانہ تک بھی فطری رہی۔ صرف اس کا دائرہ محدود تھا۔ قدیم شاعر کائنات کی گوناگوں اشیاء میں سے صرف انسان کو اپنا موضوع سمجھتا تھا۔ اور انسان میں بھی وہ غیر معمولی انسان جس کا دل کسی کی زلف پیچاں میں پھنسا ہوا ہو اور جو اپنے ہم جنس کی محبت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہا ہو۔ فطرت کے ایک ہی پہلو کی یہ تکرار آخر کار زیاں کار اور زبوں اثر بن گئی۔ گو میر حسن، میر انیس، مرزا دبیر اور میاں نظیر اکبر آبادی نے اپنی اپنی بساط کے موافق شاعری کی اس حد کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کی، لیکن یہ اتفاقی بات ہے ان کے کلام کا انزان کے ماحول پر نہیں پڑا۔ ورنہ یہی زمانہ جدید شاعری کی ابتدا کا شمار ہوتا۔ ان شعراء کی زالی رفتار بعض وقت تو انہیں شعراء کے مسلمہ دائرہ سے خارج کرنے کی ملزم ثابت ہوئی۔ ماحول پر اثر ڈالنے اور شعراء اور غیر شعراء کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنے کی خدمت قدرت نے آزاد بھی نہیں بلکہ حالی کے سپرد کی تھی۔ حالانکہ دونوں معاصر ہیں اور آزاد کو تاریخی لحاظ سے یہ فخر حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلے جدید شاعر ہیں۔

حالی نے سرسید احمد خان کی شرکت میں جو عہد آفریں کوشش شروع کی تھی، وہ اقبال کی شاعری

میں منتہا تک پہنچتی نظر آتی ہے۔ گو خود حالی نے قدیم اساتذہ فن کی صحبت میں نغمہ طرازی سیکھی تھی، اور وہ ان کے اثر سے بھی بالکل عاری نہیں تھے، لیکن طبع سلیم رکھتے تھے، اس لئے جب اپنی ابتدائی شعری کوششوں سے اکتا گئے تو اپنے لئے نئی دنیا پیدا کرنی چاہی۔ اس مہم پر تنہا روانہ ہونے کو وہ تنہا خوری سمجھتے تھے، اسی لئے انہوں نے بہت سے شاعروں اور غیر شاعروں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ اس مہم میں حالی کو جس قدر کامیابی ہوئی اس کو ہم نے حالی کے مضمون میں صاف طور سے بتلایا ہے۔ یہاں اس کے مابعد اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ گویا یہ حالی کی اس خواہش کی تکمیل ہے، جو اس مضمون کے آغاز میں نقل کی گئی ہے۔ حالی کے فوری عمل کا باعث انگریزی ادب اور شاعری سے روشناسی ہوئی لیکن اپنی زبان کی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے کبھی اس امر کی تلقین نہیں کی کہ غزل، قصیدہ، رباعی یا دوسرے اصناف شاعری کو چھوڑ کر انگریزی نظم کے اصناف جیسے سانٹ، اوڈ وغیرہ کو اختیار کریں۔ ان کی اصلی کوشش شاعری کے پامال مضامین سے توجہ کا ہٹانا تھی صنف خواہ غزل ہو یا مثنوی۔ چنانچہ خود انہوں نے اور ان کے اکثر متبعین نے یہی کیا کہ قدیم اصناف کو قائم رکھ کر پامال اور تکراری مضامین سے اجتناب کرنا شروع کیا۔ گویا حالی ہی کے الفاظ میں "مے" "تو وہی رہی لیکن "پیالے" بدل گئے۔ سانچے تو وہی رہے لیکن مطالب میں وسعت ہوگئی۔

حالی کی تلقینات کا فوری اثر یہ ہوا کہ اردو شعرا خواب سے جاگ اٹھے۔ گو انہیں منزل مقصود کی فکر ابھی نہیں ہوئی۔ تاہم راستوں کی صحت پر تو وہ غور کرنے لگے۔ سامنے حالی کا دکھلایا ہوا راستہ اور ان کے چھوڑے ہوئے نقش قدم نمایاں تھے۔ ان پر چلنا تو دشوار نہیں تھا۔ اس لئے جدید شاعری کے آغاز میں قومی، اخلاقی اور فطری شاعری کا بازار خوب گرم رہا۔ یہ بھی اردو شعرا کی تقلید پسند ذہنیت کا ایک مظہر ہے۔ انہیں میں بعض سخن گو ایسے بھی تھے، جو حالی کے مقلد تو تھے، لیکن لفظی نہیں معنوی طور پر۔ انہوں نے حالی کی تلقین شعری کی اسپرٹ کو خوب سمجھا اور لفظی تقلید کی بجائے، ذاتی مشاہدات، ضروریات اور خیالات کو اپنی شاعری کا محور بنایا ان میں اسمٰعیل میرٹھی کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسمٰعیل خاص کر نیچرل شاعری کے گرو تھے حالی سے

بھی زیادہ اور ایسے ہی واقف ہیں جیسے کوئی قدیم یا جدید مغربی شاعر ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری درحقیقت حالی کی شاعری کا ضمیمہ ہے جس کا ایک کھلا ثبوت ذیل کے اشعار ہیں اسمٰعیل حالی کی طرح اپنے زمانے کے شعرا کی مذمت یوں کرتے ہیں

سخنوران زماں کی بھی ہے یہی حالت — کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑیئے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا انہیں مضموں — سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا ایک طومار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت وقدرت — نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش ونگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ — کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشق زار
تمام اگلے زمانہ کا ہے یہ پس خوردہ — کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جس کی سو سو بار
کمال اپنا سمجھتے ہیں خودستائی کو — نہ ننگ ہے نہ حیا ہے نہ شرم وغیرت وعار
اسی طرح سے ہمارے زمانہ کے شاعر — سمجھتے اپنی خرافات کو ہیں عین وقار
جوان کے دیکھیے دیواں تو بور کے لڈو — غلیظ وگندہ سراسر نتیجۂ افکار

آگے علما، فلسفیوں، مشائخین، مصنفین وغیرہ کی برائیاں حالی کی اسپرٹ میں گنوائی ہیں۔

غرض حالی نے زبان میں نہیں خیال میں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شعرا کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنی چاہی۔ خیال کی تبدیلی میں کئی امور شامل ہیں۔ شاعری قوم کے تمدن اور تربیت کا ایک اہم جزو اور مظہر ہے اگر حقیقی ہو تو اس میں قوم کی حیات کا پورا عکس نظر آسکتا ہے۔ سرسید اور حالی کی اصلاحی کوششوں سے ہمارے قدیم تمدن کو بھی دھکا لگا۔ حالی کی شاعری کی عقبی زمین بڑی حد تک جدید مغربی تمدن تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس معاملے میں سرسید احمد خان کی طرح انتہا پسند نہ ہوں لیکن سرسید کے اصول کے موافق ضرور تھے یہ اصول یہ تھا کہ کوئی تنزل پذیر قوم ترقی اسی وقت کر سکتی ہے جب وہ اپنے قدیم اور ترقی کے سدراہ رواجیات اور خیالات کی شکشت وریخت کر کے، ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ شریک رفتار ہو جائے۔ یہ بزرگ اس عقیدے کے موافق نہیں تھے کہ تنزل پذیر اقوام اپنی شاندار ماضی کی طرف رجوع کرنے سے پھر ابھر سکتی ہیں۔ زمانے کی ضروریات اور مطالبات کو وہ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

جدید تمدن کے نمونوں کو دیکھ کر بہت سے قدامت پسند، نہ صرف ان کے بلکہ اس اصول کے بھی مخالف ہو گئے۔ انہیں قدامت پسندوں میں بعض صاحب رائے ایسے بھی تھے، جو اس حقیقت کا بغور مطالعہ کر رہے تھے کہ مغربی تہذیب اور تمدن کا استقبال ہندوستانیوں کی ذاتی ضروریات اور احساس کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ محکوم ذہنیت پر حکومت کا اثر ہے۔ ان کی نظر میں مغربی تہذیب ایک طرح کا ملمع تھا، جو ادنیٰ درجہ کی دھات پر صرف اس لئے چڑھایا جاتا ہے کہ اس کو زیادہ شاندار دکھا سکے۔ ممکن ہے کہ انہیں میں سے بعض بزرگ مذہبی بنیاد پر سرسید اور حالی کے اصول سے مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ہوں۔ اس طرح کی مخالفتیں نثر اور نظم دونو کے ذریعہ ہوئیں۔ نثر تو اس زمانے کے اخبارات میں مدفون ہے، لیکن شاعری میں خان بہادر اکبر حسین الہ آبادی کی کوششیں چوٹی پر نظر آتی ہیں۔ اکبر کی شاعری پر ہم نے گذشتہ کسی مضمون میں مکمل بحث کی ہے۔ یہاں ربط مضمون کے لئے اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اکبر کی شاعری کا مطالعہ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی والہانہ اور کورانہ تقلید کو ایک قوت فیصلہ رکھنے والی قوم کے افراد کے لئے بے حد مذموم جانتے تھے۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ ہندوستانی ترقی کے جوش اور ولولے میں بلکہ ترقی کی تقلید میں اپنے تمدن کی خوبیوں اور روایات کو بھی بے دردی کے ساتھ پامال کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے تمدن میں مغربی تمدن کا پیوند انہیں عجب بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ پھر ترقی کی خیالی بنیادوں پر عمارت کا چننا، اس کی کشمکش، چہل پہل غرض ہر کوشش ان کے حساس دل کو بری طرح جلا رہی تھی۔ اور یہ جلے دل ہی کا اثر تھا، جو ایسے جلے کٹے شعر نکلتے تھے۔

ترقی کی نئیں ہم پر چڑھا کیں گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھا کیں
رہیں ہر پھر کے بی آیا نصیبن وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں
گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلینگی کنواری لڑکیاں دلکش و آزاد و خوشرو، ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقع عمل کے ہوں گے پیش ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بیساختہ

مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے ایک مدت تک رہیں گے نوجوان والا فتنہ

کہیں کہیں اکبر نے حالی اور سرسید پر تعریض بھی کی ہے۔ کھلی یا پوشیدہ دونو طرح۔

دلادے ہم کو بھی صاحب سے لالٹی کا پروانہ قیامت تک رہے سید ترے "آنر" کا افسانہ

الا یا ایہا الطفلان بحور احت بنا ولہا کہ قرآں سہل بود اول وے افتاد مشکلہا

بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون کہ سرسید خبردار د زرسم و راہ منزلہا

عزت کا ہے نہ اوج نہ نیکی کی موج ہے حملہ ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے

ظاہر ہے کہ اکبر نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ ان کو بھی ہر ذی حس کی طرح قوم کی فلاح کا درد تھا اور اس سے کچھ کم نہ تھا جتنا سرسید یا حالی کو تھا۔ اختلاف صرف نقطہ نظر کا تھا۔ اکبر یہ بھی سمجھتے تھے کہ زمانہ سرسید اور حالی کی کوششوں کا ساتھی ہے۔ تاہم وہ ترقی کے خواہشمندوں کو ان کے راستہ کی دلفریبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی متوقع دشواریوں سے بھی واقف رکھنا چاہتے تھے۔ نیز صاف اظہار خیال میں انہیں ایک طرف حکومت کی چیرہ دستیوں کا خوف تھا، تو دوسری طرف نئے تمدن کے پرستاروں کے جوش عمل سے انہیں کھٹکا لگا ہوا تھا کہ ان کے مشاہدات اور تاثرات پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکیں گے۔ اسی لئے انہوں نے ظرافت کا پیرایہ اختیار کر کے اپنی شاعری پر ہنسنے والوں سے پہلے اپنے خیالات پر خود آپ ہنسنا اور ہنسانا شروع کیا۔ اکبر کی شاعری میں یہ چیز اس کے موضوع شاعری کے برابر اہم ہے۔

تائید وضع ملت و دیں کی کروں گا میں اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر

ہونا نہیں طبیب مداوا سے دست کش سچ ہے اہل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

آزاد، حالی اور اسمٰعیل کے عمل اور اکبر کی مخالفت کے اثرات ابھی نمایاں بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سیالکوٹ کا یہ نوجوان شاعر اٹھتا ہے۔ اور اپنے ذوق کی ہوشیاری سے نغمہ سنجی شروع کرتا ہے۔ پہلے تو وہ ماحول سے متاثر ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذاتی تجربہ اس کو ایسی لے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو اس کے ہم صفیروں میں سب سے زیادہ اہتزاز پیدا کرنے والا ہے۔

شاعر کے ذاتی حالات کا اس کے کلام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اقبال کا خاندان کشمیر کا ایک قدیم اور معزز خاندان ہے۔ ان کے اجداد دینی علوم سے خاصا شغف رکھتے تھے جس کا گہرا اثر کلام سے نمایاں ہے اقبال خود سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد آکر رہ گئے تھے۔ ولادت ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ سیالکوٹ ہی میں ابتدائی عمر کا زمانہ بسر ہوا۔ اور بعد کو ڈگری کی تعلیم کے لئے وہ لاہور چلے آئے۔ کشمیر کی دلفریبی سے ایک عالم متاثر ہے۔ اقبال جیسے شاعر کے دل سے اس شعریت سے پُر خطہ زمین کی یاد کہاں نکل سکتی تھی؟ بچپن کے اکثر قطعات میں کشمیر کو یاد کیا ہے۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے — اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد — جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور — یا نافہ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر — بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کیا عجب ہے کہ ذیل کے اشعار میں بھی یہی احساس کام کر رہا ہو۔

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں — ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
ارمان ہے یہ جی میں اڑ کر چمن کو جاؤں — ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی — اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے — دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اُسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے — دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

اقبال کی خاندانی خصوصیات کی طرح ان کی تعلیم کی روش نے بھی ان کی طبیعت کو بنانے میں بڑا حصہ لیا ابتدائی تعلیم کے لئے وہ سیالکوٹ کے ایک قدیم مکتب میں بٹھائے گئے۔ آئندہ فدائی مشرق کے دل میں مشرقی فنون سے عشق کی یہ تخم کاری تھی۔ یہاں اقبال نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں کہ ضرورت زمانہ نے انہیں مکتب چھوڑ کر انگریزی مدرسہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا۔

عموماً یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا کی تمام بڑی ہستیاں اپنی ابتدائی تعلیم میں یا تعلیم کے کسی خاص مرحلہ پر بھی اپنی ہم جماعتوں سے ممتاز رہی ہوں ۔ اور اسی طرح ہر ممتاز طالب علم زندگی کی کشمکش میں کامیاب رہے تاہم اقبال ان ہستیوں میں سے ہیں جو ہر جگہ اور ہمیشہ بلندی کے ممتاز معیار پر رہتی ہیں ۔ امتیاز کے ساتھ انہوں نے ابتدائی وسطانی اور فوقانی تعلیم ختم کی ۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکاچ مشن کالج میں شریک ہونے کے ساتھ ہی انہیں پبلک مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی ۔ وقوع امر سے پہلے اس کے اسباب فطرت کی طرف سے فراہم ہو جاتے ہیں ۔ اس کالج میں اقبال جیسے ذہین طالب علم کو ایک جید عالم کا سہارا مل گیا ۔ یہ مولوی سید میر حسن ہیں جو بعد میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے مولوی صاحب عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے ۔ ان کے شخصی اثر کے متعلق آنریبل سر شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں "ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے اس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں ۔" عربی اور فارسی سے مناسبت طبعی اقبال کو خاندانی ترکہ میں ملی تھی، اس پر میر حسن جیسے عالم کا ساتھ گویا پیاسے اور سمندر کی یکجائی ۔

اقبال کا ذوق سلیم اور عربی اور فارسی زبانوں کا صحیح مذاق اسی تعلق کا نتیجہ ہے ۔ اسی کی دستیاری سے وہ آئندہ اردو سے زیادہ فارسی شاعری میں کامیابی حاصل کر سکے ۔ اور اردو میں نئے فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کے ادا کرنے کے لئے سانچے فراہم کر دیئے ۔ ان کی لفظ تراشی میں جسقدر گہرائی ہے اس سے زیادہ ادبیت بھی موجود ہے ۔ فارسی شاعری میں اقبال کے کارنامے لازوال ہیں ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس آخری دور میں جس طرح اقبال اردو کے بے مثل شاعر ہیں، فارسی میں بھی ان کا ہندوستان میں کوئی مدمقابل نہیں ۔ ایران میں تو اب بڑے شاعروں کا پیدا ہونا گویا مسدود ہی ہو گیا

اسکاچ مشن کالج سے اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا ۔ نہ صرف عربی بلکہ انگریزی میں ان کی ممتاز کامیابی نے انہیں وظیفے اور تمغے دلائے یہیں اقبال کی شاعری کی مقبولیت کی بھی ابتدا ہوئی ۔ شاعر کی حیثیت سے اقبال ان لوگوں میں ہیں جن کی طبیعتیں ابتدا ہی سے بار آور رہتی ہیں ۔

لیکن اقبال کی آئندہ عظمت کا بنیادی پتھر لاہور میں رکھا گیا جہاں یہ بی، اے، کی تعلیم کے لئے آ گئے تھے۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اقبال فلسفہ اپنا اختیاری مضمون لیکر داخل ہوئے۔ گذشتہ لسانی تکمیل کے مرحلہ سے گذرنے کے بعد یہاں فن فلسفہ میں بھی ایک ایسا شفیق استاد مل گیا جس کو خود مشرق اور خصوصاً اسلام سے خاص انس تھا۔ یہ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر آرنلڈ ہیں جو بعد میں سر آرنلڈ ہوئے تھے ان کی شخصیت سے سر شیخ عبدالقادر بھی بے حد متاثر ہیں اور لکھتے ہیں کہ "پہلے انہوں نے علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی"۔ اس دوسرے موقع پر بھی پروفیسر موصوف نے اقبال جیسے شاعر کے خیالات کو سنوارنے میں سعی مشکور کی۔ اور اس طرح اردو کے دو بڑے ادیب ان سے متاثر ہوئے۔

جس طرح اقبال نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے پروفیسر آرنلڈ کے دل میں جگہ پیدا کرلی تھی، اسی طرح آرنلڈ کی اعلیٰ قابلیت نے بھی اقبال پر احترام اور محبت کے لازوال اثرات چھوڑے۔ ان باہمی تاثرات کی ناقابل فراموش یادگار "نالۂ فراق" کے زبردست جذبات ہیں۔ انہیں کی صحبت میں دراصل اقبال کا فلسفیانہ کردار بنا اور نشو ونما پایا۔ یہی وہ تعلق ہے جس نے اردو کو ایک غور وفکر کرنے والا شاعر عطا کیا۔

یوں تو اسکاچ مشن کالج ہی سے اقبال کی شاعری شروع ہو چکی تھی لیکن لاہور میں آکر وہ خوب چمکی۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ دہلی اور لکھنو کی کشمکش سے چھوٹنے کے بعد اردو ادب اور شاعری کو اب لاہور میں ٹھکانا نصیب ہوا تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ کے علاوہ علمی سرگرمی میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دوسرے دہلی اور لکھنو کے بعض بچے کھچے شاعر بھی یہاں جمع ہو گئے تھے۔ جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے قیام نے لاہور کے بازار حکیماں میں ایک بارونق مشاعرے کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اقبال کا ذوق شاعری بھی ان کو کشاں کشاں اس محفل تک لے گیا۔ ان کی قابلیت نے محفل مشاعرہ کے تمام اراکین کو ان کا مداح اور دوست بنا دیا۔ اور خود اقبال کو یہ فائدہ ہوا کہ انہیں مرزا ارشد کی فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا۔

داغ دہلوی سے مشورہ کرنے سے پہلے اقبال نے ارشد گورگانی سے بھی اصلاح لی۔

ابھی دہلی کے آخری شاعر مرزا خان داغ دہلوی زندہ تھے۔ ان کی غزل خوانی کے انوکھے انداز نے انہیں نہ صرف اردو کے پچھلے تمام شاعروں سے ممتاز بنا دیا تھا، بلکہ اپنے معاصرین شعرا میں استادی کا درجہ بھی عطا کر دیا تھا۔ گو یہ ملازمت کے سلسلے میں دکن آ گئے تھے لیکن ان کا فیض ہندوستان بھر میں بواسطہ اور بلا واسطہ برابر جاری تھا۔ اقبال ابتدائی غزل گوئی میں ان کے رنگ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مراسلت کے ذریعہ ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ اس واقعہ کا اثر صرف واقعے کی حد تک نہیں ہے بلکہ اقبال کی ابتدائی غزلوں کو بنانے اور ان کی زبان کو درست کرنے میں بے حد کارگر ثابت ہوا۔ ابتدائی غزلوں کی زبان میں وہ مرزا داغ کی سلاست اور اسلوب میں اسی ندرت کو جگہ دینا چاہتے ہیں، جس سے داغ کی شاعری ممتاز ہے۔ ذیل کے انتخاب سے یہ امر بہ خوبی واضح ہو جائے گا۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی؟ مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا خطا اس میں بندے کی، سرکار کیا تھی؟
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی؟
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی؟

اس طرح کی غزلیں اس میں شک نہیں کہ اقبال کے پاس کم ہیں، لیکن ان کے قصداً نظری کر دیئے جانے کا سخت احتمال ہے۔ اقبال کی طبیعت بچپن سے سنجیدہ واقع ہوئی ہے۔ داغ کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہو گیا ہوگا کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر تکراری مضامین کے سوا ان کے پاس کیا تھا، جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا۔ یقین ہے کہ اقبال نے اس طرح کی غزلیں انتخاب کے وقت خود چھانٹ دیں۔

غزل کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کے سب سے زبردست تاثر کا انکشاف بھی ضروری ہے

داغ کی شاعری سے سیری حاصل ہوجانے کے بعد فطرتاً اقبال کی طبیعت کو غالب کے کلام سے لگاؤ پیدا ہوا۔ غالب کا کلام درحقیقت اقبال کے مطالعہ کے قابل تھا۔ کیونکہ دونوں کی ذہنیت بڑی حد تک مشابہ ہے۔ غالب میں وہی عمق ہے جس کی اقبال کے دماغ کو ابتدا سے تلاش تھی۔ شاعر خصوصاً بڑھتا ہوا شاعر ہمیشہ مضطرب ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی بے چینی کو کہیں سکون مل سکتا ہے تو وہ صرف عمیق خیالات کی دنیا میں۔ اقبال کے متلاشی دماغ کو غالب کے کلام میں ایک ساتھی سا مل گیا۔ اس کے بعد انہوں نے جو غزلیں لکھیں وہ لفظاً اور معناً غالب کی تقلید نہیں تو غالب کے کلام سے متاثر ضرور ہیں۔ ذیل کے اقتباسات کو پڑھیے تو وہی انداز خیال، وہی ٹیڑھی ترچھی چالیں وہی مشکل پسندی اور بعض وقت تو وہی تھوڑی اور معنوی تقلید نظر آئے گی۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی　　ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لب گویا پیام موت　　اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر　　ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

عذر آفرین جرم محبت ہے حسن دوست　　محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی

نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے　　نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے　　مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

سکون دل سے سامان کشود کار پیدا کر　　کہ عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں تک ہے

سکون دل، "سامان کشود کار" "عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں" وغیرہ کا جواب تلاش کیجئے تو سوائے غالب کے دیوان کے اور کہیں نہ ملے گا۔

ؔ اس کے مقابلہ میں غالب کی وہ غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی　　مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

بہرحال اقبال نے ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا۔ داغ سے تحریری صلاح لی مگر غالب سے معنوی استفادہ کیا۔ اور یہ آخری اثر ان کی طبیعت کے مناسب تھا، اس لئے وہ دیرپا ہے اور اب تک کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ان شعرا کے اثرات کا اختلاف ایک اور طرح بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

اقبال نے داغ کے انتقال پر اظہار غم کیا۔

بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں — ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کی جہاں
اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخی طرز بیاں — آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے — لیلی معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز — کون سمجھے گا چمن میں نالہ بلبل کا راز ؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں — آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اس سے بہتر مرزا خان داغ کی شاعری کی تعریف نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر میں اقبال کے جذبات محبت بھی پھوٹ پڑتے ہیں۔

"مرزا غالب" پر بھی ایک نظم لکھی ہے۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا — ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا؟
تھا سراپا روح تو بزم سخن پیکر ترا — زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے — بن کے سوز زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے
محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار — جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار
تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار — تیری کشت فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں — تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں
نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر — محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر
شاہد مضمون تصدق ہے ترے انداز پر — خندہ زن ہے غنچہ دلی گل شیراز پر

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

اس سے بڑھکر کسی شاعر کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ شاعر کے دل پر غالب کا زبردست قبضہ اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات احترام پوری نظم میں ہر جگہ نمایاں ہیں یہی فرق غالب اور اقبال کے اثرات کا ہے۔

"قومی شاعری" کا مضمون حالی نے بہت ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود اقبال اب تک اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اس طرف اقبال کی توجہ کا سبب بھی ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے جب اقبال لاہور کے ادبی خصوصاً شاعروں کے حلقے میں بازار حکیماں کے مشاعرے کی نظموں کی وجہ سے روشناس ہو گئے تو، ان کے دوستوں نے انہیں اس خدمت پر بھی آمادہ کر دیا، جو اس سے پہلے حالی، شبلی اور نذیر احمد انجام دیتے رہے تھے۔ لاہور کی انجمن حمایت اسلام بڑا قدیم ادارہ ہے اس کے سالانہ جلسوں کی افتتاح بھی علی گڑھ کے یا اس سے متعلق چندوں کے جلسوں کی طرح ایک قومی نظم سے عمل میں آتی تھی۔ اقبال بھی دوستوں کے مجبور کرنے سے، اس خدمت کے بجالانے پر آمادہ ہو گئے جو نظم پہلی دفعہ انہوں نے پڑھی وہ "نالۂ یتیم" تھی۔ گو یہ اقبال کی پہلی نظموں میں سے ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد کی نظمیں نقش اولین معلوم ہوتی ہیں۔ جو تسلسل، جو عمق اور جو نتیجہ زائی اس نظم میں ہے، وہ اگلی کسی نظم میں نہیں۔

یہ گویا اقبال کی "قومی نظم" نگاری کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد کئی اور "قومی نظمیں" جیسے "ابر گہربار" "فریاد امت" وغیرہ انہیں سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔

اسی زمانے کا ایک اور اہم واقعہ اقبال کی سر شیخ عبدالقادر سے ملاقات ہے۔ جس کا ذکر شیخ صاحب نے "دیباچہ بانگ درا" میں کیا ہے۔ شیخ صاحب اس وقت اردو کے سب سے بہتر رسالے "مخزن" کو مرتب کیا کرتے تھے۔ اور اقبال سب سے اچھے شاعر بن رہے تھے۔ دونوں میں یگانگت کا پیدا نہ ہونا تعجب کا سبب ہوتا۔ یہ ادبی دوستی، انگلستان میں زیادہ مستحکم ہو گئی۔ چنانچہ

اقبال جب یورپ سے متاع علم لوٹ کر، وطن واپس آنے لگے، تو مال غنیمت سے اپنے وطن کی ذہنی تزئین میں شیخ صاحب کی مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور سے — بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط — اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق — سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر — قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا — سب کو محو رخ سعدی و سلیمی کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلی بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں
گو ہم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ — چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جلیں بزم گہ عالم میں — خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اس میں اقبال کے اس انقلاب خیال کے جراثیم موجود ہیں، جو قیام یورپ میں واقع ہوا اس کے علاوہ ان کی آئندہ شاعری کی عمارت کا نقشہ بھی موجود ہے۔ جس سے ہم آگے مفصل بحث کریں گے۔

شیخ صاحب کی کئی خدمات میں اردو کی ایک یہ خدمت بھی نہایت مہتم بالشان ہے کہ انہوں نے ایک بھٹکے ہوئے شاعر کو رستہ پر لگا دیا۔ یورپ میں اقبال نے شاعری کو ترک کرنے کا جو ارادہ کر لیا تھا وہ شیخ صاحب ہی کی حکمت عملی سے فسخ ہو گیا۔ اقبال کی شاعری کو سمجھانے میں بھی شیخ صاحب نے یہ احسان کیا کہ سب سے پہلے اس کے تین نمایاں دوروں کا پتہ لگایا جس پر اکثر بعد کے تنقید نگاروں کے خیالات مبنی ہیں۔ اقبال کی بعض بہترین نظمیں جیسے "ہمالہ" "تصویر درد" وغیرہ شیخ صاحب کے رسالے "مخزن" ہی میں پہلے پہل شایع ہوئیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے اقبال نے بی، اے، اور ام اے، کے امتحانات امتیاز کے ساتھ کامیاب کئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں پہلے اورنٹیل کالج لاہور، اور پھر اپنی قدیم درسگاہ گورنمنٹ کالج

ہیں پروفیسر ہو گئے۔ اس وقت تک اقبال کی شاعری مخصوص اداروں یا مشاعروں کی غزل خوانی سے آزاد ہو کر عام ہو گئی تھی۔ اب نظموں کو پڑھکر سنانے کا موقع باقی نہیں رہا تھا، عوام ان کا استقبال کرنے کے لئے ہر جگہ تیار رہتے تھے۔ اور یہ اخبارات اور رسائل کے ذریعہ ان تک پہنچ جاتیں، شاعر کا مضمون مخصوص نہیں ہوتا، اس کا دل مصوری کا آلہ ہوتا ہے جس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی غلام قوموں کے مابینی اختلافات اور ان کی خیالی بنیادوں پر جان توڑ کش مکش نے ہر جگہ اُدھم مچا رکھا تھا۔ اقبال بھی ہر دردمند کی طرح اس حالت کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہوتے، اور فریاد کرتے ہیں۔ اسی سبب سے ان کی اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا جز غالب ہے۔ "ہمالیہ" صدائے درد"، "تصویر درد"، "نیا شوالہ"، "ترانہ ہندی" وغیرہ نے اقبال کو حالی اور اکبر کی صف میں نمایاں جگہ دلادی۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ گئے۔ جاتے ہوئے بجائے دنیوی سفارشات فراہم کرنے کے، وہ روحانی استعانت کے لئے حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ پر گئے۔ مزار پر جو نظم پڑھی وہ کئی پہلو سے اہمیت رکھتی ہے۔ پہلے تو اس سے شاعر کی طبیعت کا رجحان معلوم ہوتا ہے پھر جو التجا کی ہے وہ دنیوی طالبوں کی طرح عزت و ثروت یا شہرت کی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ علمی معیار کے حصول ہے جو شاعر کا نصب العین تھا۔

نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں　　　کیا خدا نے نہ محتاج باغبان مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں　　　تری دعا سے عطا ہو وہ نردبان مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے　　　کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے　　　کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

یورپ میں اقبال نے اسی نصب العین کے حاصل کرنے کی سعی کی۔ انہیں جو بچپن سے عربی، فارسی اور پھر فلسفہ کا شوق تھا۔ تحقیقات بھی کی تو انہیں سے متعلق۔ ڈاکٹری کے لئے "ایران اور

مابعد الطبیعات" پر مقالہ لکھا۔ لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ باقی وقت ان کا مشرقی اور مغربی زبانوں کے شاہکاروں کے مطالعہ میں صرف ہوا۔ جن میں فلسفہ کی حد تک شوپن ہار، ہیگل، کانٹ برگساں، لاک۔ اور شاعری میں شیکسپیئر، بائرن، براؤننگ۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یورپ کے قیام میں اقبال کی ملاقات بعض ایسے علما سے ہوگئی جن کی دنیا میں کافی شہرت ہے یہ پروفیسر براون، آنجہانی ڈاکٹر نکلسن وغیرہ ہیں۔ ان میں بعض کی دوستی کو اقبال کی حیات کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ان کی شاعرانہ قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جب اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نظم "اسرار خودی" لکھی تو ڈاکٹر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے تعلیقات کے ساتھ اس کو شائع کیا اس ترجمہ نے دراصل اقبال کو انگریزی اور دوسرے مغربی علما کے وسیع تر حلقوں سے روشناس کیا یورپ ہی میں اقبال کی فارسی شاعری کی ابتدا اور شہرت ہوئی۔ اس کی ابتدا کا واقعہ سر شیخ عبدالقادر نے اپنے مقدمہ "بانگ درا" میں بیان کیا ہے (ص ۹) پہلی ہی غزلیں لکھنے کے بعد اقبال کو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت فارسی شعر گوئی میں بھی ویسی ہی رواں ہے جیسی اردو میں تھی۔ یہ ایک انکشاف تھا جس سے اقبال نے بے حد فائدہ اٹھایا۔ ان کی بہترین شاعری فارسی میں ہے۔ اردو میں اس کے فطری حدود کے لحاظ سے ان کی شاعری ہندی اور ہندوستانی تھی لیکن فارسی شاعری کا مخاطب تمام عالم اسلامی ہوگیا فارسی شاعری میں اس وسعت کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔

یورپ ہی کے قیام سے متعلق ایک اہم بات اور رہ گئی ہے۔ یہاں رہ کر اقبال نے جس طرح علمی خزانوں کو ٹٹولا۔ اسی طرح ذہنیتوں اور معاشرہ کا بھی بغور مطالعہ کیا۔ جو انقلاب ان مشاہدات سے ان کے نقطۂ نظر میں پیدا ہوا۔ وہ ان کی فارسی سے کم مگر اردو شاعری میں بے حد نمایاں ہے۔ کیونکہ فارسی شاعری دراصل یورپ کے بعد شروع ہوئی لیکن یورپ جانے سے پہلے کی اردو شاعری، بعد کی شاعری کے لئے موازنہ کا کام دیتی ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے جانے کے بعد لندن یونیورسٹی میں عربی کے معلم مقرر ہو گئے تھے۔

اتفاق سے جن دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے، پروفیسر صاحب کو کسی مجبوری کی وجہ سے رخصت لینی پڑی تھی۔ ان کے غیاب میں اقبال ان کا کام انجام دیتے رہے۔ یہ ایک ہندوستانی کے لئے، اس کی قابلیت کا قابل فخر اعتراف ہے۔

۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے وطن واپس ہوئے۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد گورنمنٹ کالج کی ملازمت کو ترک کر کے وکالت شروع کر دی۔ اقبال کی شاعری کا یہی بہترین اور پختہ کارانہ دور ہے۔ یہ دور شاعری کی کیفیت اور کمیت دونو لحاظ سے بے حد اہم اور درحقیقت پہلی شاعری کا منتہا ہے۔

ہم نے اوپر کہیں اس کا ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے سر شیخ عبدالقادر نے اقبال کی شاعری کے تین دوروں کا پتہ لگایا پہلا دور ابتدائی مشق سے لیکر ۱۹۰۵ء میں اقبال کے یورپ جانے تک ہے۔ دوسرا دور قیام یورپ کا اور تیسرا ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام اور اس کی ذہنیت کا ارتقا معلوم کرنے کے لئے خاص خاص زمانوں میں شاعر کے میلانات کا پتہ لگانا ضروری ہے خصوصاً وہ شاعر جو اپنے عہد کی پیداوار ہو۔ اقبال کی شاعری میں ان تینوں زمانوں کا فرق اس قدر نمایاں ہے کہ وہ نقاد جو ان کی حیات، ماحول اور ان کی طبیعت پر ان کے اثرات سے ناواقف ہو شاید ان کی بعد کی یا پہلی نظموں کو ان کے نام سے منسوب کرنے میں پس و پیش کرے۔ بعض حالات میں ان کا نقطہ نظر اس قدر بدل گیا ہے کہ پہلے سے متضاد معلوم ہوتا ہے۔

پچھلے صفحات میں اقبال کی حیات کے ان تمام اہم پہلوؤں پر ہم نے کافی روشنی ڈالی ہے جن سے ان کی شاعری مختلف اوقات میں متاثر رہی۔ ہمیں امید ہے کہ ان امور کی مدد سے ان کی شاعری کی اسپرٹ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

اگلے اور پچھلے تمام شاعروں کی طرح اقبال کو بھی نمود حاصل کرنے سے پہلے، شاعر سازی کے کارخانے سے بھی گذرنا پڑا۔ متقدمین کی طرح اقبال کی ابتدا بھی غزل کی شاعری سے ہوئی۔ انہیں قدیم استادان فن کی شاگردی بھی کرنی پڑی جس کی تفصیلات پیچھے گذر چکی ہیں۔ اقبال نے قدیم شاعری کی مشق سے

اتنا ہی فائدہ اٹھایا جتنا کسی پہلے اساتذہ سخن نے اٹھایا تھا۔ لاہور میں انہیں ارشد گورگانی سے بہتر شاعر نہیں مل سکتا تھا اقبال نے ان سے تلمذ حاصل کیا۔ پھر جب نظر اور وسیع ہوئی۔ تو داغ جیسے استاد فن کو غزل دکھائی اس طرز سے بھی سیری ہوگئی تو پھر وہ غالب کی شاعری سے استفادہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان تینوں اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد بھی اقبال نے ایک سچے شاعر اور متلاشی حقیقت کی طرح دنیا کے دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے کلام سے الہام حاصل کیا جو کچھ سیکھا تھا اس پر قانع ہونے کی بجائے انہوں نے اپنی اپج سے کام لے کر قدما کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔ غزل کی شاعری میں جب یہ پختہ کار ہو گئے تو مغربی شعرا کے کلام سے بہترین خیالات اور بہترین اسالیب کو انہوں نے اپنا نمونہ بنایا۔ پڑھنے والی اقوام کے افراد کا یہی اصول رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی غزل کی شاعری کا بڑا حصہ ہماری نظر کے سامنے نہیں ہے۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے، وہ بھی صرف ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے غرض اس باقیات الصالحات کے متعلق جو بھی کہا جا سکے سب صحیح ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ اس سے غزل کی صنف پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ جہاں داغ کی پیروی کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ داغ کی روح کو اپنے جسم میں داخل کر لیا ہے۔ وہی سادگی، وہی شگفتگی اور وہی زبان کا چٹخارا ہے جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ بعد میں جب غالب کے کلام نے ان پر تسلط جمایا تو یہ غالب ہی کے رنگ میں کہنے لگے تھے۔ اگر یہی مشق سخن جاری رہتی تو ہمیں توقع ہے کہ اردو میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو جاتا۔ داغ کی شاعری سے زبان کی روانی اور سلاست سیکھنے کے بعد غالب کی سنگین فکر کے تتبع نے انہیں ایک مکمل غزل گو شاعر بنا دیا تھا۔ یہ ابتدائی مرحلے، آئندہ شاعری کا پیش خیمہ ہیں۔

اساتذہ فن کی شاگردی سے نکل کر شاعر نے جب اپنے اطراف پر نظر ڈالی تو اس کے سامنے آزاد، حالی، شبلی اور اسمٰعیل کی شاعری کے نمونے موجود تھے۔ اقبال کے پاس ان کا مطالعہ یہ معنی تو رکھ نہیں سکتا تھا کہ آنکھ بند کر کے اسی روش پر گامزنی شروع کر دی جائے۔ ان کے مطالعہ کے ساتھ ہی ان کے خیالات اور

مطمح نظر کی طرف توجہ کا منعطف ہونا ضروری تھا۔ فطرتاً اقبال بھی حالی اور اکبر کی قومی اور معاشرتی فضا میں چلنے پھرنے لگے۔ ہر نوعمر انگریزی خواں کی طرح وطن اور قوم کی محبت کے جذبات ان کے دل میں بھی ابھرنے لگے ہندوستانیوں کی جو حرکت ان کو ناگوار معلوم ہوتی وہ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ عوام کے افعال میں مستقبل کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ حالی کی طرح قوم کی غلطیوں سے اقبال بھی اسے مطلع کر دیتے تھے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ منافشات پر ان کا جی جلتا تھا۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو ایک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی غضب ہے

لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

رُلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنیوالی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

وطنی نظمیں اقبال کی اس قدر مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں خصوصاً وہ نظم جس کا عنوان "ہندوستاں ہمارا ہے" صدائے درد" "ہمالہ" "تصویر درد" وغیرہ میں بھی وطنیت کا احساس شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

ان نظموں کے علاوہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعرا جیسے ٹینی سن امرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ یہ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظموں کا اولین نقش ہیں۔ اس دور کے اکثر شعرا جنہوں نے مغربی نظموں کے مقابلہ میں نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے، وہ پہلے پہل مغربی شعرا کے کلام کو نمونہ بناتے رہے ہیں۔ ماخوذ خیالات میں اقبال نے عموماً ایسی فلسفیانہ نظمیں انتخاب کی ہیں، جو اردو

اردو میں آنے کے بعد اس کا ایک جز معلوم ہونے لگی ہیں۔ یہ تقلید کی بڑی کامیابی ہے۔ ایسی نظمیں اقبال نے عموماً بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ لیکن وہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔

فطرت کی عکاسی اور قلبی جذبات کے اظہار کے حقیقی اسالیب اردو میں میر حسن، میر انیس اور نظیر اکبرآبادی کے زمانے سے پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن اس نقطہ نظر سے ان شعرا کے کلام کو حالی سے پہلے بہت کم اہمیت دی گئی۔ آزاد اور حالی نے جب شاعری کا رخ بدل دیا تو فطرت نگاری کی اہمیت خواص و عوام پر روشن ہوئی۔ اسمٰعیل میرٹھی نے اردو شاعری کے اس خاص پہلو کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ اقبال کی شاعری جب شروع ہوئی تو لوگوں کی توجہ قدیم طرز کی شاعری سے ہٹ کر اسی طرح کی فطری شاعری پر جم گئی تھی۔ گو تنوع کے نہ ہونے سے یہ میدان اس وقت تک صرف حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری پر محدود تھا لیکن اقبال کی فطری نظموں نے نہ صرف اس میدان کو وسیع کیا، بلکہ آئندہ شعرا کے لئے بے شمار راستے کھول دیئے۔ "ہمالہ" "گل رنگین" "ابر کہسار" "آفتاب صبح" "پیام صبح" "چاند" "صبح کا ستارہ" وغیرہ۔ اقبال کی منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح جذبات کا صحیح مگر شاعرانہ اظہار جس طرح "مرزا غالب" "داغ" "تصویر درد" "کنار روائی" میں کیا گیا ہے، ان سے پہلے کی اردو نظموں میں شاید ہی مل سکے۔ خود حالی کی نظمیں اس حیثیت سے بہت معمولی ہیں۔ اسمٰعیل کی منظر نگاری میں اقبال سے زیادہ گھلاوٹ اور سلاست ہے۔ گو ان میں اقبال کی سی گہرائی نہیں ہے۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابتدائی نظموں میں اقبال کا شخصی عنصر اور ذاتی خیالات کی جھلک بھی بے حد موثر ہے۔ فکر عمیق کے آثار اقبال کی چھوٹی سی چھوٹی اور سطحی سے سطحی نظم میں صاف ظاہر ہیں۔ اقبال نہ صرف فلسفہ کے متعلم ہیں بلکہ اچھے مفکر بھی ہیں۔

اقبال کے اسلوب اور اکبر الہ آبادی کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ضرور ہیں اور وہ مقطع۔ لیکن اقبال کے کلام میں چند ظریفانہ نظمیں بھی ہیں۔ ان کے ماخذ کی تلاش کے لئے اکبر کے کلام کے اثر کی طرف راہنمائی بے جا نہ ہوگی۔ کوئی وجہ نہیں کہ نوعمر اقبال اکبر کے مقبول طرز شاعری سے کورے رہے ہوں۔ ذیل کے اقتباس کو کون اکبر کے اثر سے محفوظ خیال کر سکتا ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر — وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ — دفعِ مرض کے واسطے "پل" پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — دل پانتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا لپس از سبق — کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل" پیش کیجئے

اکبر کا یہ اثر اقبال پر بہت ہی نام نہاد ہے۔ اصلی اثر وہ ہے جس سے ان کی شاعری کی اصولی تعمیر میں مدد ملی۔ اردو شاعری کے ارتقاء کا یہ وہ رشتہ ہے، جو میر حسن سے شروع ہو کر انیس، نظیر، آزاد، حالی اور اسمٰعیل سے گذرتا ہوا، اقبال تک پہنچ رہا ہے۔ حالی اپنی بنیادی کوششوں میں جن شعراء کا خواب دیکھ رہے تھے، وہ درحقیقت اقبال ہی جیسے سخن آرا ہیں۔

شاعری کا ایک پہلو تربیتی بھی ہوتا ہے۔ شاعروں کے خیالات اقوام کی درستی میں بڑا حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس حیثیت سے قدیم اردو شاعری بہت کم اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ قوم کی کسی حالت سے تعرض نہیں کرتی۔ بعض شعراء کے کلام میں اخلاقی نکتے ملتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر تصوف کے ضمن میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اور اس قسم کے اشعار اس قدر تھوڑے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہے۔

گو آزاد جدید شاعری کے سب سے پہلے علم بردار ہیں۔ لیکن ان کی نظمیں قومی حالت سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے، انہیں حالی کے مقابلہ میں عقبی زمین میں ڈال رہی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تاریخ ادب کے سوا شاعر کی حیثیت سے آزاد کا ذکر آئندہ نسلوں میں بالکل نہ ہو اس کے برخلاف حالی کی شاعری باوجود سیدھی سادی ہونے کے زندہ ہے۔ اور ہمیشہ زندہ رہیگی۔ وہ قوم کی زندگی سے وابستہ ہوگئی ہے اس نے نہ صرف شاعری کے بنیادی خیال میں ایک انقلاب برپا کیا، بلکہ موجودہ تعلیم اور معاشرت کے بہت سے مسائل سے وہ واصل ہے۔ اور قوم کے اخلاق، خیالات، کردار کو درست کرنے کی

کوشش کرتی ہے وہ قوم کو بیدار کرتی ہے اور اس کے سامنے ایک نصب العین بھی قائم کرتی ہے۔ یا جیسے بعض وقت کہا گیا ہے۔ حالی کی شاعری کا ایک معین "پیغام" ہے

پھرو تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو'

گویا حالی ایک جدید قوم کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ اسمٰعیل کی شاعری فروعات میں حالی سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کی اصلی اسپرٹ وہی ہے جو حالی کی شاعری کی ہے۔ بلکہ ایک جز یعنے فطرت نگاری میں وہ حالی سے مشترک بھی ہے۔

اکبر قدامت پرست طبیعت کے انسان تھے۔ اس لئے حالی کی جدید تعمیر سے' وہ پوری ہمدردی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ قوم کو غفلت سے بیدار تو کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو مغربی تقلید کے غار میں اندھے کی طرح گرتے ہوئے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھ کر ترقی کی راہیں اختیار کریں۔ زمانے کی ہر آن تبدیلی کے ساتھ اپنی حالت کو بدلنا انہیں پسند نہیں تھا۔

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کہہ ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے۔ بدلنے ہی کو بدل رہا ہے

قومی اور وطنی جذبات سے لبریز دل اقبال جب اس اختلاف پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو انہیں قوم کی زبون حالت پر حالی کے ساتھ ماتم کرنا پڑتا ہے۔ ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال کے پاس یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن مرض کے علاج کا ان کے پاس کوئی معین نسخہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس دور کی شاعری کے متعلق ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے اور اپنے ہم قوموں کے لئے کیا راستہ تجویز کرتے ہیں۔ اسی واسطے اس دور کی شاعری کو بعض بزرگوں نے تذبذب، تلاش اور اضطراب کی شاعری بھی کہا ہے۔ اقبال کی طبیعت کا یہ انتشار نہ صرف قومی نظموں سے ظاہر ہے، بلکہ دوسری نظمیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ "شمع" "خفتگانِ خاک سے استفسار" "شمع اور پروانہ" وغیرہ سے یہ خصوصیت صاف ظاہر ہے

درحقیقت جو شاعرِ دنیا کی ہر چیز کی ماہیت دریافت کرنا چاہتا ہے لیکن ابھی فطرت کے راز اس کی سمجھ سے بالا معلوم ہوتے ہیں۔ آخرش وہ پریشان ہو کر کہنے لگتا ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

پھر وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ یہ رازہائے فطرت جو اس کے لئے معمہ ہیں اس پر منکشف ہو جائیں

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

بعد کے دور کی نظموں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو عشق کی تلاش تھی جس کے بغیر زندگی بے لطف ہو رہی تھی۔ تنہائی میں اور مجمعے میں غرض ہر جگہ وہ اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی نصب العین ابھی تک معین نہیں ہوا جس کے لئے وہ بے چین ہے۔

یہ انتشار یورپ میں جانے کے بعد رفع ہو جاتا ہے۔ اور شاعر وہیں سے آئندہ کے لئے ایک تجویز سوچ کر وطن واپس آتا ہے۔

غرض اس دور میں اقبال مجموعی حیثیت سے وطن پرست شاعر رہے۔ قومی نظموں سے ہٹ کر انہوں نے جو نظمیں اس دور میں لکھیں وہ بھی بلند پایہ ہیں۔ ان کا آئندہ اعلیٰ فلسفیانہ اور صوفیانہ کردار ان نظموں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ "گل رنگیں" "خفتگان خاک سے استفسار" "شمع" "ماہ نو" "انسان اور بزم قدرت" "بچہ اور شمع" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے کائنات کے مہتم بالشان مسائل جیسے حیات، حیات کے ماخذ، حیات کا مقصد، انجام حیات اور حیات بعد الموت اور عشق اور حسن وغیرہ سے بحث کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی تہ تک پہنچنے کی وہ کوشش کرتے ہیں۔ کہیں تو وہ اس عالم صغیر یعنے انسان اور اس کی قوتوں پر غور کرتے ہیں۔ کہیں وہ انسان اور بیرونی کائنات کو بالمقابل رکھ کر دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انہیں انسان کی ہنگامہ آرائی اور نیچر کی خاموش کارگزاری میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ جس چیز کی اہمیت

کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ جاتے ہیں، اس کے لئے خدا سے استعانت طلب کرتے ہیں۔

یہ دور "التجائے مسافر" پر ختم ہوجاتا ہے۔ جس نظم میں شاعر نے اپنے اعلیٰ نصب العین کے حصول میں استقلال کی اس درگاہ سے دعا مانگی ہے۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور قیام یورپ کا ہے۔ یورپ میں اقبال کا زمانہ بہت مصروف گذرا۔ ایک طرف تو وہ علمی سرمایہ کو سمیٹ رہے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی معاشرت، تمدن اور سیاست پر بھی ان کی نظر جمی ہوئی تھی۔ ان کا مضمون چونکہ اسلامی فلسفہ اور خاص کر ایرانی فلسفہ تھا۔ اس لئے ان کی طبیعت جس کو پہلے سے عربی اور فارسی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس مضمون میں خوب مشق ہوئی۔

یورپ میں اقبال کی شاعری کا جو زاویہ نظر بدلا اس کے بے شمار قدرتی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ فطری لگاؤ کی وجہ سے مقالہ کے لئے جو موضوع اختیار کیا، وہ ان کو اسلامی فلسفہ سے بخوبی روشناس کروانے والا تھا۔ دوسری اتفاقی بات یہ ہے کہ اقبال کو اپنی فارسی زبان پر قدرت کا انکشاف یہیں ہوا۔ تیسرے انہوں نے یورپ کی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر اس سے پہلے ان کے خیالات یورپ کو اپنا نمونہ بنانے کے تھے تو وہ بدل گئے۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ پہلے وہ صرف ہندوستانی اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے شاعر تھے۔ ہندوستان سے باہر نکل کر انہوں نے جب تمام عالم اسلامی پر ایک عام مصیبت کو مسلط دیکھا، تو ان کی ہمدردی وسیع تر ہوگئی۔

اسلامی فلسفہ کی تحقیق نے اقبال کو حقیقی اسلام، اس کے سادہ ترین اور مہتم بالشان اصول زندگی اس کے مطمح نظر اور اگلے مسلمانوں کی عظمت سے کماحقہٗ روشناس کردیا، اگلی عظمت کے مقابلہ میں موجودہ مصیبت کو دیکھ کر ان کے ہمدردانہ جذبات میں تحریک پیدا ہوئی۔ اور انہیں یہیں سے آئندہ نظموں کا موضوع مل گیا۔ پہلے اقبال کا یہ خیال تھا کہ مسلمان وطن پرست بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن اب یہ خیال کمزور پڑ گیا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ ہندوستانیوں میں جو خیالی تفریق پیدا ہوگئی تھی، وہ دور ہوتی ہی نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ ہندو کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا "بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا"۔ اس بے سود کام

پر اپنی ہمت ضایع کرنے کو انہوں نے فضول سمجھا۔ اس کی بجائے بالواسطہ طریقوں سے مسلمانوں میں رواداری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ کیونکہ نصیحت براہ راست ہمیشہ زبوں گوش ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس تبدیلی خیال میں یہ حکمت بھی مضمر تھی کہ جب تک قومیں کسی اعلیٰ نصب العین کے حصول میں سرگرم نہ ہوں، وہ اختلافات کے خیالات ہی کو اپنا میدان عمل سمجھتی رہتی ہیں۔

اب دقت یہ تھی کہ اردو جو ہندوستان کی زبان ہے۔ صرف ہندوستان ہی تک محدود ہے۔ بیرونی مسلمانوں تک اس کی رسائی ناممکن ہے۔ اس کا حل انہیں اتفاقاً ہاتھ آگیا تھا۔ فارسی میں بھی یہ آسانی سے شعر لکھنے لگے تھے۔ اس لئے انہوں نے فارسی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنالیا تاکہ مسلمانوں کا زیادہ وسیع حصہ اس کو پڑھ سکے۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد زیادہ توجہ اقبال نے فارسی شاعری پر صرف کی گو اردو میں بھی وہ برابر لکھتے رہے۔

یورپ کی سیاسی اور معاشرتی حالت کے مشاہدے اور مطالعہ نے اقبال کو ان کی خامیوں سے واقف کیا۔ یورپ کی سیاست جس قدر پیچیدہ ہے، اس سے زیادہ سقیم بھی ہے۔ پیچیدگی یہ ہے کہ ان اقوام کا جو اصول ہے اس پر ان کا عمل نہیں۔ اور جب اصول اور عمل دونو موجود ہوں تو ان میں صداقت نہیں۔ یورپی قومیں آزاد اپنے آپ کو اسی وقت سمجھتی ہیں جب کہ ان کا کوئی غلام ہو۔ اور وہ کسی قوم کی عزت اسی وقت کرتی ہیں، جب وہ اس سے ڈریں۔ ان کی سیاست کی بنیاد اس پر ہے کہ جس قدر ممکن ہو، مادی اور سائنس کے وسائل سے دنیا کی دوسری قوموں کو تباہ اور برباد کردیا جائے تاکہ ان کا بول بالا ہو۔ معاشرتی حالت میں جو اسقام ہیں ان کا تفصیلی ذکر ایک کتاب چاہتا ہے۔ سرمایہ دار اپنے ہی ہم جنس اور ہم قوم غریبوں اور مزدوروں کا خون چوسنے کے لئے بے چین ہیں۔ ادنیٰ طبقے زندگی کی کم سے کم ضروریات کے لئے بھی دوامی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ مگر امرا کو اپنے عیش و آرایش سے سیری ہی نہیں ہوتی۔ پھر ان اقوام میں ظاہر پرستیاں ایسی ہیں کہ جن کی زندگی کے لئے قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ یورپ اپنے سائنس اور دوسرے مادی وسائل کی مدد سے دنیا کو خدمت کے بجائے تباہ کر رہا ہے۔

جب اقبال دنیا کی راہنما قوموں کی حالت سے مایوس ہو گئے تو انہیں مجبوراً صدر اسلام کی زندگی کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اسلام کے وسیع اصول مساوات، حریت اور اخوت، اور ان پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونے ہی میں اقبال کو نجات نظر آنے لگی۔ اسلام ہی کا نظام معاشرت ان کے لئے اب دارالامان باقی رہ گیا تھا۔ فطرۃً وہ ادھر متوجہ ہو گئے۔ ان کے دل میں مقصد حیات کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا وہ مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ بنی نوع انسان کی فلاح کا خیال پختہ ہو گیا۔ اب وہ تمام عالم میں کسی کو اپنا اور غیر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کا دارالامان سب کے لئے تھا۔ گویا "عشق" کی چنگاری جو ان کے دل میں فروزاں ہوئی تھی بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اب وہ تذبذب جاتا رہا اور مثالثی حقیقت کو حقیقت کا پتہ لگ گیا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا — بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ کہ سحر میں وہ — چشم نظارہ میں نہ تو سرمہ امتیاز دے

یہ خیالات درحقیقت الہام ربانی سے کم نہیں ہیں۔ آگے چل کر وہ صاف طور سے بیان کرتے ہیں۔ یہ "عشق" جس کی دنیا کو ضرورت ہے، یورپ سے نہیں مل سکتا۔

پیر مغاں فرنگ کی مئے کا نشاط ہے اثر — اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو نہ تو خمار ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم کہن بدل گئی — اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

یہی پیام محبت انہوں نے یورپ سے علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام بھیجا تھا۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے — عشق کے درمند کا طرز کلام اور ہے
آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا — اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں فوق طلب اگر نہ ہو — گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے
بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی — رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی

۱۹۱۰ء میں ایک غزل اقبال نے لکھی تھی۔ اس میں اپنے زاویہ نظر کی تبدیلی، اور حقیقت حال کے

آشکار ہونے کی تفہیم عجب شگفتہ انداز میں کی ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا — سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خاموشی نے آخر — جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
گل کھرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹا دیا تھا — سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
سفینۂ برگ گل بنالے گا قافلہ مور ناتواں کا — ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

اسی غزل میں اپنی عالم دوستی کا اظہار یوں کیا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے — میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

نظر اس قدر وسیع ہو جانے کے بعد، اقبال کے ذہن سے وطنیت کا خیال بھی نکل جانا ضروری تھا۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا — بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا کہاں کا جانا قریب ہے امتیاز عقبیٰ — نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

انہیں خیالات کو انہوں نے بعد کی ایک فارسی نظم میں بھی ظاہر کیا جو "پیام مشرق" میں شایع ہوئی ہے

از من اے باد صبا گوے بدانائے فرنگ — عقل تابال کشودہ است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند — عشق رعقل فسوں پیشہ جگردار تر است

کیمیائے سازہ ریگ روانش زر کرد — بردل سوختہ اکسیر محبت کم کرد
وائے بر سادگی ما کہ فسونش خوردیم — رہزنے بود کمیں کردہ آدم زد
ہنرش خاک آورد ز تہذیب فرنگ — باز آں خاک بہ چشم پسر مریم زد

زرم بر بزم پسندید و سپاہے آراست — تیغ او حرز بہ سر و سینہ یاراں نہ نشست
رہزنی را کہ بنا کرد جہاں بانی گفت — ستم خواجگی او کمر بندہ شکست

گو اقبال مغربی تہذیب سے مایوس ہو گئے تھے لیکن انہوں نے یورپ کے اکثر علما، جیسے شوپن ہار، نیٹشے، ٹالسٹائی، کارل پاکس، ہیگل، آئین اسٹائین، بائرن، پٹوفی، آگسٹس کومٹ، گوئٹے، برگساں، لاک، کانٹ، براؤننگ، شکسپیر وغیرہ میں سے جس کسی کی تعریف کی ہے، اس قدر دل کھولکر کی ہے کہ ان کی وسیع نظری کا اس سے پتہ چل جاتا ہے۔

اس دور میں اقبال کی ذہنیت کس قدر بلند ہو گئی تھی اس کا ثبوت پہلی ہی نظم سے ملتا ہے جس کا عنوان "محبت" ہے۔ یہ نظم محبت کے اجزائے ترکیبی سے آگاہی حاصل ہونے یا دوسرے الفاظ میں عشق کی حقیقی ماہیت کے دل پر القا ہونے کے بعد لکھی گئی ہے۔ حقیقت حسن کو بھی وہ اب سمجھ جاتے ہیں

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

ان حقایق کے انکشاف کے بعد وہ دنیا کو اپنا پیام سناتے ہیں۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا — بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے
شان کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشائے کی — دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے!
صورت شمع نور کی ملتی نہیں قبا اُسے — جس کو خدا نہ دھیر میں گریہ جاں گداز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہ سحر میں وہ — چشم نظارہ میں نہ تو سرمہ امتیاز دے
عشق بلند بال ہے رسم و رہ نیاز سے — حسن ہے مست ناز اگر تو بھی جواب ناز دے

اس نظم سے اور ذیل کی نظم سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی سعی کا محور بدل گیا۔ لیکن ان کا مذہب وہی باقی رہا جو پہلے تھا یا اگر بدلا تو رنگ و بو کے امتیاز یا مسالک و عقاید کے اختلاف پر مبنی نہیں بلکہ یہ مذہب بسیط عشق ہے۔ مذہب یا عقائد کے لحاظ سے وہ کسی کے دوست ہیں نہ دشمن عقائد میں وہ صوفی ہیں۔ اور نظام معاشرت میں مسلمان۔

شان کرم پہ ہے مدار عشق گرہ کشائے کی — دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے

اسی خیال کو "سوامی رام تیرتھ" کے عنوان کی نظم میں اس طرح ادا کیا ہے۔

نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق

ان کی حقیقت شناس نظر نے یورپ سے بھی کئی مفید باتیں اخذ کیں ان میں سب سے نمایاں "پیغام عمل" ہے جو یورپی اقوام کا بڑا سرمایہ امتیاز ہے اس کی تلقین ہر جگہ فارسی اور اردو شاعری میں کرتے ہیں

مرا صاحبدلے این نکتہ آموخت ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

ہمائے علم تا افتد بدامت یقین کم کن، گرفتار شکے باش

عمل خواہی؟ یقین را پختہ تر کن یکے جوئے و یکے بین و یکے باش

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی ہے یہی اے بےخبر راز دوام زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سرّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

یورپ سے نکلتے ہوئے اقبال نے جو معرکتہ الآرا نظم "شیخ عبد القادر کے نام" لکھی ہے۔ وہ گویا اس دور کی شاعری کا لب لباب اور آئندہ دور کی شاعری کا پیش نامہ ہے اس نظم کے لب و لہجہ کی بلندی کو دیکھ کر گرامی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے

در دیدہ معنی نگہان حضرت اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتوان گفت

اقبال کی شاعری کا آخری دور ۱۹۰۸ء کے بعد کا ہے اسی سنہ میں وہ ہندوستان واپس ہوئے یہ دور درحقیقت اقبال کی شاعری کا زرین دور ہے۔ اس دور کی شاعری نے اقبال کے لئے دنیا کے لازوال شعرا کے زمرہ میں جگہ نکال لی ہے اور اس دور کی شاعری ہی اقبال کی زندگی کا ماحصل۔ اور ان کی شعری کوششوں کا منتہا ہے۔

اس دور کی شاعری کی تمہید بہت تھوڑی ہے۔ کیونکہ اس کا بیشتر حصہ دوسرے دور کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

اقبال نے یورپ میں جو ہیجان شاعری کا پیدا کیا تھا، اب وہ عملی صورت اختیار کرنے لگا ان کی

ہمدردی کائنات کے ہر اس ذرہ کے ساتھ تھی جو مصیبت میں ہو۔

من دریں خاک کہن گوہر جان می بینم — چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بآغوشِ زمین است ہنوز — شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم

ان کا مذہب اور مسلک صوفیانہ یعنے عشق و محبت تھا۔ ایسا عشق جو کائنات کے ہر ذرہ کے ساتھ ہو، ہر ذی حیات کے ساتھ ہو، ہر فرد بشر کے ساتھ ہو، اور حسن وحیات کے مخرج کے ساتھ ہو۔ اسی لئے اس دور کی شاعری میں "عشق" کی تلقین بڑے شد و مد کے ساتھ کی ہے۔ عشق ہی ان کو دو تو عالم کا حکمران نظر آتا ہے۔ کائنات کے ہر ذرہ کو دوسرے ذرے کے ساتھ عشق ہے۔ اس لئے ایسی حیات کو وہ بدتر از موت تصور کرتے ہیں جس میں عشق کی جھلک نہ ہو۔ پھر جس طرح قدیم شعرائے اردو نے عشق کے ساتھ وحشت یعنے حرکت کو ضروری سمجھا تھا، یہ بھی حرکت یعنے عمل کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ عشق تو ایک مذہب ہے اور اس کے ارکان عمل کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ آخری ترمیم گویا اقبال کا اپنا اضافہ ہے۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے — زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں — ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے — پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے
یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عمل کا میدان وہ صدر اسلام کے اصول کو بتلاتے ہیں۔ شاعر کے عقیدے میں یہی دنیا کی موجودہ کشمکش کا حل ہو سکتا ہے۔ اور یہی دنیا کے لئے دارالامان بن سکتا ہے۔

خضر کا پیغام کیا ہے؟ یہ پیام کائنات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے — سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی دستور ہے، مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

اس آخری دور میں اقبال کی اردو شاعری، فارسی شاعری کے مقابلے میں مدھم پڑ گئی تاہم اردو شاعری فارسی شاعری کا تتمہ رہی۔ فارسی شاعری کی پوری اسپرٹ اس میں موجود ہے فارسی شاعری کے آغاز اور اس کی طرف زیادہ تر توجہ کے اسباب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ لیکن ایک چیز جو یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اقبال نے ایرانی فلسفہ کی جو تحقیقات کی تھیں اس سے انہیں بڑی مدد آئندہ فارسی شاعری میں ملی۔ اپنے مضمون کے لئے انہیں یوں تو سارے مسلمان فلسفیوں کے کارنامے پڑھنے پڑے لیکن وہ مولانا روم سے بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال کے آخری کلام پر مولانا روم کے فلسفہ ہی کا اثر ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی ذہنیت کو معراجِ کمال پر پہنچانے والا رومی ہی کا کلام ہے۔ جو "مثنوی معنوی" اور "دیوان شمس تبریز" جیسی دو بے حد ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے۔ اقبال کا تصوف ان کی نظر افروزی، وسعت جذبات، حیات کے رازوں سے آگاہی، کائنات کے ساتھ انس و محبت اور عشق غرض پوری شاعری کا نچوڑ وہ بڑی حد تک حضرت رومی ہی کا ممنون احسان ہے۔ اقبال نے خود اس کا جابجا اعتراف کیا ہے۔

"می کشودم شبی بناخنِ فکر عقدہائے حکیم المانی
آنکہ اندیشہ اش برہنہ نمود ابدی را ز کسوتِ آنی
پیش عرضِ خیال او گیتی خجل آمد ز تنگ دامانی
چون بدریائے او فرو رفتم کشتیِ عقل گشت طوفانی
خواب بر من دمید افسونے چشم بستم ز باقی و فانی
نگہہ شوق تیز تر گردید چہرہ بنمود پیرِ یزدانی
آفتابے کہ از تجلی او افقِ روم و شام نورانی
شعلہ اش درجہان تیرہ نہاد بہ بیابان چراغِ رہبانی

معنی از حرف او ہمی روید صفت لالہ ہائے نعمانی
گفت با من کہ خفتہ برخیز بہ سرا بے سفینہ رانی
ز خرد راہ عشق می پوئی بہ چراغ آفتاب می جوئی (جلال ہما)
عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی
مرشد رومی حکیم پاک ذات سر مرگ و زندگی بر ما کشاد (پیام مشرق)

اقبال پر رومی کا اس قدر زبردست اثر تھا کہ انہوں نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کی بنیاد ہی "مثنوی معنوی" کی طرز پر رکھی ہے۔ دونوں مثنویوں کی بحر وہی ہے اور اسلوب وہی آغاز بھی مثنوی ہی کے اشعار سے ہوتا ہے۔ مولانا روم کا اثر اقبال پر بہت قدیم ہے چنانچہ پہلے دور کی نظموں میں بھی اس اثر کا سراغ ملتا ہے۔

پنہاں درون سینہ کہیں راز ہو ترا اشک جگر گداز نہ غماز ہو ترا
گویا زبان شاعر رنگین بیاں ہو آواز "نے" میں شکوہ فرقت نہاں ہو
میری مانند تو بھی اک برگ ریاض طور ہے میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

"نے"، "شکوہ فرقت"، "برگ ریاض طور" اور "چمن" "اسی نیستان" کی طرف اشارہ ہے، جو مثنوی معنوی کے پہلے ہی شعر میں ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ اقبال کا مہتم بالشان فلسفہ "خودی" بھی مولانا ہی سے متاثر ہے صوفی عقاید کے بموجب جب انسان اپنی حقیقت سے واقف ہوجاتا ہے یا اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے تو دونوں صورتوں میں اس کی قوت لامحدود ہوجاتی ہے۔ اس حالت میں کائنات پر حکومت کرنا بھی اس کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ لیکن اس خودی کے احساس سے اقبال نے جو کام لیا ہے وہ ان کا اپنا قابل قدر کارنامہ ہے۔ جس کا تعلق بڑی حد تک ہماری موجودہ حالت اور ضرورت سے ہے۔

اقبال نے اب تک جس قدر فارسی نظمیں لکھی ہیں وہ چار کتابوں کی صورت میں شایع ہوئی

ہیں۔ (۱) زبور عجم۔ (۲) اسرار خودی (۳) رموز بے خودی (۴) پیام مشرق۔ ان میں سے آخری تین بے حد اہم ہیں۔ پیام مشرق میں ایک طویل نظم کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی متفرق نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ سب نظمیں بلند پایہ ہیں۔ "پیام مشرق" کے ذریعہ اقبال نے مغرب کے لئے مشرق کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے، جو مغربی دیوان کے نام سے شایع ہوا تھا۔

"رموز بے خودی" میں ملت اسلامی کے ارکان سے بحث کی ہے۔ لیکن "اسرار خودی" محکوم اقوام کے لئے بڑی اہم نظم ہے۔ بظاہر یہ متصوفانہ معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ محکوم اقوام کی اصلاح ذہنیت کا بڑا آلہ ہے۔ اس میں حاکم اور محکوم ذہنیتوں کا فرق بڑی حکیمانہ قابلیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا اصلی مقصد اس پستی کو دور کرنا ہے، جو محکوم اقوام کے مغالطے کی وجہ سے ان کی ذہنیتوں میں پیدا ہو جاتی ہے یہ نظم اقبال کی اکثر نظموں کی طرح بے حد اور بخیل خیالات پر مشتمل ہے

اس دور کی اردو نظموں میں چار یا پانچ بڑی اور باقی چھوٹی نظمیں ہیں ان میں اکثر نظموں کا تعلق مسلمانوں کی موجودہ حالت سے ہے۔ تمام نظموں کو ہم ذیل کے چار عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) قومی اور وطنی۔ (۲) معاشرتی اور اخلاقی (۳) حکیمانہ (۴) تاریخی۔

قومی اور وطنی نظموں میں بڑی اور معرکتہ الآرا نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ، اور علوم اسلام ہیں۔ ان کے علاوہ کئی مختصر نظمیں جیسے "ترانہ ملی" "طلبیت" "خطاب بہ نوجوانان اسلام" "مسلم" خاص طور سے توجہ طلب ہیں۔ ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ ہر نظم قومی جذبہ میں حقیقی معنوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پھر جن الفاظ سے قوم کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ "ترانہ ملی" اور وطنیت دور اول کی اسی موضوع کی نظموں کی توسیع یا ترمیم ہے۔ پہلے دور میں اقبال نے کہا تھا "سارے جہان سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔۔۔۔۔ ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" اب اس میں یہ ترمیم کی کہ "چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا" مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" اس اختلاف کی توجیہہ وہ خود اس طرح کرتے ہیں۔ "تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور۔۔۔ ان تازہ خداؤں میں

جو اس سے وطن ہے ۔" نیز "بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے"

"شکوہ" "جواب شکوہ" "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" میں سے کسی نظم کا جواب اردو میں نہیں ملتا "شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا شکوہ خدا سے کیا ہے، اور پھر ابھرنے کی جو ترکیب بتلائی ہے وہ زبانی الہام کی شان رکھتی ہے ۔ یہ نظمیں اقبال کی عمر بھر کی کمائی ہیں ۔

معاشرتی اور اخلاقی نظموں کے تحت وہ تمام نظمیں آجاتی ہیں جو تمدن یا تعلیم پر ہیں یا کسی متعلق مضمون پر لکھی گئی ہیں ۔ یہی وہ نظمیں ہیں جو بالکل اکبر الہ آبادی کے نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں اس دور کی اہم ترین نظمیں) اقبال کی حکیمانہ، فلسفیانہ اور متصوفانہ نظمیں ہیں ان میں اقبال کا اصلی کردار جس قدر جھلک رہا ہے کسی اور عنوان کی نظموں میں نہیں تاریخی نظمیں اقبال کی اسی وسیع نظری کا ثبوت ہیں جن کا اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔ ان میں گو اسلامی تاریخ سے متعلق نظمیں زیادہ ہیں، لیکن حقیقت میں تخصیص کسی کی نہیں ۔ تاریخ کا جو اہم پہلو شاعر کو متاثر کرتا ہے وہ اس پر خیال آرائی کرنے لگتا ہے ۔ چنانچہ ان میں حضرت صدیق اکبر پر ایک نظم ہے تو دوسری، رامچندر جی پر ہے ۔ یہ نظمیں گویا شاعر کے تاریخی تاثرات کی یادگاریں ہیں

آخر میں اقبال کی شاعری کی ادبیت کے متعلق بھی چند الفاظ ناگزیر ہیں ۔ کیونکہ شاعری "میں کامل فکر" اور "تخیل" کے ساتھ ساتھ جب تک زبان پر بھی پوری قدرت حاصل نہ ہو "حسن گویائی" پیدا نہیں ہوسکتا زبان اور خیال دونوں شعر کے لئے ویسے ہی ضروری لوازم ہیں جیسے جان کے لئے قالب ۔ بلکہ شعر میں زبان کا جز اس سے زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ ممکن ہے ایک اعلیٰ فہم اور ذکی شخص میں اس کے جسمانی حسن کا فقدان اس کی عظمت پر کوئی اثر نہ ڈالے ۔ لیکن بہترین خیالات ہی کیوں ہوں جب تک وہ بہترین اسلوب میں ادا نہ کئے جائیں، ادب میں بڑا درجہ حاصل نہیں کر سکتے ۔ اسی لئے بعض نقادوں نے شعر کی یہ خوبی مقرر کی ہے کہ "بہترین خیالات بہترین الفاظ میں ادا کئے جائیں"

بعض اردو رسالوں نے اقبال کی زبان پر غیر منصفانہ تنقیدیں شایع کی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ ایسے رسالوں نے اقبال کے ان اشعار کو تنقید کے لئے انتخاب کیا جن میں روزمرہ یا محاورے کے لحاظ سے

کوئی خامی نظر آئی تھی بعض بزرگوں نے اقبال کی توجہ فارسی شاعری کی طرف زیادہ دیکھکر اس کی توجیہہ یہ فرمائی کہ اردو رسائل میں اسی طرح کی مضحکہ خیز تنقیدوں نے اقبال کو اردو شاعری سے بدل کر دیا ہے۔ لیکن اقبال کی ذہنیت والے شاعر کے متعلق یہ خیال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہم نے پہلے ہی فارسی شاعری پر اقبال کے زیادہ ہمت صرف کرنے کا سبب بتلا دیا ہے۔

اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر غور کرتے وقت تنقید نگار کو کئی امور کا لحاظ رکھنا چاہیے ممکن ہے کہ اقبال کا پورا فارسی کلام سلاست اور روانی کے ایک ہی عملی معیار پر نہ ہو اور یہ ہو نہیں سکتا یا اس کے ہر شعر میں حافظ کی سی شیرینی اور سعدی کی سی سادگی اور صفائی موجود نہ ہو لیکن اس سے ان کی عظمت پر کیا حرف آسکتا ہے جبکہ خود مولانا روم جیسے شاعر کا پورا کلام خوبی کے ایک ہی معیار پر نہیں ہے نہ صرف یہ بلکہ مولانا رومی کو بھی بعض جگہ محاورے اور روزمرہ کی پابندی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ اردو کلام پر اعتراضات کا بھی یہی جواب ہے۔ اردو میں میر اور سودا جیسے قدیم شاعروں کو چھوڑ کر بھی ہر بات متوسطین کے لئے نمونہ تھی، انیس سے لیکر حالی تک بھی کسی شاعر کا کلام اعتراضات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ انیس کے پرستار شبلی اکثر اعتراضات کو دور کرنے کے بعد بھی خامیوں کے واضح کرنے سے نہ رک سکے۔ اقبال کا کلام پھر کس طرح خطا سے پاک رہ سکتا ہے؟ ایک بڑے نقاد نے سچ کہا ہے کہ سقم ہی کسی کارنامے کے انسانی ہونے کی دلیل ہے۔

فارسی کی طرح اردو میں بھی غزل کی زبان اس قدر منجھ گئی ہے کہ کسی غزل گو شاعر کو زبان کی تمام پابندیوں کا لحاظ رکھنے میں دقت نہیں ہوتی اور جو لوگ خیال کو قربان کر کے صرف زبان کا غلام بننا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ وہ اس لیک سے کسی کو ہٹتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ تغزل کے علاوہ دوسری شاعری کا اصول ہی جدا ہے۔ خاصکر اس شاعر کے لئے جس کا مطمح نظر مضمون، موضوع اور خیال کی اہمیت ہے، زبان کی بعض غیر اہم بندشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر شکسپیر قدیم زمانے کا شاعر تھا تو براؤننگ جیسے جدید شاعر کے خیالات بھی بعض وقت زبان کی پابندیوں کو توڑ کر باہر نکل جاتے ہیں۔ انگریزی کی طرح فارسی

اور اردو کی شاعری پر بھی ایک دور لفظی صناعی کا گذرا ہے۔ اس زمانے کے لسانی معیار کو سامنے رکھیں تو یقیناً بعد کے شاعروں کا کلام کہیں کہیں پھیکا یا سقیم نظر آئے گا۔ نقاد کو ہر معاملے میں نصب العینی ہی نہ بن جانا چاہیئے۔ بلکہ حقایق بھی اس کے پیش نظر رہیں۔

فارسی اور اردو دونوں میں اقبال کا کلام ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ خواہ زبان کی حیثیت سے ہو تا مضامین کی۔ فارسی زبان میں اقبال نے اپنے زمانے کی ضروریات سے متعلق بہت سی اہم اصطلاحات الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ کیا۔ اس زمانے میں جب کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی شاعری قدما کے معیار سے بالکل مختلف اور جدید الفاظ اور ترکیبوں کا مرکب بن گئی ہے، اقبال نے قدما کے معیار زبان ہی کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے ان کے کلام کو پڑھ کر اکثر جگہ کسی قدیم شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اقبال کو اپنے زمانے کا بڑا فارسی شاعر بنا رہی ہے۔

اردو زبان کی جو خدمت اقبال کی شاعری انجام دیتی ہے، وہ فارسی سے زیادہ مہتم بالشان ہے غالب کی غزلوں کو چھوڑ کر اردو میں سوائے اقبال کے کوئی شاعر ایسا موجود نہیں ہے، جس کے کلام میں اعلیٰ خیالات بھی ہوں اور پاکیزہ زبان بھی۔ اقبال کے کلام کے مقابلے میں آزاد بلکہ خود حالی کے کلام میں بھی شعریت اور ادبیت کم معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری کو میر، سودا، درد، میر حسن، میر انیس، ذوق مرزا غالب اور داغ کے معیار سے جانچنا ہی ظلم ہے۔ اقبال کا میدان اپنا جدا ہے جس کے وہ تنہا مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے شاعری کی جو دنیا پیدا کی ہے، اس کے لوازم حسن صرف محاورہ بندی اور روزمرہ نہیں ہیں۔ اقبال نے اردو میں جتنے نئے اور خوبصورت الفاظ تراشے ہیں، جتنی ادبی ترکیبیں وضع کی ہیں، اور نفیس تشبیہوں اور استعاروں کا جس قدر ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل کی اس مضمون میں گنجایش نہیں ہے یہاں ان کے صرف چند نمونے بے موقع نہ ہوں گے۔ اس حیثیت سے تو اقبال کی عزت ہماری نظر میں اور بھی بڑھی ہوئی ہے۔

تیری عمر رفتہ کی اک آن ہے عہد کہن — وادیوں میں تیری ہیں کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرم سخن — تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمہ دامن ترا آئینہ سیال ہے
دامن موج ہوا اس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوار ہوا کے واسطے — تازیانہ دیدیا برق سر کہسار نے
اے ہمالہ! کوئی بازی گاہ ہے تو بھی ہے — دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے
ہائے کیا فرط طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبش موج نسیم صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے نشہ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبان برگ سے گویا ہے اسکی خامشی — دست گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی
کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانہ قدرت ہے کاشانہ مرا

(ہمالہ)

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے — یا رخ بے پردہ حسن ازل کا نام ہے
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے — آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

(خفتگان خاک سے استفسار)

اے شمع! نہتائے فریب خیال دیکھ — مسجود ساکنان فلک کا مآل دیکھ
مضمون فراق کا ہوں ثریا نشاں ہوں — آہنگ طبع ناظم کون و مکاں ہوں

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود
تحریر کر دیا سر دیواں ہست و بود
گوہر کو مشت خاک میں رہنا پسند ہے
بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے

(اشعر)

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کب کھولی ہے فصد آفتاب
چرخ نے بالی چرالی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

تبصرے

دیوانِ اثر " مثنوی خواب وخیال کے پڑھنے والے سید محمد اثر مرحوم اور ان کی شاعری سے بخوبی واقف ہیں۔ اثر اردو زبان کے مشہور شاعر اور پاک دل مومن، خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور سجادہ نشین ہیں۔

میر درد کی طرح وہ بھی باکمال شاعر اور شیخ پاک دامن ہیں۔ درد رہ کے اس فیض کا خود اعتراف فرماتے ہیں:-

بے درد تو کیونکہ رہ سکیگا   یہ حضرت درد کا اثر ہے

بدقسمتی سے ان کا کلام اتنک نایاب تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ "پر اثر کلام دستیاب ہو گیا ہو مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے اسے مرتب کیا، اور ایک مختصر مگر دلچسپ دیباچہ کیساتھ انجمن کی طرف سے شایع کیا ہے۔ مولوی صاحب اردو داں اصحاب کے شکریہ کے مستحق ہیں اثر کے حالات اب تک کہیں نہیں ملے، کیا عجب ہے کہ ان کے قال کی طرح کسی دن انکے حال کا بھی پتہ چل جائے۔

اثر کا دیوان نہایت مختصر ہے۔ کچھ غزلیات، رباعیات اور کچھ قطعات ہیں۔ اس کلام کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ سادگی کو اثر سے کیا ربط ہے۔

کلام ایک شفاف اور صاف آئینہ ہے جس میں دل کے احوال بے کم و کاست اپنی اصلی حالت میں اس انداز سے منعکس ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے کے دل پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ان کی شاعری، دلی جذبات، نفسی کیفیات کی کامیاب ترجمانی ہے۔

بیان بے تکلفانہ اور رواں، زبان سادہ، شستہ اور میٹھی۔ اثر بول چال کی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ اور وہ جو بات کہتے ہیں دل سے نکلتی ہے، اسی لئے اثر رکھتی ہے۔ وہ پیچیدہ ترکیبوں کے عاشق ہیں نہ دقیق مضامین کے، ان کی سلجھی ہوئی طبیعت، دور از کار استعارات اور گنجلک تشبیہات سے قطعاً پرہیز کرتی ہے، وہ اپنے لئے بحریں بھی نہایت چھوٹی چھوٹی منتخب کرتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ آپ بھی چند شعر پڑھیئے اور لطف اٹھائیے اور اس بیان کی تصدیق کیجئے۔

دیوان اثر تمام دیکھا

ہے اس میں ہر ایک شعر حالی

حالِ دل مثلِ شمع رکھتا ہوں   گو مجھے بات کر نہیں آتی

دن کٹا جس طرح کٹا لیکن   رات کٹتی نظر نہیں آتی

امیر مینائی کا شعر ہے:

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ   ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

اثر کہتے ہیں:-

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا   دشمنی پر تو پیار آتا ہے

طالب دیدار کی ایک نفسی کیفیت بیان کرتے ہیں:-

پہلے سو بار ادھر ادھر دیکھا   جب تجھے ڈر کے اک نظر دیکھا

کیا پاکیزہ شعر ہے:-

تیرے آنے کا احتمال رہا   مرتے مرتے یہی خیال رہا

جب کبھی مقصد کے حصول میں ناکامی ہوتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ ہم نے یہ نہ کیا شاید

کام بن جاتا، دوست احباب بھی ایسی باتیں سناتے ہیں اس حال دل کو اثر بیان کرتے ہیں۔

دیکھے تو سہی کہ کیا ہوتا ایک نالہ اثر کیا ہوتا

حسن بیان اور سادگی زبان کی داد دیجئے، محبوب کی شوخی کا ذکر ہے۔

جوں گل تو ہنسے ہے کھل کھلا کر شبنم کی طرح مجھے رولا کر

تشبیہ کس قدر پاکیزہ اور برمحل ہے:۔

عشق کی بے بسی ملاحظہ ہو:۔

کیا کیجئے انتظار نہیں دل کی چاہیں ہیں سب وگرنہ تیری یہ باتیں نگاہیں

کیا مضمون باندھا ہے:۔

روبرو دیکھنا محال ہوا دیدۂ اشکبار کے ہاتھوں

سہا کا شعر ہے:۔

حیرت سے سہا لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں کچھ ہو ہی گئے ہوں گے محبت میں ہمیں اور

اثر اپنے اس حال کے متعلق جو نتیجۂ محبت و الفت ہے حیرت کے لہجہ میں کہتے ہیں:۔

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

اثر صوفی بھی ہیں۔ تصوف میں بندہ کا فرض عبدیت "حق نمائی" ہے حضرت کمال رح کا ارشاد ہے ع حق نمائی ہے کمال زندگی۔ اس کے بارے میں اثر فرماتے ہیں:۔

غرض آئینہ داری دل سے تیرا جلوہ تجھے دکھانا ہے

جلیل کا شعر ہے:۔

ظلم بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی سب گوارا ہے اگر سنتے رہو فریاد بھی

اثر نے اس خیال کو کس قدر اختصار اور سادگی سے ادا کیا ہے:۔

جو رو جو چاہئے سو کیجئے پر میری حالت پہ بھی نظر کیجئے

اپنی بخودی کا نقشہ کھینچتے ہیں:۔

حالت مت پوچھ اب اثر کی — کچھ بات رہی نہیں خبر کی

کیا بیان ہے:-

یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

جلوۂ حق کے بارے میں ارشاد ہے:-

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں — پر ہمیں آہ کچھ نظر ہی نہیں

چند شعر اور ملاحظہ ہوں:-

اثر اب تو ملے ہی تو اس سے — پر یہ ملنا مزا دکھاوے گا

جانتا کچھ قدر ہماری بھی — تو بھی عاشق اگر ہوا ہوتا

احوال تباہ کو دکھاؤں میں کیسے — افسانۂ دردِ دل سناؤں میں کیسے

تو دیکھ نہ دیکھ سن نہ سن جانِ جاں — رکھتا ہوں تجھی کو اور لاؤں میں کیسے

کس قدر پُر لطف شعر ہے:-

کیا کہوں میں گزشتہ اوقات کے لطف — تھے دن کے جدے لطف، جدے رات کے لطف

اثر کا ایک پیغام ہے:-

دن رات ہر ایک سی نہ فریاد کرو — اس خانہ خراب دل کو آباد کرو

اتنا بھی ان بتوں پہ مت بھولو اثر — اپنے اللہ کو تم اب یاد کرو

مختصر یہ کہ اثر بقول خود ع آہ و نالہ بیان رکھتے ہیں۔

کتاب کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے، دفتر انجمن سے عہ کلدار میں ملتی ہے! رشید سجانی

رسالہ اشاعت قرآن — قرآن پاک کے متعلق ارشادِ ربانی ہے یا ایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی

ورحمتہ اللمومنین۔ اے لوگو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس مواعظت، اور تمہاری باطنی امراض کی شفا آگئی ہے، ماننے والوں کے لئے یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہے۔

مولوی ابو محمد مصلح صاحب ایک مخلص معلم و مبلغ قرآن ہیں اور اس رسالہ کے ذریعہ ماہانہ قرآن پاک کی مذکورہ بالا حقیقت کی ترجمانی حتی الامکان کر رہے ہیں۔ رسالہ میں ہر ماہ تعلیمات قرآن پاک پر مختلف مفید اور دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں، خدا مولوی صاحب کی اس مخلصانہ سعی کو کہ قرآن مجید کی تعلیم معنی و مطلب کے ساتھ عام ہو مشکور فرمائے۔

ابتک پانچ نمبر نکل چکے ہیں، پانچویں نمبر میں تلاوت قرآن پر ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے، جو نہایت کارآمد ہے۔ لکھائی اور چھپائی کا اہتمام بھی نہایت مناسب ہے۔ سالانہ قیمت دس روپیہ اور ماہوار ایک روپیہ ہے پتہ ابو محمد مصلح "دفتر قرآنی تحریک" حیدرآباد دکن

رسالہ صوفی " (دورِ جدید) ماہوار۔

رسالہ صوفی اردو زبان کے نہایت قدیم رسالوں میں ہے اپنے صوفیانہ ذوق اور پاکیزہ مذاق کے باعث بہت مشہور و مقبول تھا، اب اس کا دور جدید شروع ہوا ہے چوالیسویں جلد کا پانچواں نمبر پیش نظر ہے، رسالہ خوش اسلوبی سے مرتب ہوتا ہے، ابتدا میں ملا رموزی کے ظریفانہ و مصلحانہ شذرات و اشارات ہوتے ہیں، افسانے اصلاحی مضامین مذہبی اور نظمیں دلکش ہیں۔ لکھائی چھپائی کے لئے صوفی پرنٹنگ ورکس کا نام کافی ہے رسالہ دو قسم کے کاغذ پر شائع ہوتا ہے سالانہ قیمت کاغذ قسم اول (ے) روپیہ اور کاغذ قسم دوم عا! پنڈی بہاؤ الدین پنجاب سے طلب فرمائیے۔

رسالہ الکشافہ" حیدرآباد دکن۔

یہ حیدرآباد کے بوائے اسکوٹس کا ماہوار رسالہ ہے، مضامین اسی تحریک کے متعلق شائع ہوتے ہیں اس کے مدیر مولوی حمید اللہ صاحب ام اے، ال ال بی عثمانیہ ہیں، رسالہ اشاعت میں اپنے مدیر کی طرح پابند وقت ہے۔

نئی جدت یہ ہے کہ سارے مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے، آیندہ نمبر "خودمختاری نمبر ہوگا، جو تذکار خودمختاری سلطنت آصفیہ پر مشتمل ہے۔ خدا کرے ہمارے اسکوٹس اپنے رسالے صحیح علم اور صالح عمل کے ذریعہ خلق خدا کے سچے خادم ثابت ہوں۔ آمین۔ لکھائی اور چھپائی اوسط ہے ضرورت ہے کہ سرورق کی خوشنمائی کی طرف توجہ کی جائے۔

سالانہ قیمت (سے) روپے، پتہ نظامت بائے اسکوٹس۔ سیف آباد حیدرآباد دکن۔

رشید سبحانی

"خزینۂ تاریخ"

کلیہ کی ذیلی انجمنوں میں بزم تاریخ اپنی نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بزم کئی سال سے اپنے کام میں مصروف ہے۔ اور خاموشی سے بہت سی مفید باتوں کا اضافہ کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس سال دہ سالہ جوبلی کا نہایت شاندار جشن منایا گیا، جس کی تفصیل شائع کی جا چکی ہے، گزشتہ سال اس بزم کی طرف سے خزینۂ تاریخ کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا گیا تھا، اس سال اسکا دوسرا نمبر ہمارے پیش نظر ہے، اس نمبر میں گزشتہ کے مقابلہ میں بہت کچھ ترقی اور اضافہ نظر آرہا ہے لکھائی چھپائی بھی پہلے سے بہتر ہے اور حجم نمایاں طور پر زیادہ ہے، شروع میں سید یوسف الدین صاحب کا تحریر کیا ہوا ادارت نامہ ہے، اس کے بعد سات مضامین ہیں جن میں دو اساتذۂ تاریخ کے لکھے ہوئے ہیں۔ باقی تمام طلبہ کے نتائج تحریر ہیں، مضامین کا معیار اچھا خاصہ ہے نواب مرشد علی خاں کے کارنامے اور ملک عنبر پر جو مضامین ہیں وہ تحقیقی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ "اہم تاریخی نوشتہ" والا مضمون اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ آخر میں تاریخی مشاعرہ کی نظموں کا انتخاب ہے۔ صدر بزم کا خطبۂ صدارت بھی عالمانہ ہے

شمیم

کلیہ کی خبریں

بنی الحسن شمیم ۔ مدیر

کلیہ کی تفصیلی خبریں اس مرتبہ حصۂ انگریزی میں درج ہیں، اور تصفیہ بھی یہی ہے کہ ایک نمبر میں حصہ انگریزی کلیہ کی خبروں سے مزین ہو تو دوسرے نمبر میں حصہ اردو، لیکن چند امور کا اس موقع پر اظہار ضروری ہے جو ہدیۂ ناظرین ہیں۔

خیر باد سابق مدیرین مجلہ مولوی شیخ چاند صاحب۔ جناب جلال الدین صاحب اشک جناب عبدالقیوم صاحب باقی ایک عرصہ تک مجلّہ کے ادارتی خدمات انجام دیکر سال حال سبکدوش ہوگئے۔ ان حضرات نے اپنے فرائض کو جس حسن و خوبی سے ادا کیا برادران کلیہ سے مخفی نہیں، ہم ان تینوں حضرات کو خیر باد کہتے ہوئے متوقع ہیں کہ آپ حضرات مجلہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ وابستہ متصوّر فرمائیں گے اور قلمی معاونت سے کبھی دریغ نہ کریں گے۔

گزشتہ نمبر مجلّہ کا گزشتہ نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہے، سابق مدیرین نے اپنی تمام کوشش اس کو مرتب کرنے میں صرف کر دی ہیں، اس نمبر میں حصۂ انگریزی کے مدیر جناب قیوم صاحب باقی نے اپنے ادارت نامہ میں ایک طویل بحث مجلہ کی انتظامی حالت پر کی ہے آپ نے انجمن اتحاد اور مجلہ کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون نگاروں کا نہ صرف تذکرہ کیا ہے، بلکہ کلیہ کی عام ذہنیت پر بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے، کہیں کہیں چٹکیاں بھی لے

لی ہیں۔

اس ادارت نامہ کا طلبائے کلیہ پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا، تقریباً کئی سو استفسارات اب تک اس کے متعلق ہو چکے ہیں۔ عہدہ داران انجمن اتحاد سب سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، جو مختلف غلط فہمیوں کا سبب بنتی جا رہی ہے جس کا دور کر دینا اس لئے بھی ضروری ہے کہ تمام لوگ ہماری طرف نظریں لگائے دیکھ رہے ہیں کہ آخر ہم کونسا مسلک اختیار کرنے والے ہیں۔

باقی صاحب کو اپنے زمانہ ادارت میں بہت سی کاوشیں کرنی پڑیں جیسا کہ خود انہوں نے مطبع کی دقتوں اور انجمن اتحاد کے ناخوشگوار واقعات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک فوری جوش کا نتیجہ ہے، اور چونکہ ایسا جوش ہمیشہ خلوص آمیز ہوتا ہے، اس لئے چنداں قابل اعتراض نہیں، اچھا ہوتا کہ باقی صاحب کی مدت ادارت میں کچھ اور توسیع ہو جاتی اور آپ تمام خامیوں کو دور کر کے صورت حال پر غالب آجاتے، ایسی صورت میں موجودہ مدیرین کے لئے راستہ صاف ہو جاتا چونکہ صورت حال وہی بدستور باقی ہے، جس کی طرف باقی صاحب اشارہ فرما چکے ہیں، اس لئے برادران کلیہ کی طمانیت کے لئے یہ اعلان کرنا ضروری ہے کہ ہمارا مسلک صلح کل ہے، ایسے حالات نہ کبھی تھے اور نہ اب ہیں، جو بہت زیادہ قابل لحاظ ہوں بعض دشواریوں پر غالب آنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور مجلہ کا جن جن شعبوں سے تعلق ہے ان سے مفاہمت کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں، مجھکو نہ اس بات کی مسرت ہے کہ مجلس ادارت انجمن اتحاد پر فوقیت رکھتی ہے اور نہ اس کا غم ہے کہ ہم اس کے زیر اثر ہیں۔ ہمارے کام کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں، لہذا جب تک ادارتی کام ہمارے سپرد ہے انتہائی خاموشی سے اسے چلائیں گے، ہنگامہ پسندی کا دخل ہمارے طبائع میں نہیں۔

کلیہ کی عام ذہنیت اور مدیرین کے انتخابات کے صحیح معیار کا سوال البتہ باقی رہ جاتا ہے انشاءاللہ یہ بھی موقع پر بطور مناسب حل ہو جائے گا۔

خطبۂ صدارت

انجمن اتحاد اور اس کی کارگزاریوں کا تذکرہ کسی دوسری جگہ درج ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مولوی مظہر حسین صاحب نائب صدر انجمن اتحاد نے سال حال جو خطبۂ صدارت اپنے جلسہ کرسی نشینی کے وقت پڑھا تھا وہ اپنی بلاغت کے اعتبار سے ایک پُر مغز خطبہ ہے، ہماری خواہش تھی کہ یہ کتاب کی صورت میں شائع ہو جاتا تا کہ اس کے وسیع معلومات سے آئندہ ہونے والے صدر فائدہ اٹھاتے کچھ تو خطبہ کے طویل ہونے کے سبب اور کچھ عدم گنجایش کی وجہ سے مجبوراً اقتباس درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کی عبارت خود جناب مصنف کی ہے۔

کلیہ اور انجمن اتحاد

تعلیم کا اصلی اور اعلیٰ مقصد انسان کو اصلی معنوں میں برتری یعنی انسانیت کے درجہ کو پہنچانا ہے، یہ چیز وسعت مطالعۂ خیالات کی پختگی، آزادانہ تبادلۂ خیالات، باہمی میل جول اور ارتباط سے حاصل ہوتی ہے۔

کلیہ کی درسی جماعتوں کا دائرہ مطالعہ میں وسعت پیدا کرنے اور معلومات و خیالات کو وافر کرنے پر مشتمل ہوتا ہے، جس کے ذمہ دار بلا واسطہ اساتذہ اور یا لواسطہ کتب خانۂ متعلقہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف جذبۂ الفت کو پیدا کرنے نیز باہمی میل جول و تقریری و تحریری قوت کو بڑھانے کا ذمہ دار مجموعی طور پر کلیہ کو خیال کیا جاتا ہے، لیکن محض آسانی عمل کی خاطر بالراست خود کلیہ کے ایک شعبہ کو قرار دیا گیا ہے جس کو ہم عرف عام میں انجمن اتحاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں، یہی ایک مقام طلبا کے علمی معاشرتی مشاغل کا آئینہ تصور کیا جاتا ہے، اگر طلباء کے نفس جد و جہد سے معمور ہوں تو پھر اس کو بھی جیتی جاگتی ہستی اور چلتی پھرتی ہستی کہا جا سکتا ہے، اس کے برخلاف اگر اس کے اجزائے ترکیبی یا ارکان میں جمود اور بے حسی سرایت کر جائے اور قوت حیات میں افسردگی و خلل انداز ہو جائے تو ایسی صورت میں یا تو اس کا قطعی طور پر اختتام ہو جائے گا یا اس کا وجود صرف سین بورڈ کی حد تک باقی رہے گا۔

اراکین انجمن کے خیالات کا زندگی کے اہم مسائل و تحریکات ادب کے ضمن میں اظہار ضروری ہے

میری دانست میں انجمن اتحاد ہی ایسا ضروری مقام ہے جہاں بہترین طریقے سے طلباء کے آزادانہ تبادلۂ خیالات طبیعت کے میلانات اور ذہن کی جودت ولیاقت کے بلا تکلف اظہار کو واجبی اور مناسب خیال کیا جاتا ہے۔
نوجوانوں کے خیالات اور جذبات ایک مستقل اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں وہ محض عمر رسیدہ لوگوں کے خیالات کا چربہ یا عکس نہیں ہوتے، زندگی کے اس دور میں بعض ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو بعد کو باوجود تجربہ کی پختگی اور وسعت کے حاصل نہیں ہوتیں عہد شباب میں نوجوانوں کا تخیل و فلسفۂ زندگی ایثار و فیاضی کے جذبات سے معمور ہوتا ہے، اگر آپ کو اعلیٰ عیون و قدور کی جھلک دکھائی جائے تو وہ جوش اور خلوص کے حصول کے لئے کوشاں ہوتے ہیں یاد رہے کہ مقررہ درسی مضامین کی کامیابی ہرگز عملی زندگی کی ضامن نہیں قرار دیجا سکتی، اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق آزادانہ خیال جائز سمجھا جائے بنابریں میری ذاتی رائے ہے کہ ہر طالب علم کا یہ فرض اولین ہے کہ مطالعہ میں وسعت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تقریری ملکہ کی تحصیل و تبادلۂ خیالات کی اہمیت کو اصلاً غیر ضروری نہ سمجھے،

ایک اہم تحریک

حضرات انجمن کے مباحثوں کے متعلق بحث کرتے وقت یہ سوال ہوسکتا ہے کہ کس طرح خود اراکین کو مباحثوں میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے: اس کا جواب بہت آسان ہے، کیونکہ "مقرر" خاص رحمت خداوندی سے خاص تعداد میں خاص وقت پر عالم وجود میں نہیں آتے، اس لئے کہ مقرر کا انحصار کلیتہً صرف کوشش پر ہے، جھجک کا معدوم ہونا ابتداءً بیحد ضروری ہے کیونکہ عموماً مبتدی کو خیال ہوتا ہے کہ شاید خطابت میں غلطی ہو یا حافظہ مدد کرنے سے قاصر رہے یا کوئی اور ایسی بات وقوع پذیر ہو جس کے باعث شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے، اس نقص کو دور کرنے کے لئے ہمارا ارادہ (Elocutionary class.) جماعت تقریری کے آغاز کرنے کا ہے، بشرطیکہ

جناب صدر کے توسط سے ہمیں کسی ہمدرد پروفیسر کی اعانت میسر ہو۔

دوسری تحریک میری دوسری تحریک کے متعلق یہ عرض ہے کہ جبتک ہمارے سامنے کوئی نصب العین نہ ہو اور جب تک اس کا حصول ہمارے لئے اہم نہ ہو ہم کوشش میں کوتاہی کیا کرتے ہیں۔ دیگر جامعات کی انجمنیں اس کی اہمیت کا اندازہ کرکے اس مقصد کی تکمیل کا بہترین طریقہ ایک خاص انعام کے قیام کو سمجھتی ہیں۔ جس کے پانے کا ہر سال کے اختتام پر وہ رکن مستحق قرار دیا جاتا ہے جس نے انجمن میں مجموعی طور پر پورے سال میں دیگر ممبرین سے زیادہ وقت کہا ہو۔

ایک ضروری استدعا حضرات میرے پچھلے بیان سے آپنے معلوم کرلیا ہوگا کہ اس سال میرا اور میرے ساتھیوں کا انہاک اس انجمن اتحاد کے اولین فرض کو کامیاب بنانے میں کس قسم کا ہوگا، اب آئیے اس ضمن میں ایک اہم درخواست ہم سب ملکر جناب صدر کی خدمت میں پیش کریں۔

جناب صدر! میری ناقص فہم میں انجمن اتحاد کے جلسوں کی کامیابی میں بڑی رکاوٹ وقت کے ناموزوں ہونے سے بھی ہوا کرتی ہے، فی الحال مباحثی جلسوں کا وقت شام میں نہیں رکھا جاسکتا، اس وجہ سے کہ قانون کی جماعتیں روزانہ چار بجے سے شروع ہوتی ہیں نیز یہ وقت موزوں بھی نہیں اس لئے کہ اس وقت طبیعتوں میں تمام دن کی کالج کی محنت کے بعد وہ روانی نہیں رہتی جو کہ عموماً صبح میں رہا کرتی ہے اس لئے والاجناب سے استدعا ہے کہ کم از کم مہینہ میں دو مرتبہ انجمن کے جلسوں کے لئے گیارہ سے ایک تک کا وقت دیا جائے تو مناسب ہے، امید کہ اس سرپرستی کے مدنظر اور اس ہمدردی کے تحت جو جناب والا کو اس انجمن سے ہے ہماری اس ناچیز استدعا کو ان بیش بہا فوائد کے مآل کے بہترین نظر جو اس تبدیلی سے ظہور پذیر ہوسکتے ہیں، قبولیت کا درجہ عطا ہوگا۔

تفریحی سفر یعنی اکسکرشن سیر و تفریح کو تاریخی، اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے زیادہ

اہمیت دیجاتی ہے، ایک حد تک تعلیم و تربیت کو اس وقت تک مکمل نہیں کہا جاتا، جب تک کہ مشاہدہ کو بھی تجربہ حاصل کرنے کے لئے روبکار نہ لایا گیا ہو، سیر تفریح سے لطف اندوزی صرف تاریخی مقامات کے معائنہ تک محدود نہیں رکھی جاسکتی یہ کام بزم تاریخی کے ذمہ مختص نہ ہونا چاہیے صرف تاریخی کھنڈرات کا معائنہ ہمارے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے کافی نہیں کیونکہ اس چیز کا ہمارے تجربہ میں آنا ضروری ہے جو ہمارے ارتقاء کے لئے مفید اور کارآمد ہو اس لئے ترقی یافتہ اور تجارتی و زراعتی حصہ ملک کا معائنہ بھی بیحد ضروری ہے ۔

انجمن کی مالی حالت

ہماری انجمن کی آمدنی بیحد قلیل ہے، یعنی چندۂ انجمن کی مد میں ہر ایک رکن سے سالانہ صرف ایک روپیہ لیا جاتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے ناکافی ہوتا ہے۔ دیگر جامعات کی انجمنیں اپنی ماہانہ خاطر خواہ آمدنی کے علاوہ اور طریقوں مثلاً عطیوں وغیرہ سے بھی ہمیشہ اپنی آمدنی میں اضافہ کرتی رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ مالی حالت کے اطمینان بخش ہونے کی وجہ سے معمولی سے معمولی فریضہ کی ادائیگی میں یہ اپنی شان گھٹنے نہیں دیتیں لہذا ہم کو بھی اپنی اقتصادی حالت کو اطمینان بخش بنانے کے لئے اس تحریک کو خوش آئند کہنا چاہئے، علاوہ ازیں اگر جناب صدر انجمن کی مالی امداد کی نسبت کچھ سرکار سے بھی مدد حاصل کریں تو ہم انجمن کو مستحکم حالت میں دیکھ سکتے ہیں ۔

دستور انجمن کی نظر ثانی کی ضرورت ہے!

ہمارے منضبطہ قوانین سنہ ۱۹۲۲ء میں مرتب ہوئے لیکن حضرات ہر زمانہ کا تبدل اپنے ساتھ نئی ذمہ داریاں لے کر ظہور پذیر ہوتا ہے، دستور ہمیشہ وقتی ضروریات پر مبنی ہوتا ہے، لہذا میں محسوس کرتا ہوں کہ اب چونکہ ہماری ضروریات ان قواعد کی رہنمائی میں کلیتہً پوری نہیں ہوسکتیں۔ اس وجہ سے ان پر دوبارہ غور کرنا بیحد ضروری ہے۔

اعزازی رکنیت

یہ افسوس کی بات ہے کہ ہم نے ابتک محسوس نہیں کیا کہ ہماری انجمن معزز اشخاص کو اپنا اعزازی رکن بنالے۔ یہ ایک ضروری

امر ہے جس کی طرف توجہ لازمی ہے، سر برآوردہ اشخاص کو اپنے حلقۂ برادری میں شریک کرنا اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا ایک ضروری فرض ہے جس کی تکمیل کی سعی کی طرف ہماری توجہ صرف ہونی چاہئے۔

کلج کا یونیفارم قدرت ہر چیز کی تخلیق ایک مناسبت سے کرتی ہے اور یہی یکسانیت اور یکجہتی قومیت و وطنیت کے اہم احساس کو پیدا کر کے کامل طور پر مفید نتائج پیدا کرتی ہے، لہٰذا اسی اصول کے تحت ہمارے طلبہ کلیہ کے لئے کوئی ایک یونیفارم ہونا ضروری ہے، جس سے جامعہ کی تعلیمی خصوصیات میں اضافہ کا امکان ہے، یہ اعتراض یقینی صحیح ہے کہ غریب طلباء کے لئے کسی یونیفارم کا بنانا آسان نہیں، ہم کو چاہئے کہ ہم امدادی بزم کو پہلے وجود میں لائیں اور اس رکاوٹ کو دور کر کے تمام کلیہ کے لئے ایک یونیفارم کا انتخاب کریں۔

بزم امدادی یعنی ڈیوٹی سوسائٹی ہماری حکومت اس میں شک نہیں کہ طلباء کو انتہائی امداد دے رہی ہے، لیکن ہم کو اپنی ذمہ داریاں بھی کچھ محسوس کرنا چاہئے اس مقصد کے حصول کے لئے ابتدائی طور پر اگر سو مستعد طلباء بیسر آجائیں جو خلوص کے ساتھ امدادی فنڈ کے لئے چندہ جمع کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کریں تو پھر ہم بہت جلد بزم امدادی کو عالم وجود میں دیکھ سکتے ہیں، اس امدادی فنڈ کا مقصد مستحق اراکین کی بذریعہ قرضہ حسنہ امداد کرنا ہوگا۔

اختتام حضرات میں تمام سامعین کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے خشک بیان کو نہایت صبر و سکون سے سماعت فرمایا اور اپنے آقائے نامدار اقدس و اعلیٰ اور صاحبزادگان بلند اقبال کے لئے صدق دل سے یہ دعا کرتے ہوئے کہ خدائے توانا انکا سایۂ مبارک ہمارے سروں پر تا دیر قایم رکھے۔ آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔

Ghazals, as also poems on ' Shibab ' were read. Badruddin Badr who is an old boy, produced the best poem. Among others who read their poems on the occasion, mention must be made of Messrs Farhatullah Baig, Farhat, Mirza Nizam Shah Labib, Jalaluddin Ashk, Abdul Qayyum Khan Baqui, and Akbar Vafaqani.

On the night of 8th Dai, an Urdu elocution contest was held. The subject for discussion ran : ' Humanity was served more by East than West.' Professors Abdul Haq, Syed Sajjad and M. Jameelur Rahman were the judges. Mr. B. N. Chobe proposed the subject, Mr. Mahmood Ali opposed it, then others followed. As a result Mr. Mohammad Farooq was declared first, Mr. Gulam Dastgir and Mr. Gulam Hafiz Khan stood second and third respectively. Dr. Khalifa Abdul Hakim then dealt with this age-long dispute in a lucid speech.

The following morning there was a Science Exhibition in Agha Manzil. On the same day at 8 p.m. a dinner was given, at which Nawab Akbar Yar Jung and Mr. Hameed Ahmed Ansari were also present.

On 11th Dai, the Annual Prize Distribution meeting was held at 5 p.m., presided by H. E. The Chancellor. The Principal read the report of the last year which was considered extremely re-assuring by H. E. The President. His Excellency then distributed the prizes. The meeting terminated, the guests betook themselves to Agha Manzil where the Principal and the Staff were at home. The Science Exhibition was also inspected.

Besides the functions, there was a football match on 8th Dai between the Past and Present boys, the football club being at home to professors and guests. There was also a hockey and a cricket match on 9th and 10th Dai respectively between the Past and Present boys.

PRINTED AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS—1931. C444

We feel proud in congratulating Mr. Shafi, the distinguished son of our University on his success in an attempt to break the World's 'Endurance Swimming' record of 68 hours 11 minutes held by Arthur Riozzo. Shafi entered the water at 9 a.m. on Thursday October 16, at Worthing Corporation Baths in the presence of the Mayor of Worthing and left it unaided at 6 a.m. Sunday morning October 19, beating Riozzo's record by 49 mins.

We give below a short account of the second College Day celebrations. The secretary of the College Union has sent us his report which with some changes we reproduce here. As it is nearly a physical impossibility for us to attend each and every function of our various clubs and societies, it will be a matter of gratitude if such memorandums of important activities be sent to this office.

The celebrations commenced on Friday morning, the third of Dai 1340 F. with a programme of sports. They were held at Nizam College playgrounds. Present boys, as also the old boys, Professors and the office staff participated. Messrs Aunullah, Gulam Ali, and Habibullah Hussaini secured a number of prizes, Mr. Aunullah being declared the champion athlete. Mr. Ali Mohammad Khan, our esteemed and enthusiastic old boy, also won a number of prizes.

On the 6th of Dai, at 8 p.m., the English Elocution contest was held at Liaquet Manzil in the tent specially pitched for the celebration. The attendance was very large. The following was the subject for discussion: 'Social Unity should precede political progress.' Professors Husain Ali Khan, Haroon Khan Sherwani and E. E. Speight were the three judges. The vice-President Mr. Mazhar Hussain presided. Mr. Ahsan Aziz of II year led the debate, speaking for the subject. Mr. B. N. Chobe led the opposition. Altogether fourteen students took part which is certainly a matter for gratification, since only four had participated in last year's contest. Mr. Mohammad Farooq, Secretary of the Union was declared the best speaker. Mr. B. N. Chobe and Mr. M. Saleh Hashmi stood second and third respectively.

On the following night an Urdu Mushaira was held. Prof. Abdul Haq (Head of the Dept. of Urdu) was Mir-i-Mushaira.

is never conducive of future effort. It is travel alone, and that with open eyes and mind, that encourages a breadth of outlook, an universality of sympathy and an attitude of humility which are the true attributes of a seeker after knowledge. We earnestly hope that such excursions, preferably to other Academical Centres, will help in broadening the much localized vision of our students.

Now we come to a less encouraging feature of our activities this year. We lost both the Cricket and the Football matches in this year's contests, defeat in the latter proving a matter of surprise even to our opponents. We were not present at the Football match, but the Cricket match afforded us a very good opportunity of determining what was wrong with our players there. We write this in a spirit of frank and impersonal criticism and since no offence is meant, none should be taken. Every one of our Cricket Eleven was labouring under the same uneasiness—an inferiority complex. We would have never believed, had we not been ourself present, that it was the same or nearly the same Eleven which put up such a gallant fight at Aurungabad against a side far stronger than their immediate opponents. If ever a match was lost through lack of self-confidence, this was. The huge score of our opponents—which was due to certain obvious mistakes in tactics on our part—seemed to crush every one's spirit. Hour after hour the fielding became worse and worse ; but for a bright spell of Shafaat's, the other Eleven might have been there the whole time. We would better leave our own batting undiscussed. Where a little pluck would have carried us through, not the slightest sign of enterprise and courage were apparent.

All that we are in a position to recommend is that a more experienced and sedate pair ought to open batting, that the wicket keeper should never be allowed to leave his place and bowl, and that more pains should be taken to improve the fielding, in which our side is decidedly poor. It will be needless to emphasize the importance of diligent practice.

Mention must be made here of the visit of the Madras Presidency College Eleven which played a match against each of our Cricket and Hockey Elevens, winning both.

Anjumani Nizamat Munzil : Presdt: Mr. Nabiul Hasan. Sec: Mr. Ghous Mohiuddin. Treas : Mr. Gangadhar Rao. Lib: Mr. S. Zamir Ali. Members : Messrs. Sirajuddin, Zakaullah, Trimbak Rao, Ali Husain.

Anjumani Farhat Munzil : Presdt : Mr. G. Hafiz Khan. Sec: Mr. Muslehuddin. R. R. Supdt: Mr. Aijaz Ahmed. Members : Messrs. Yahya Siddiqi, S. Mahmud Husain, Ahmedullah Khan, M. Jawan Bakht.

Anjumani Musarrat Munzil : Presdt: Mr. Fakhruddin. Sec: Mr. Nural Muhtada. Treas: Mr. H. Safiullah. Lib : Mr. Inayat Ali Khan. Members : Messrs. Abdul Hai, Yosufuddin, Ibrahim Nehri, Mohammad Abbas.

Cricket Club : Captain : Mr. Abdul Quadir Razvi. Sec : Mr. Syed Zainulabidin.

Football Club : Captain : Mr. Mahboob Ali Khan. Sec: Mr. Venkatchelum.

Hockey Club : Captain : Mr. Abulula Ali Khan. Sec : Mr. Vajeehuddin.

We are glad to announce that some very welcome changes are to be introduced in the constitution of the College Union, and that henceforward the Union will boast of an elected President as well as a Vice President. The income of the Union, we also hear will increase to thrice its present amount. We congratulate the initiators of these changes on taking steps so fraught with pleasant possibilities.

In the coming winter vacation,—we are writing before it begins, —the Union authorities are organizing excursions to various places in the State as well as in Northern and Southern India. A minimum number of four students entitles the group to start for any of the places suggested. Calcutta is proving a great attraction. We are glad that excursions are becoming one of the regular features of the College activities. This is to be very much appreciated. One of the curses of a cooped in, local life, as is generally lived by a vast majority of people in this place, is a self-satisfied and circumscribed outlook, which squares ill with the least academic qualification and which the highest academic qualification can not by itself cure. Distinction in a limited atmosphere

We heartily welcome the appointments of Messrs Inayat Khan and Saif Bin-Sultan, two of our distinguished old boys, as lecturers in the Science and Arabic Departments of our College. We hear that Bazmi-Dinyat arranged a very handsome reception for their newly appointed Professors Moulvi Osman Safari Saheb and Moulvi Fazal Hasan Saheb. We welcome all of them and hope that these pages will not remain unacquainted with their respective pens.

It is a matter of extreme gratification to us that the first prize in this year's speaking competition held under the management of the Secunderabad Jashni-Meelad Committee has been won by Mr. Khawja Hameed Ahmed, a student of our College. We congratulate him on his achievement.

At the annual elections of the office bearers of our Union Club, the following ministry has been returned.
Vice-President Mr. Mazhar Hussain, B.A.

Sec: Mr. Mohammad Farooq. Lib: Mr. Mohammad Shah Khan. Asst. Treasurer: Mr. Shankar Jee. Cabinet: Messrs: A. Hasan Hashmi, G. Hafiz Khan, A. Abdul Hai, M. Baquar Hussain.

Mr. Mazhar Hussain is a young man of ability and experience and we feel sure that his term of office will prove an outstanding success. We heartily congratulate him and his Ministry and wish them luck.

We publish below the names of the office bearers of different societies and clubs of our College and Boarding Houses, and welcome them on behalf of the Magazine.

Bazmi Tarikh: Presdt: Mr. Faizuddin. Sec: Mr. S. Mohammad Ali, Editor the "*Khazinr*": Mr. Sirajuddin. Addl. Sec: Mr. Shabeer Ali. Treas: Mr. Har. Mohan Lal. Cabinet: Messrs. Ashan Aziz, Mohammad Farooq, Mahammad Raza, Partab Singh.

Bazmi Qanun: V. Presdt: Gangadhar Rao. Sec: Mr. Abdur Raof. Treas: Mr. Shakoor Beg. Members: Messrs. Naziruddin, Gurudas, Shanker Pershad, Zakaullah, Gokuldas.

In practice, at least, so far as we can judge from the quality and bulk of the past volume of this Magazine, there has never been any conflict between the Editors and the Magazine on the one hand and the Union and its authorities on the other. The Magazine has been, if ever, very slightly under the Union's control; for after the appointment of Editors recommended by the Union, it practically loses all interest in the affair. We are not in a position to predict the future of this paper. The general tendencies of our times will always favour a gradual growth of the idea of popular control. This fact has been recognized at the very beginning of our Magazine's life; and, we are sure, no reactionary proposals will find favour with students generally.

We fully recognize the need of an Advisory Board: and, further, we feel that without the help of one, it will be very difficult indeed to harmonize as a whole, separate years of the Magazine's existence. In contrast to the annually changing authorities of the Union Club as well as the Editorial staff, the Board is the stabilizng factor of the whole structure. But it will be quite contrary to facts to say that 'the Union can not fully comprehend the practical nature and work of an editor or manager', for the Board after all these years of experience constitutionally allows the Editors and the Manager to be recommended by the Union, thus implicitly recognizing the latter's sagacity in such matters. On this basis, in practice, depends the fullest understanding which generally prevails between the Editors of the Magazine and the students.

Let us now turn from these discussions. We cannot help echoing our able predecessor's sentiments regarding the elemination of sub-editor from our section of the staff. The handicap is a real one, and it was all the more brought home to us because of our long illness. At this juncture we hasten to thank Prof. E. E. Speight who so kindly consented to take up our duties during that period. Our thanks are also due to our Hon. Manager Mr. Asrar Hasan Hashmi who in the course of the work generally and in our absence especially has given undeniable help to this section of the Magazine. Personally we have come to regard him more as an auxiliary editor than as a business expert.

NOTES AND NEWS

We are, as usual, late. And, as usual, we can account for it. But, quite unusually, we won't. Accounting for one's slackness, and thus deluding oneself further into inactivity, is not the best way to get rid of it. Generally, it is enormity of sins or mistakes, boldly faced, and not abundance of excuses, lukewarmly pleaded, that proves the strongest incentive to future virtue. We need not say more.

It was after a good deal of cogitation that we accepted the responsibility of editing this paper. A stranger to this University, its ways and traditions, it seemed presumptuous in us to accept a post rightly reserved for a representative of the students. But beside the thought that experience gained in an older sister-institution would not be useless in a comparatively younger one, the fact that the students showed confidence, through their Union, in whatever humble qualifications the present writer has for the post, allayed our fears. This procedure is a pledge of the students and an honour for the Editor.

But this view, we are sorry to say, is not the only one held of the subject. In the Editorial of Vol. III Nos. 3, 4 of this magazine our able predecessor refers to certain misunderstandings which had the misfortune to crop up between the Editorial staff and the College Union. No doubt he had many good reasons for his view, as also, no doubt, had the Union for its own. "Tragedy", says a German sage," is not the struggle between Right and Wrong, but between Right and Right". So, on a smaller scale, is Misunderstanding.

Some may object to our further discussion of the subject on the ground that we do not know the details of the case and that we have not before us the Union's version of it. But this, all the more, places us in a favourable position. When we discuss down the partisan's prejudice in a partisan's statement, our review will be as impartial as it can possibly be under the circumstances. We have thus been brought to make clear the position we occupy in the social structure of this institution, a prejudiced statement of which has caused so much ill-feeling.

Now this in meaning is a sombre passage; but when we come to look into the disposition of vowel sounds, we find that the most frequent one is the colourless neutral heard in so many unaccented syllables, and the next in frequency the sound of short *i*. These two occur no less than 51 times out of 99 vowel sounds, and out of the remaining 48 vowel sounds only 14 are deep.

We may contrast with this such passages as the following, where full use is made of the possibilities, of sonority.

Tolma, thume, kakoisin, homōs atlēta peponthōs: Endure, my soul, in misfortune, even when thou sufferest unbearable things.

Theognis

(Greek gnomic poet C. 500 B. C.)

I plunged in; the cliffs, the cataract, the moon herself, were hidden in a tower of whirling spray; in the foamy rush I struck at air; waves from all sides beat me to and fro; I seemed immersed in thundering chaos, alone amid the roar of doom.

F. W. H. Myers

But, when all is said, we must never forget that all sound-effects, while contributing to the main intention of the sentence, should never be allowed to take precedence of meaning. They are but devices to make utterance more impressive. Were the sense to serve the sound, it would result in the defeat of sincerity. This has never been better illustrated than in Swinburne's parody of his own marvellous and dangerous facility in the manipulation of words:

Surely no spirit or sense of a soul that was soft to the spirit and soul of our senses
Sweetens the stress of suspiring suspicion that sobs in the semblance and sound of a sight;
Only this oracle opens Olympian, in mystical moods and triangular tenses:
Life is the lust of a lamp for the light that is dark till the dawn of the day when we die.

7. Pleasant is this level eminence, surrounded by broom and mystle, and crisp-leaved beech, and broad dark pine above. Pleasant the short slender grass, bent by insects as they alight on it or climb along it, and shining up into our eyes; interrupted by tall sisterhoods of grey lavender, and by dark-eyed cistus, and by lightsome citisus, and by little troops of serpolet running in disorder here and three.

W. S. Landor.

There is a good deal to note in this passage, whose arrangement of sounds seems quite artificial. First of all, to express the idea of level Landor levels the vowels:

Pl*ea*sant . . . l*e*vel . . . . *e*minence

This seems to start him off into similar levelling:

a*li*ght—c*li*mb—sh*ini*ng—*ey*es

and the strange group s*i*sterhoods—*ci*sters—*ci*tisus

Prof. Saintsbury rightly draws attention to the beauty of the phrase *tall sisterhoods of grey lavender* with the variety of vowels and consonants. We may also notice in the first sentence how well the variety of sounds expresses the variety of vegetation.

It is of course possible that the whole passage was written without any deliberate attention to the arrangement of sounds. If so, it possesses the more interest as a psychological study.

Recently in reading a so-called play by Mr. Lascelles Abercrombie, I was stopped by a feeling that the diction in some mysterious way did not rightly represent the meaning of the speaker. Here is the passage:

We've no help at all;
We are left alone, jail'd by river and marsh;
The malady can have its will with us
You don't know your plight; but I within me
Can see the thing, a ghost as grey as rain,
Fleeces of shadowy air wrapping his shape,
Tall as the winds, standing up over us
Smiling and idly bandying with his feet
This way and that the writhing bodies, as
A man turns rats that have taken the bane he laid.

In both these sentences the continuation of sound is represented by continuation of the same vowel sound.

3. No snag of thought was too stubbed or knotty, no clot of learning too stiff or insoluble.

In this passage Sir Sidney Colvin is writing of the 17th century poet and preacher John Donne. He wishes to show us that Donne's mind was deterred by no obstacles, though they hindered his thought and expression; and to show us this, he makes use of five words which all imply checks to action: *snag*, *stub*, *knot*, *clot*, *stiff*. These are all unpoetical words, and moreover they convey an idea of Donne's own style.

4. One black night I stood in a *garden* with fireflies in my hair like d*ar*ting restless st*ar*s caught in a mesh of d*ar*kness.

These words were written by Mrs. Sarojini Naidu. The echo of the *ā* sound has no association for the English ear; but it strikes me that it may be due to memories of Sanskrit poetry in which that sound is so frequent.

5. The window had a screen of narcissi and green grass blown by the wind.

I am sure that Mrs. Katherine Tynan Hinkson wrote this interesting sequence of sounds quite unconscious of its beauty, poet though she is. Notice the syllable *wind* at beginning and end; the repetition of sounds in the centre, and the word *blown* bearing the whole sentence away from absolute uniformity.

6. They listened again and again; but nothing was to be heard like a sound of men, nor scarcely of anything else. There was an intense noonday silence. Only the hares made a rustling noise as they ran about the long hiding grass. *Leigh Hunt.*

This is one of the passages which may have suggested Mr. Walter De La Mare's poem *The Listeners*. As you read it you can surely feel how whispery it is. This is caused by the number of sibilants, and the lightness and suspense are helped by the number of syllables in which the sound of *n* occurs. The whole effect is elfin, fairy-like.

interest. In the English word *tremble*, the Ital. *tremolo* and the Lat. *tremulare*, we can feel the actual trembling. But if we go back to Greek, we shall find that there are two words for *tremble: trein* (L. *terrere)* from which came *tremein* (L. *tremere).*

These words have evidently been built upon an onomatopœic interjection which civilized peoples have largely lost,—a violent, *trill:* you can hear it among country people when they are excited. In Greek and Latin, the words had, no doubt, lost their original force, but when the Romans built up from the stem the form *tremulare*, the sense of trembling was restored by the roll of the syllables. From the very stem the Latin had also the adjective *tremendus*, to be feared, from which comes the English *tremendous.* In this word the original accent is lost: from *trem*—it is shifted to *men.* Also both the original value of *tr* and the original sense of *tremble* are lost; *tre* has become a leaping-off place from which we alight on the syllable *men* with as much force as we intend to impart to the word.

VIII

Whenever an English writer begins to write, he is only partly free. He has to impose his will upon language, and that is by no means so easy as we might think. For language, being a medium of whose power we are largely unconscious, is rich with latent suggestions—one word calls up another, one phrase arouses its fellow; with words and phrases come ideas and trains of thought, and these in their turn lead to fresh words and phrases. One result is that with most people, what they have written is and expresses something more than they intended to write. It possesses qualities of which they may or may not be conscious. Tonecolour is one of those qualities, connected with the auditory sense. Let us examine a few conspicuous examples of tone-colour.

1. The *sound* re*sound*ed through the *house* like thunder.
   Dickens.

2. Like an *iron* c*lan*ging *an*vil b*an*ged with h*am*mers.
   Tennyson.

The word *wind* by its sound alone gives us no sense of even a slight storm, because the original *V* sound has been changed into *W*, and the original vowel weakened and shortened.

But in Sanskrit the cognate word was *vā* which does suggest the sound of blowing. The oldest Germanic form is the Gothic *waian*, in which we can still hear the wind wandering about, as in the Lith. *wijas*. But in the Latin *ventus*, Russ. *vieter* wind, G. *giwetter* storm, and English *weather*, the original sound-force is largely or wholly lost.

So English poets find that the word *wind* by itself has not sufficient tone-colour to suggest what it means, and they therefore intensify this meaning by epithets such as *wandering*, *wailing*, *moaning (wind)* or by the near presence of more suggestive sounds.

On the other hand we have words in English which are more suggestive than the older cognate forms. For example, *scratch* really imitates the sound, because of the initial and the final *ch*. But the original form *krat*—or *kret*—to cut, as preserved in English *grate*, to scrape, has no suggestive value.

So the word *pompous* now suggests solemn demeanour verging on the ridiculous. But the original meaning we find in the Greek *pempein*, to send, *pompe*, an escort, ceremonial procession.

A very interesting verbal development is to be seen in the word *tremendous*. In one of his essays, Stevenson wrote:

'We have all heard of cities in South America built upon the side of fiery mountains, and how, even in this tremendous neighbourhood, the inhabitants are not a jot more impressed by the solemnity of mortal conditions than if they were delving gardens in the greenest corner of England.'

On this pasage, Professor Raleigh remarks: 'You can feel the ground shake and see the volcano tower above you at that word *tremendous neighbourhood*.'

That is one side of the interest attached to the word *tremendous*: the original meaning of *trembling* and so causing *terror* is strikingly revealed in Stevenson's sentence. (Skt. *tras*, tremble. Russ. *triasti*, shiver). But there is a further

especially its latent and suggestive force, is of even greater import. The following sentences have much more in them than the mere facts they state:

1. A low and tremulous and melancholy song.
W. S. Landor.

2. Her eyes are sweet and subtle, wild and sleepy, by turns.
De Quincey.

3. In the mighty calms that brood for weeks over tropic latitudes. *De Quincey.*

4. There was something in the tint of the tender sprays resembling that of the hair they encircled.
W. S. Landor.

5. Thou and I must go too. Perhaps the next year may blow us away with its fallen leaves. *W. S. Landor.*

6. (Of a West African mangrove swamp).

After dark it is full of noises; grunts from I know not what; splashes from jumping fish; the peculiar whir of rushing crabs, and quaint creaking and groaning sounds from the trees; and—above all in eeriness—the strange whine and sighing cough of crocodiles. *Mary Kingsley.*

VII

It is probable that many more words than we think were originally imitative in sound, attempts to reproduce in tone an impression of the quality of the thing or state spoken of. For example the English word *heavy* conveys no emotional idea. But the word which meant *heavy* in Sanskrit, *guru*, a deep sound itself, did convey a sense of weight. The cognate Greek form *baru*, from which comes our *barometer*, was not so suggestive, and the cognate Latin *gravi*—and English *grave*, are both too light to suggest by sound the meaning they stand for.

Similarly there are many sounds in English which the natural processes of phonetic decay have completely deprived of their original tone-force or suggestive value, and they have taken their places in an entirely new scheme of sound associations. Thus the above English adjective *grave* may owe some of its solemnity to the idea it also calls up of a *tomb*.

weight, as soon as we consider the words as vehicles of thought and feeling.' This is the more possible in English because the language is rich in two kinds of pictorial words, one sort which naturally by their sound produce definite emotions, the other sort which suggest to the English mind certain ideas. Of the first kind the following words are examples :

More	*screech*	*ghastly*	*awe*	*twitter*
fierce	*flop*	*plunge*	*rustle*	*murmuring*

Of the second kind, which call up ideas by associations other than those of sound, are these words :

sorrow	*murder*	*sweet*	*rosy*	*fire*
storm	*round*	*song*	*wonderful*	*dance*

VI

This question of tone-colour is a part of the larger question of association of ideas, and there is no doubt that the power and beauty of literature both depend to a great extent upon this fringe as association round the main meaning, this light or mist that plays about all words and groupings of words.

This suggestive atmosphere differs with individuals and is independent of logical understanding. We may like or dislike passages in foreign languages on account of their tone-colour, even if we do not know their meaning, just as a sailor may laugh at the earnest conversation of highly educated people.

In most Eastern languages there are elaborate systems of representing facts and feelings by onomatopœic reduplicatives, yet often years go by before we foreigners can feel instinctively the meaning of many of them. When we are learning another language, it is long before we can forget the associations of sounds in our own words and come to feel those of the foreign words. If we are intent upon the meaning only, we neglect everything else. But in the understanding and enjoyment of literature, the logical meaning is only one of the possibilities of any passage,—the style, with its varied beauty or harmony, and

whose combinations he may vary to represent, as faithfully as possible, his own ideas. Thus Whitman, cataloguing stubborn, material objects in his *Song of the Broad Axe*, has this line :

Chair, tub, hoop, table, wicket, vane, sash, floor,

While Galsworthy attains extreme beauty by variety of vowels of lingering sound :

Her pale gold hair, her true look, her sweetness.

Compare Swift's lines :

A skilful critic justly blames.

Hard, tough, guttural, harsh, stiff names.

Similarly Milton has :

O'er many a frozen, many a fiery Alp,

Rocks, caves, lakes, fens, bogs, dens, and shades of death,—

of which passage Prof. Raleigh writes : ' What more heart-rending effect of weariness and eternity of effort could be produced in a simple line than this description of the dolorous march of the fallen angels? '

I would contrast with these the famous witches' incantation in *Macbeth :*

For a charm of powerful trouble,
Like a hell-broth boil and bubble ;
Double, double, toil and trouble,
Fire burn and cauldron bubble.

The line from Milton makes us tired ; the Shakespeare verses make us sing. And this is done merely by choice of sounds,—all harshness and obstruction in the Milton passage, all ease and fluency in the lines from Shakespeare. In all great writers you will find that both conscious and unconscious use is made of such sound-effects,—in the former case by cool choice, in the latter by the subtle suggestiveness of words acting upon a heated imagination. In scientific parlance this has been expressed as follows by a recent American investigator of prose rhythm, Prof. Patterson :

' Patterns of tone-colour are super-imposed, as soon as we consider the actual sound of the words, and patterns of subjective

of intricate silver, and fringes of amber, lustrous, arborescent, burnished through every fibre into fitful brightness and glossy traverses of silken change, yet all subdued and pensive, and framed for simplest, sweetest offices of grace. They will not be gathered, like the flowers for chaplet or love-token; but of them the wild bird will make its nest, and the wearied child his pillow.'

John Ruskin.

V

If you compare the languages of civilized nations, you will find that English is remarkable for its richness in word-endings, and generally in variety of sounds. We know that both Goethe and Heine complained of the limitations of German; Italian, like Japanese, is poor in consonantal endings, though in both cases more are heard in actual speech than appear in literature, owing to elision; the French have vocalized or nasalized many of their words that end in consonants; and in the inflected languages, such as Sanskrit, Greek and Latin, case endings in agreement were the cause of monotony of sound as in: *Apo toutou tolmematos epenethe*: for this bold act he was praised (Thucydides),—though it was at times a pleasing monotony, as in Sappho's:

Amphi de psuchon keladei di'usdōn
Malinōn, aisthussomenōn de phullōn
Koma katarrei—

Where we have only six different endings, while in the English translation we have fifteen:

'And round about cool waters (or breezes) murmur through apple-boughs, while slumber streams down from quivering leaves.'

This wealth of possible final syllables gives English many advantages. It makes possible an elaborate system of rhyming, and lends to prose and verse that variety without which it is difficult to achieve the great aim and need of all art, the delight and charm which is more than momentary. It also provides the careful or fastidious writer with abundant choice of syllables

IV

Saintsbury, in his valuable *History of English Prose Rhythm* has a very suggestive page, characteristically English in spirit, in which he reflects our inherent opposition to the Latin idea of absolute correspondence of wording and thought, our waywardness, if you will. He is speaking of the wonderful effects which the early English translators produced, not by absolutely faithful and literal translation but by the free use of synonyms. He tells us of 'The surprise of a foreign scholar when I myself claimed, as a special virture of our tongue, its abundance of not always exactly synonymous synonyms.' He seemed to think that 'one thought one word' was the counsel of perfection in language ; while 'my ideal was as many slightly varied thoughts as possible for a word, and as many distinctly varied words as possible for a thought.'

And speaking of translation, he says : " With a rigid rendering of ' same word by same word ' rhythmical perfection is simply impossible."

These thoughts lead us to the level on which a higher than merely measurable fitness is gained by the operation of mind and spirit of an unusally exalted nature. The translators of the authorized version of the Bible in 1611 and those of the editions immediately preceding, lived at a time of great ardour of spirit, in which they themselves were partakers. By their labours they produced the most impressive text of the Hebrew Scriptures in any language, and in surpassing their originals they attained a fitness unto generations far beyond their own.

A piece of moss among the rocks, of which we should find a few words sufficiently descriptive, for a deep and noble type of mind has a significance that even the fullest command of language fails to express or suggest.

' No words, that I know of, will say what these mosses are. None are delicate enough, none perfect enough, none rich enough. How is one to tell of the rounded bosses of furred and beaming green,—the starred divisions of rubied bloom, fine-filmed, as if the Rock-Spirits could spin porphyry as we do glass,—the traceries

And so Mr. Bridges continues through seventeen lines at the end of which analysis he says: 'The relation of the form of the verse to the sense is not intended to be taken exactly; it is a matter of feeling between the two, and is misrepresented by any definition. Poetry would be awkward which was always mimicing the diction of the sense; but that is a different thing from matter and form being in a live harmonious relation.'

In this connection, John Keats wrote the following sonnet:

If by dull rhymes our English must be chain'd,
And, like Andromeda, the Sonnet sweet
Fetter'd, in spite of pained loveliness;
Let us find out, if we must be constrain'd,
Sandals more interwoven and complete
To fit the naked foot of poesy;
Let us inspect the lyre, and weigh the stress
Of every chord, and see what may be gain'd
By ear industrious, and attention meet;
Misers of sound and syllable, no less
Than Midas of his coinage, let us be
Jealous of dead leaves in the bay wreath crown;
So, if we may not let the Muse be free,
She will be bound with garlands of her own.

These words are no less applicable to prose composition than to poetry.

Close study of our greatest prose writers, such as Jeremy Taylor, John Milton, George Berkeley, Edmund Burke, Landor, De Quincey and Ruskin will reveal just as careful consideration of the harmony of sound and sense as we find in the poets.

In the case quoted above, appropriateness is deliberately effected,—the result of artifice. But the finest kinds of fitness are undoubtedly those which are the result of a natural flow of words from a mind or soul that has identified itself, perhaps by long, subconscious association, with the outer things it shapes by spiritual mastery into lasting beauty. This kind of writing, in verse or prose, is the very rarest, and it can be recognized as surely as we recognize the wild cherry blossoming in the shadowy forest.

merely a titillation when this method degenerates into verbal trickery as we often find in the works of Bernard Shaw, Chesterton and George Moore.

III

Students have need to be particularly careful in their use of out-of-the-way expressions, colloquial idioms and proverbs in English. Because we have heard an expression used in certain circumstances, it by no means follows that we can use it appropriately on other occasions. Taking over an unusual phrase is like transplanting; we must be sure first that we have the right soil, light and atmosphere for our plant to thrive in before we remove it. Generally speaking, it is far safer, when writing English, to invent phrases, or to use Indian forms and figures of speech than to borrow expressions with whose use and limitations we are not well acquainted.

Poets, who generally work on a smaller scale than prose writers, have paid much attention to the effects of their very words and lines. The late poet laureate, Mr. Robert Bridges, in a study of Milton's prosody, takes the beginning of the first chorus in *Samson Agonistes*, and shows us, line by line, how Milton, by choice and sound of words, produced the effects he intended.

'This, this is he; softly awhile,
an eight-syllable line, with third foot inverted; the sibilants are hushing.

Let us not break in upon him:
a perfect four-foot line in falling rhythm.

O change beyond report, thought or belief!
a ten-syllable line, metre reflective: the fourth foot inverted for wonder.

See how he lies at random, carelessly diffused,
the first twelve-syllable line in the poem. In describing great Samson stretched on the bank, it describes itself.

With languish'd head unpropt,
a six syllable line, its shortness is the want of support.'

be a reversion to an earlier stage of development, and so renouncing his own ideals.

II

According to the degrees of fitness which certain styles evince, there come about secondary calculations in criticism. For example, many people, by the very incongruity of their speech or writing, produce effects they never intended. Humour often arises thus, just as wit is generally a form of unfitness by exaggeration.

A great part of the humour of a book I widely recommend, James Stephen's *Crock of Gold*, comes from the fact that one of the chief characters, a philosopher, is always talking like a book when he should be using the language of a human being. For example, as he is being escorted to a police station by a number of constables for some supposed crime, he addresses them as follows: 'Birds have atmospheric and levitational information which millions of years will not render accessible to us; who that has seen a spider weaving his labyrinth, or a bee voyaging safely in the trackless air, can refuse to credit that a vivid, trained intelligence animates these small enigmas? And the commonest earthworm is the heir to a culture before which I bow with the profoundest veneration.'

No wonder that after what fills several pages with such bombast, the sergeant loses his temper and cries out: 'Say something, for goodness' sake, to takethe sound of that man's clack out of my ear.'

Many of the striking effects of Dickens are produced in this way. We first wonder at the strangeness of a character's talk, and at last we concur that this very unsuitability to normal conditions is a fitting representation of something abnormal. Some of our most famous living writers depend for their success upon a constant display of apparent unfitness in their diction. As we read them, they are incessantly rousing us from our complacence by unexpected words and phrases, a salutary experience when it leads us to the recognition of a higher truth or harmony; but

SOUND AND MEANING

BY E. E. SPEIGHT

I

Equally on a small scale and on a large, in a poem, an essay, a novel or a drama, fitness of vocabulary, syntax, and order of presentation has to be constantly kept in view. Just as paintings attain various degrees of correspondence with the objects they represent, all writing in prose or verse is dependent for its success upon the fitness of its style to transmit the ideas with which it deals. This too, like rhythm, is a matter which is often neglected, especially in its more precise details. It is, in reality, a very wide and fascinating field of study, and in practice it involves years of patient work. Many writers appear never to have recognized the need of such conforming of style to subject. Writers whose prevailing attitude is subjective, are more concerned with the fitness of their prose and verse to their own moods. Writers who have pronounced objective affinities seem to be part of nature : their work produces upon us the effects of sunshine and storm, of clear vision of any objects of life that are around us or to be imagined. Literature is full of examples of failure through unfitness. Swinburne gradually wearied his public by his prolixity and facility and extravagance; in spite of his astonishing verbal and rhythmical dexerity, his wonderful gifts of expression, his scholarship and his general sanity, we feel that much of his torrents of verse would have stronger and more lasting appeal if they had been diverted into channels of prose. Tennyson and Robert Bridges attempted drama for which they had neither the life experience nor the vitalizing imagination. Wordsworth pompously treated the trivial, with more ridiculous results than even Dr. Johnson achieved in his flatter moments. Meredith and Browning placed their own idiosyncrasies of speech in the mouths of most of their characters. Mr. W. B. Yeats for a time was defacing what should be things of beauty by a realism which may

The battlements grow dim ; grey dome on dome,
Proud tower on tower, and every human home,
All vanish, swallowed in the thunderous reek
Of bellowing leviathans. One bleak
Abandoned soul remains the tumult spares
For deeper vision. Fast the lightning flares ;
The huge clouds burst; dark veils of flood descend
On farm and field and forest ; strong trees bend
Breasting the rising gale, age-gnarled front
Against an unseen foe of mighty brunt.
Long is the night ; many the lives he lives
Beneath the uproar and the streaming sieves
That drain the flaming zenith ; spear in hand
He stalks the lion in the Assyrian land
Long ere Lagash arose ; a golden youth
He strives with Agamemnon, hears the truth
That grew the tale of Troy ; in manhood fought
His way to the Varangian guard he sought
O'er many a sea ; old age he reaches, white
As the Afghan snows when home from fight on fight
In the sultry plains he mounts the northern track
Laden with comforts frozen cities lack,
With slaves and jewels,—mounts to the marble tomb
He sees arising like a soul from gloom,
White-domed against a sky of thunder, bright
As a window of heaven in eternal night.

IV

MOTHS

Now at last I will go to sleep
And let them, once, the dark moths, creep
About me, I have kept, like fears,
Outside my net all night for years,
And let them whisper what they will
Out of their world, and I will listen
And watch the ancient starlight glisten
Deep in the mirror of their eyes,
And hear the world's vast wanderings
In the quiet rustle of their wings,
And all things mighty turn to be
Mothlike, and every sigh a sea.

V.

A MONSOON SCENE

He sits upon a giant's helm of rock,
Time on the timeless, while they slowly flock
Homeward, all friendly things, the splendid sun,
Glad brooklets, browsing goats, and one by one
Brown faggot-burdened mortals poor as they,
And nibbling, too, of berries by the way.
In the last stream of light between two storms
Foregathering fast, he sees terrific forms,
Wrath-purple dragons pouting levin forth
Athwart the murky chaos of the north,
The lurid south. Fast flees the day, aghast.
Alone he sits, forgotten, like the last
Of men in a lost world, and bids farewell
To the beautiful city he has known so well
For good and evil, set in rocks that roll
Like ribs of earth upcast in tor and knoll
Among green crofts and sunset lights the swift
Wild storm submerges ; through a closing rift

The world beyond
The wings of mind :
Infinitude
Is still confined.

All things that bird
Or man has thought
Move in orbits
Found when sought ;
And every rhythm
Is but rest
Woven round
A tiny nest.

III

FAILURE

World upon world lay open to his will,
Rays of uncounted stars in confluence
Surrounded him with awful power, but still
He could not escape thence.

Mysterious forces merging into light
And finest adaptations utterly
Beyond the pale of vision gave him sight,
And still he could not see.

Heroic figures moved within his mind,
The rise and fall of races shaped his thought,
And yet he felt himself of humankind
The lowest, less than naught.

He was a kinsman of the wandering air,
A whispering stream, a moth in darkness, soon
To vanish no one understanding where,
An unremembered tune.

FIVE POEMS

BY E. E. SPEIGHT

I

DAWN IN THE DECCAN

Glorious the blue hours of morning, splendid
The cloudy flocks forthdriven
By the great sun, when night's dark tale is ended,
Down the deep vault of heaven.
A blossom in the garland of the hero
God gave this world to wield,
Asoka some have named him, others Nero,
Two-sided his dread shield.
The heavens glorify, the heavens thunder
Wild ruin over earth;
He gathers to his heart, He drives asunder
Who is the Lord of birth.

II

A LITTLE TUNE

A bird can count
To three, to five,
But man has found
The heavens alive
With infinite number,
Infinite space:
A nest is such

A tiny place.
A man can fly
The world around
But yet his wisdom
Has not found

one of feeling and experience, Shelley, like Milton, finds in the death of his friend an opportunity of expressing his ideas, a peg to hang his metaphysical robes on. Though *Adonais* is the only elegy which comes nearest Tennyson's performance in spirit and intention, it is far inferior to *In Memoriam* as an elegy. It is in *In Memoriam* alone that the Elegy in English Literature reaches its full height.

which from sheer sorrow disbelieves anything and everything gradually gives place first to a 'calm despair', then to a raging, torrential struggle between a sense of complete loss and the thought that all the past love is not in vain. The poet, for a while, contents himself with this alone.

To him

"'Tis better to have loved and lost
"Than never to have loved at all."

Then ensues that struggle between Faith and Doubt about a Life to come, which we have sketched above.

All these hopeful speculations, at times involving gravest doubts, reconcile the poet to the ways of Nature.

"I curse not Nature, no, nor Death;
For nothing is that errs from law."

And imagination, strengthened by faith, points out that death has in no way quenched the love that the poet bore his friend; for death

"gave all ripeness to the grain,
"It might have drawn from after heat."

And, indeed, the poet's faith in the power of love leads him to believe that the dead friend is always with him and to feel

"His being working in mine own,
"The footsteps of his life in mine."

Thereafter the way is clear and the poem takes a happy turn. The bitterness of doubt passes and the poet indulges in happy memories and happier fancies.

"And all is well, tho' faith and form
"Be sunder'd in the night of fear;
"Well roars the storm to those that hear
"A deeper voice across the storm."

Apparently, Shelley and Tennyson have dealt with a common subject. It is in their method that the difference lies. Tennyson has never wandered off from his theme; his poem is

But what about the laws of Nature then? Who can change them? Nature cries out.

" I care for nothing, all shall go."
In this battle of God and nature, of love and death
" he, shall he
" Man, her last work, who seem'd so fair,
Such splendid purpose in his eyes,
Who roll'd the psalm to wintry skies,
Who built him fanes of fruitless prayer,
Who trusted God was love indeed
And love Creation's final law—
Tho' Nature, red in tooth and claw
With ravine, shriek'd against his creed—
Who loved, who suffer'd countless ills,
Who battled for the True, the just,
Be blown about the desert dust,
Or seal'd within the iron hills?
No more? A monster then, a dream
A discord. Dragons of the prime,
That tare each other in their slime,
Were mellow music match'd with him.

Tennyson thus makes out a strong case for a second and happier life after death. This indirect way of proving his assertion leaves us astounded at the strength of his faith and the largeness of his hope.

Another feature of *In Memoriam* is, as Bradley characterizes it, the 'Way of the Soul'. It is a deep study of the sufferer's nature through all the stages of grief:—from a 'first stupor and confusion' which shakes the very foundations of the poet's faith in God, Love and Immortality (ideas always co-existing in Tennyson) 'through a growing acquiescence, often disturbed by recurrence of pain, to an almost unclouded peace and joy'.

Any attempt to illustrate the above remarks will be too much for this essay. We can only say that each phase of the grief caused by the loss, is faithfully described. The state of mind

yet effective simile can be found for Tennyson's love for Hallam that he has employed in the following lines :—

" My spirit loved and loves him yet,
" Like some poor girl whose heart is set
"On one whose rank exceeds her own."

The main purpose of the poem—the expression of grief, is, as has been said, found connecting the different sections of *In Memoriam.*

Some typical lines are the following :—

" My Arthur whom I shall not see
" Till all my widow'd race be run ;
" Dear as the mother to the son,
" More than my brothers are to me."

So far we have been dealing with the form and method of treatment. It will not be out of place if an idea of the serious topics dealt with be given here.

' Is there no life after death ? '—is the question the poet puts to himself and answers it in several ways. Love's strength proves to him that death is not the end of love.

" If Death were seen
" At first as death, Love had not been,
" Or been in narrowest working shut,
" Mere fellowship of sluggish moods,"

which, clearly, love is not.

Further, in the middle portion of the poem, the poet says that the wish of surviving death arises out of

" What we have
The likest God within the soul."

For, he proceeds,

" Behold, we know not any thing ;
" I can but trust that good shall fall
" At last—far off—at last to all,
" And every winter change to spring.

But we cannot help feeling that in this maze of philosophical speculation, the real theme remains unimproved.

The only way to answer the charge that *In Memoriam* is too long for an elegy, is to explain it as a group of elegies. Thus treated, the poem at once takes rank as the finest of its order. It is true that at places it rises above an average man's understanding and that at others it is no more than a 'sad mechanic exercise'; yet for the most part it is simple, full of pathos and feeling, and abounding in homely images and ideas, not of particular, but of general interest. How proud Tennyson must have felt of the universal applicability and comforting power of his work when Queen Victoria told him that 'next to the Bible, *In Memoriam* had been her comfort'. How many times, since, the sentiment has been echoed, cannot be better understood than by reading the poem for oneself.

It is idle to repeat the circumstances under which *In Memoriam* was produced. Tennyson's love for Hallam, combined with a deep sense of personal loss at his death, is the key-note of the poem. It treats of a large range of subjects. Memories of the past, sorrow and dejection for the present, hopes and expectation for future, all surge up in the poet's breast. Questions far more serious, yet in no way unconnected with the main issue, present themselves before him. He sings of them all—in lamentation of his friend.

In Memoriam has a distinct music of its lines. Indeed it is partly due to the discovery of this form of expression, suitable alike to descriptive and meditative poetry, that *In Memoriam* has been such a popular poem. The language used is simple throughout; in fact some of the most beautiful passages are made up of monosyllables mainly, e. g.

"Oh yet we trust that somehow good
"Will be the final goal of ill."
"I sometimes hold it half a sin
"To put in words the grief I feel."

This beauty of expression is further enhanced by the wealth and simplicity of imagery in the poem. No more pathetic and

Now we come to the most famous elegies of the English language viz., Shelley's *Adonais* and Tennyson's *In Memoriam.* Both of these are richer in thought, higher in sentiment, and more subtle in diction than either *Astrophel* or *Lycidas* or the *Country Churchyard.* In fact, *Adonais* is the more subtle of the two, as also it is less elegiac.

Shelley is not as deeply affected by Keats' death as is Tennyson by Hallam's. It is his vast intellectual sympathy that makes him feel those pangs which a more intimate friend of Keats might have felt.

" the curse of Cain
" Light on his head who pierced thy innocent breast."

In *Adonais*, there are magnificent passages, reflective and speculative, about the freedom and pleasure of the soul, the origin and end of Life, the superior power of Love as compared with Death. These are the true expressions of the poet's sense of grief. Keats' death has more affected Shelley's mind than his heart. He mourns for his death as a great loss to the realm of poetry. He shows how Keats is received in Heaven as a King among

" The inheritors of unfulfilled renown."

This is the nature of Shelley's grief, and similar is his attitude in his hope for the welfare and progress of the soul of the dead Genius.

" We decay
" Like corpses in a charnel ;
" He has outsoared the shadow of our night."
" He is a portion of that loveliness
" Which once he made more lovely."

Here and afterwards the poet elaborates on the transition which the soul undergoes in its progress till

" He is made one with nature."

This state of mind gives rise to a far more cheerful thought that the soul of the departed friend is gone to a better world where existence is full of unending happiness:

" He lives, he wakes—'tis Death is dead, not he ;
Mourn not for Adonais " . . . . . .

" For we were nursed upon the self-same hill,
" Fed the same flock by fountain, shade and rill."
" Where were ye Nymphs, when the remorseless deep
" Closed o'er the head of your loved Lycidas ? "

But considering Milton's little intimacy with King and the fact that he could very well have left it to the Nymphs to mourn the death of their 'loved Lycidas', had not the demand for expression of quite different ideas synchronized with King's death, the formalities are justified; and, within these, *Lycidas* is as powerful as any of Milton's other works.

Gray's *Elegy* is an unique achievement considering that he was not actuated by any feeling of personal loss or responsibility of commemorating a dead acquaintance. The *Elegy* has, nevertheless, a rich note of pathos which is not present in *Lycidas* and a depth of feeling which '*Astrophel*' lacks so much.

" One morn I miss'd him on the custom'd hill,
" Along the heath, and near his favourite tree;
" Another came, nor yet beside the rill,
" Nor up the lawn nor at the wood was he;

As there is no analogy to keep up, and no conventional and laborious invocation of the Muse, there is space and energy left for natural play of thought. *e.g.*

" Can storied urn or animated bust
" Back to its mansion call the fleeting breath ? "
" Some mute inglorious Milton here may rest
" Some Cromwell guiltless of his country's blood."

and the famous stanza beginning :—

" Full many a gem of purest ray serene."

But this play of thought is so very different from that of Milton's sturdy denunciations. The description of the churchyard at dusk and the loving meditation over the fate of the 'rude Forefathers of the hamlet' are beautiful and quite in harmony with an average man's flight of thought on such occasions. Gray strikes a new note. An ennobling effect of death and an inherent pathos in the very idea of mortality is emphasized throughout the poem.

elegy has arisen, the aritificial barriers of tradition have been broken down and works like *In Memoriam* have come into being. Such poems comfort the writer, for they relieve his feelings :—

" Like dull narcotics, numbing pain;"

and " they are valued by the general reader for their bearing upon his own life."

This cannot be better illustrated than by reviewing, so far as possible, typicial English elegies.

Spenser's '*Astrophel*' is a simple expression of grief on the loss of a much-loved patron. His description of the personal qualities of the dead man is admirable.

" In every one he vanquisht every one,
" He vanquisht all, and vanquisht was of none."

Spenser's expression of regret is apparent; he has well repaid a patron's favours; but there is a lack of depth of feeling, and the poem, as a whole, has an air of aloofness about it.

Milton's *Lycidas* is even more aloof and artificial, and the absence of real grief is shown by the vehemence of his appeal against the state of religious affairs. To him, his own loss, by King's death, is negligible when compared to that suffered by the Church.

" How well could I have spared for thee, young swain,
" Enow of such as for their bellies' sake
" Creep, intrude and climb into the fold."

His comments on secondary matters are, as usual, magnificent; which again proves his indifference towards the real tragedy.

" Fame is no plant that grows on mortal soil,
" But lives and spreads aloft by those pure eyes
" And perfect witness of all-judging Jove."

Proceeding, we notice that personal feeling and memories are so conventionally expressed that any real note of sorrow and regret has been completely choked.

THE ELEGY IN ENGLISH POETRY

The word *elegy* carries with it an idea of lamentation or regret caused by the death of some one very much loved or admired, or by a general sense of the pathos of mortality. In its original form, the elegy was much more than a song of regret. In Greek as well as Arabic and Persian (and hence in Urdu) Literatures, the elegy was a semi-epic composition describing the character of the hero, the circumstances of his death, the causes of the death and, finally, the loss and sorrow occasioned by it.

In English this breadth of the meaning of elegy was, by practice, narrowed down and certain characteristic features began to develop. Thus the following points became essentials of an elegy :—

1. It should be a short composition.
2. It should be mournful in tone.
3. From the nature of the subject, it cannot but be a meditative production.

It was, I think, the development of the tragedy and the definite presence of the epic in the early ages of the English Literature that relieved the elegy of its original encumbrances.

The conventional type of elegy *i.e.* pastoral elegy, came into English Literature during the Renaissance through the influence of the Sicilian Greek poets, Theocritus, Moschus and Bion. From Spenser to Matthew Arnold, nearly all the elegies take the pastoral form.

In my opinion, the keeping up of the pastoral tradition is incompatible with true feeling in writing an elegy. It must be a very weak grief indeed which can be expressed in a set and narrow form of long-drawn-out analogy; for analogy, circumscribing expression, is detrimental to a free flow of thought and feeling. As a consequence, whenever a deep, personal loss has initiated poetic outburst, that is to say, whenever a true occasion for an

glance and indifferent look. He peeped into the magnificent house. The old one had been pulled down and there stood a new palatial building. He looked into the house. What did he see? His wife sitting happily, beside an extremely handsome man who was looking lovingly at her. This was more than Dwarkanath could endure. With one bound, he was at his rival's side dealing him a severe blow.

With this he awoke and lo, it was all a dream. He was in his own room, in his own bed soaked in perspiration, thoroughly exhausted, his heart throbbing abnormally. The clock then struck two.

When the sun rose next, it found Dwarkanath completely changed. The Chancellor of the Benares University received a cheque for one million rupees from Dwarkanath asking him to erect a Hostel in memory of his two deceased sons Savsharnath and Shankarnath.

M. NAZIRUDDIN,
(of LL.B. Previous.)
Osmania University College.

something against the allegations brought by my own children. I think all have conspired against me. Yes, I have not given them luxury and comfort because I believe it makes youth dull, idle and dependent on others. As to education I have no faith in it. It often makes men conscious of their surroundings and environment. They often demand their rights, their due shares of all things. I worked hard to gain money and had right to use it as I pleased, but I gave them a good allowance . . . . . no my Lords, I cannot speak more. If I had been fully aware that this kind of investigation would have been done, I would certainly have lived a better life. But in spite of this I have done no wrong, simply used my money, my rights———I am feeling dizzy.'

'Dwarkanath, there are many more allegations against you, but they are all of the same category. So we will now decide the case and thus save you from the penalty of unnecessary detention.'

'The severest punishment must be given,' said one of the judges.

'Yes, yes' said the other, 'send him to the lowest region of Hell to receive the severest punishment.' 'Yes, I agree' said the other.

But the eldest and the most serious of them was calm and quiet. He neither agreed with the other judges nor proceeded to propose any alteration.

'What is your opinion?' asked his colleagues. 'I think the best, wisest, severest punishment would be to send him back into the utmost adversity and specially let him see how his heirs are using the money he so immorally, cleverly, rather illegally, obtained.'

'Excellent! excellent!' the others too cried. Dwarkanath was sadly returned to earth and was standing near the gate of his own house imploring his former Durwan for admission. The Durwan displayed complete ignorance of him. He told his name and enumerated many items of his former life to convince him, but in vain. The Durwan joked and gave him a cuff on the head. Still he stood amazed. In a beautiful Rolls Royce his son Dayanath passed by; the latter saw him but proceeded with a careless

house until my death, but a month after the death of his father, Dwarkanath turned me out for a paltry sum. I had nowhere to go for the remaining period of my life, nor was I able to work for my living. I spent many long dark cold nights under a tree, and passed many a day and night without food, and prayed and prayed for immediate death.'

'Once, when I asked for help, he kicked me out from his presence.'

'Will you answer these grave charges?' said the judges to Dwarkanath, with the utmost contempt.

'My Lords, I plead "not guilty". I thought this woman had relatives and friends. Moreover, I had right to use my property as I liked. I never kicked her and if my servants behaved so rudely to her, I must not be held responsible. As for her starvation, I was quite ignorant and I am sorry for it.' Some drops of sweat rolled from his forehead when he sat down with downcast eyes and in repentant mood.

Then came two youths. 'My Lords,' one of them said, 'though he is our father, truth must be told at any cost. He has no spark of goodness in him. He treated us most wickedly. He never spoke a word of kindness; gave us rotten food to eat and dirty clothes to wear, and kept us in ignorance and darkness, never gave us a chance to be educated and when we implored him for it, he refused to spend money for the same. Our natural gifts and faculties remained latent, undeveloped. When we fell ill, instead of consulting an authorised physician he gave us home-made medicine. When we were on our death-bed, he was too busy with his balance sheet and accounts. Though he had millions of money he never did a stroke of work for the welfare of his family, not to speak of country. He was selfish, and money was all to him. He was the greatest miser that ever lived on the face of the globe.'
'Get up,' said the judges 'this is a strange case, Dwarkanath; even your own children are against you.'

'My Lords, I am bewildered' said the miser, 'you have refused to allow my pleader to put forward my case. I neither know law nor am I accustomed to speak before judges. But I must say

NEMESIS

My Lords, he is an admirable creature. He has no conscience, no kindness, no heart———a perfectly callous brute. I paid him thrice the sum he lent to me together with interest, but when I failed to pay him one instalment on account of failure of crops and illness, he brought a suit against me and sent me to prison, confiscated my farm and left us to starve and face a lingering death. When I was released from prison, the world treated me mercilessly: wherever I applied for work I was refused, having been a convict. Thus I lost my position, honour and an opportunity of leading an honest life. My little innocent children, sick wife and myself starved many a day; two of us being the victims of his cold-heartedness. This heartless creature before you is the cause of all our misery. I implore you to give him fit punishment. The man exhausted, existed and trembling with hunger sat down.

'What is your answer Dwarkanath?' said one of the three judges, 'speak'. Perspiring in his agony of shame, Dwarkanath stood.

'My Lords,' he said, 'I stand on sound and solid ground and do not fear the false charges of Ram Das. What I have done was right. I acted within the law. Here is the document duly signed by him, and the decree of the magistrate is against him.'

'My Lords, he gave a bribe to the magistrate', interrupted Ramdas. 'Hold your tongue; we know everything', the judges said.

Next came an old feeble woman walking with the help of a staff. She said: 'My Lords, my story is sad and I am extremely sorry to narrate it before you, but I will cut it very short. Dwarkanath's father gave my son a free little house with a farm in recognition of faithful and honest services. Ah, my son soon died, leaving me all alone in the world. Dwarkanath's father helped me and gave me comfort and permission to keep the farm and the

Pratapa Rudra Dev II. for Mohammad-bin-Tughlaq, and was afterwards, known as the 'Takht-i-Firuza'.

In A.D. 1424 Ahmad Shah Wali, the brother of Firuz Shah, king of Bahmani, proceeded towards Warangal with a large army, when the Raja broke the peace by making an alliance with the Raja of Vijayanagar. In a few weeks the Bahmani general Khan-i-Azam defeated the Raja, and Warangal came with all its treasure directly under the sway of the Musalmans.

On the downfall of the Bahmani kingdom, Shitab Khan allied himself with the Hindus and with their help established a small principality of Warangal and Hanumkonda in 1503.

About 1515 Sultan Quli Qutb Shah, to check the power of Shitab Khan, conquered eastern Telingana from which time Warangal was a part of the Qutb Shahi dominions.

In 1687, Warangal became a part of the Mughal Empire when Aurangzib captured Golconda. After the death of Aurangzib Prince Kam Baksh could not turn his attention towards Warangal. During this time a petty toddy drawer named Papra collected an army, captured Warangal and plundered it. Hearing this, Bahadur Shah, the Emperor of Delhi, sent Yusuf Khan with an army, who put Papra to death.

In 1767, Warangal was occupied by the forces under Colonel Peach. But from 1768 it has been completely under the sway of the Nizam of Hyderabad, and is a subah of his dominions.

SAYYID SIRAJUDDIN AHMED,
Student of M.A. Class,
Osmania College,
Editor, 'Kaazeena Tarukh.'

From 1343—44 towards the end of Mohammed-bin-Tughlaq's reign, Telingana rebelled, and one Kanya Naik recaptured Warangal and one of his relatives who had accepted Islam (Haig says) declared himself independent in Kasupala.

In A.D. 1347 the Bahmani dynasty was founded by Alauddin Bahmani Shah, who wrested the Deccan from the emperors of Delhi. Hasangangu compelled the Hindu kings to pay him tribute. Kanya Naik was subordinate to the Bahmani king. His son Vinayak Deva, called Nag Deo by Farishta, was headstrong, and brought troubles on Warangal. In 1371, the second Bahmani king named Mohammad I. defeated the Warangal troops and put to death the Raja's son (Vinayak Deva).

It is said about Vinayak's death that he bought by compulsion the best horses which were intended for Mohammad Shah Bahmani from a caravan of horse dealers. When Mohammad Shah came to know about the rebellious deeds of Vinayak (governor of Vailampallam), he at once took the field (the identification of this place is not certain. Farishta calls it Vailampattam and the authors of *Bushani-Maasir* and *Tabequate-Akbari* call it Filampattan and Balampattan: the place was probably Vailampallam, north of the river Godavari and near its mouth, and it is likely that the horses were landed near this spot). Vinayak was defeated and brought before the king where instead of repenting for the folly, he let loose his tongue and answered in a torrent of abuse. The end of this matter was his death.

When Mohammad Shah with his army set out on his homeward way, the conquered (citizens of Vailampallam) boldly attacked the conquerors and put to death the greater part of the enemy's army. Mohammad Shah after reaching Gulburga again marched into the territories of Warangal, with a fresh troop; and one village after another easily fell into his hands and was totally ruined. The Raja fled from the capital and took refuge in the jungle.

Bahadur Khan, of whom the Raja begged for peace, played a great part in suppressing the rage of the king, who at last accepted the terms, in which with all other things, he also received a magnificent jewelled throne, which was originally made by

Besides being successful in war Ganapati Deva was a great patron of literature. He also commenced the stone wall of Warangal, which was left unfinished.

After his death, his wife Rudramma Devi ruled for thirty-eight years. She completed the stone wall and surrounded it with the outer wall of mud. The Venetian traveller Marco Polo, visited India about this time, and wrote as follows regarding Rudramma : ' I can assure you during all that space of thirty-eight years, she administered her realm as well as ever her husband did or better. She remained a widow for her husband's sake. She was a wise and well-beloved queen.'

She was succeeded by Pratapa Rudra II, perhaps her grandson, who was a minor and his mother Annammee acted as regent for twelve years. His dominions were as far as the Western Ghats, and from the river Godavari to the Palar river. During his reign Mohammedans turned their attention towards the Deccan. The first attempt was made in 1303 under the command of Malik Fakhruddin who is generally called Malik Kafur ; but it was not successful on account of rainfall. In 1309, Malik Kafur, who was the best general of Alauddin, the Emperor of Delhi, came again with his army and encamped his troops by the side of the wall near the Anmakonda or Hanumkonda hill. After a few days' siege the Raja Rudra Deva was defeated. He proposed terms of peace in 1310 and promised to pay an annual tribute. In 1318 a third expedition was made when the Raja ceased to pay the tribute. The general in this attempt was Ulugh Khan (the eldest son of Sultan Ghiyasuddin). Ulugh Khan was successful and the Raja, his family and some of his nobles were made prisoners and sent to Delhi. Warangal was renamed Sultanpur and governors were appointed there. After some time the Raja was released and restored to his kingdom.

Pratapa Rudra or Ladar Dev as Mohammedans called him died in A.C. 1341 and was succeeded by his brother Virabhadra or Krishna who being unfit to govern, was forced to vacate the throne. From this time the Kakatia dynasty lost the upperhand. A few years later the eastern portion of Warangal passed into the hands of the Gajapatis (masters of the elephant) the Rajas of Orissa.

ruled at Kandahar and the other named Tribhuvanamala (as it is mentioned in the Thousand Pillared Temple's Inscription) at Hanumkonda, who was a brave and dauntless soldier. According to the inscription he is the first king of the Kakatia house.

On the death of the Raja of Kandahar his wife Sriyal Devi fled to Hanumkonda and gave birth to a posthumous child, Maladeva Varma, who succeeded to the throne on the death of the Raja of Hanumkonda. He put to death the Raja of Kattak who had killed his father, he also subdued the King of Ceylon and married the daughter of the Rajah of Chola. He was a terror to his enemies. To the learned Pandits he was extremely merciful and good. He was a good husband and worshipped the God Siva.

His son Proli Raja, as the inscription says, was always after destroying his enemies, rajahs of neighbouring kingdoms, rendering their wives widows. He was such a famous warrior as to be likened to Ravana, the ten-headed tyrant of Ceylon, in his exploits. He was ever famous in battle, mounted on an elephant. He was ever ready to go into battle, but he would keep his plans to himself. His wife, named Muppomma Devi, was a paragon of virtue, and had world wide celebrity. She was a fearless beauty and had few equals. She gave birth to a son who was called Rudra Deva.

Pratapa Rudra Deva I. is the builder of the Thousand Pillared Temple. He was the most handsome man of his time. He had no equal in horsemanship. He was very strong and muscular. In the battlefield he could let lose an arrow with an unerring aim. He conquered many cities. He was very quick in arranging his forces on the field. He would protect the Brahmins from all harm. He was such a brave and terrible king that a raja died through dread of him. His dominion extended from Kattak to the shores of the ocean on the east, to the Srisaila mountains on the south and the country of Malyavanta on the north. He had his influence also on the western districts of Bengal.

He was succeeded by Mahadeva, probably his son, who was succeeded by his son Ganapati in A.D. 1223. During his reign his territories extended from the frontiers of Orissa to Nellore.

and extensive that they have joined with one another and formed into one.

The city, whose area extends from Kazipet station to Warangal, touching the foot of the Hanumkonda hill between, has some ruins—temples and inscriptions of great beauty, which show the utmost artistic skill and throw a flood of light on the local civilization of the past.

The city abounds in all directions with tanks and streams, and is worth visiting for its pleasant sights. The surroundings of the city are picturesque on account of the gardens, plains, paddy fields and sharp pointed rocks and hillocks, some of which are capped with Hindu shrines and temples. Climbing up the Hanumkonda hill and sitting on its old, decayed rampart, one can see the whole city and enjoy the natural scenery.

The town of Warangal is said to have been founded in the eleventh century by Proli Raja of the Kakatia dynasty. Sayyid Husain Bilgrami says in *The Historical and Descriptive Sketch of H. H. the Nizam's Dominions* that some identify it with Warakalli the capital of the Adeva Rajas of Tulura Andhra or Telingana in the eighth century. Anyhow Warangal was for a time one of the strongholds of Hinduism in southern India against the Mohammedan invaders from the north.

Major T. W. Haig says in *The Historical Lanamarks of the Deccan* that Warangal was for many years the capital of the Kakatia dynasty of Telingana, which according to the Mohammedan historian Badaoni reigned for 700 years before the capture of the city by Mohammad-bin-Tuglaq of Delhi.

In A.D. 783 a revolution took place when Krishna Raja of the Yadwas wrested the sovereign power from the Chalukyas. In the confusion of the time in A.D. 973 the Yadwas were overthrown and the Chalukyas regained their ascendancy.

Haig is of opinion that first known king of Kakatia dynasty is Tribhuvanamala in A.D. 1100.

One more piece of information is found in a Telugu work—*The Pratapa Charitra*, which mentions that a Chalukya king Nandulu reigned at Nandagiri on Nandair. On his death the kingdom was divided between his two sons; one of whom

that the temple was originally dedicated to Siva, Vishnu and Brahma. There are many evidences of this. At present the symbol of Siva, the Linga, alone remains. The central shrine, I believe, held an image of Vishnu. Over the antechamber entrance is a group representing the Narasimha 'Avâtara' of Vishnu, while over that of the west shrines is a representation of the Tandava of Siva. I am doubtful about the group over the east shrine antechamber, which seems to be Indra with his elephant.'

Quite opposite to this temple, on the other side of the Nandi pavilion, there is another temple, which is in a ruined condition, the roof and some of the walls of which have totally fallen down. At a distance from the temple there is an old well beside which there is a gate and pillar with an inscription which was written in Sri Rudra Deva's reign, dated 1162 A. D. Our Government is spending thousands of rupees to save it from further decay. According to a scheme a small garden will be made around it.

At a distance from the town on the southern side there are some very interesting remains. Several Jain figures are cut in rocks. According to 'Pratapacharitra,' the old town of Hanumantgiri was situated among the hills. The temple of Bhadri is on the Bhadri tank. Padmakshi Nargala Dev, and Gopal Murthi are near to one another and the temple of Siddeshvar in the centre. Remains of the fortified wall are seen on the hills. There is also a breach in the wall, which can be seen now too; and it is generally said to have been made by Malik Kafur. There was a village near it called Meerpet whose mosque is still there, in a ruined condition. There is another temple on the northern side of the town. There are many inscriptions on the rocks of the hills of Hanumkonda.

Except Warangal and Hanumkonda, of which a local tradition says that the former was a fortress and the latter the capital—as Golconda and Hyderabad—all other parts were small villages which partly on account of the railway line and partly because Warangal was the chief town of the Subah of the same name, very soon embraced civilization and are now so well populated

antiquity. The Thousand Pillared Temple is of great importance. The temple is designed in the Chalukya style. It has three rooms, the walls of whose entrances are full of groups of carved figures of great beauty. The figures are both of male and female, singers and drummers, and elephants. There is a great hall in the centre, the roof of which is supported by four huge and gigantic pillars, quadrangular in shape, with fine delicate and ornamented work. In the inner part of the roof there are geometrical designs. Below it there is a huge black polished stone, circular in shape, indicating the central part. On one of the columns supporting the hall and also on the front wall of the left room in which there is a Linga, are inscriptions in old Telugu. On one pillar, which is at the meeting point of the hall and the portico, there are two small figures, carved side by side with their heads downward. Generally this is said to be the sign of the temple. In front of the portico on both the sides, are the figures of an elephant and a bull carved out of black stone. Three years ago, the bull was lying at a distance from the temple in a ruined condition, it has been brought here by the Government's order. The whole temple is built of black and polished stones. The inner portion is well polished and beautifully carved but the outer portion, especially the roof is made of rough stone which is very shabby in appearance.

In front of the temple there was a Nandi pavilion, which is now no more to be seen; but the huge bull which is beautifully carved and overloaded with ornaments, is in tolerably good condition and is a splendid specimen, quite equal to that at Tanjore.

The temple has many columns and innumerable marks of columns both in the outside and inside of the walls, and they seem as if they were made in close connection. On the whole it is much the finest and the most ornamental of the Dravidian temples in the dominions.

Of this temple Mr. Cousens writes :—' The building is evidently of two periods, the main block containing the three shrines and hall, belonging to the time of the inscription, whilst the prolongation or doubling of the porch of this, with this Nandi pavilion and the great detached pillared hall are of a later time, possibly after the rise of the Lingayats. I am strongly of opinion

inner of stone and the outer of earth. There are also here and there ruins of a third wall. About the outer earthen wall Mr. H. Cousens, in his 'Progress Report of the Archaeological Survey of Western India 1894–5' writes that it is said to have been built by the hands of the Hindus but he is very doubtful about it since its gateways are decidedly Mohammedan. The inner stone wall of the fort is of Hindu origin. The upper portion was added by Mohammedans. The stone wall is called Pedda-Gutta, and the outer wall is called Bhumi Gutta, and has two gates, the Bandara Darwaza on the east and the Hyderabad Darwaza on the west. There are inscriptions in Sanskrit and Early Telugu on the walls of these gates. A deep wide trench runs all round on the outside.

Campbell says that the stone wall gave to the fort the name of 'Eka Sila Nagaram' which in Tamil is 'Orukal' whence, it is popularly believed, is derived the name of Warangal.

Inside the wall, in front of a half-buried temple of Mahadeva are three beautifully carved and polished stone bulls. The sculptor has loaded them with jewels and chains, which are carved in the same stone.

In the centre of the fort are four gates of victory in four directions. It is said that in their centre, there was a great temple. Gates are carved in hard green stone. They are in safe condition.

Campbell says that they may date from nearly two thousand years ago, as they are after the style of the four gateways to the great tope at Sanchi, constructed in the first century B.C. Besides these many carved stone elephants and statues are found in a broken condition. Near the southern gate are some ruined buildings and near the western gate is a structure erected by Shitab Khan. There is a powder magazine near the north gate. There are four 'Lats' which were first used by the Buddhists and then by the Jains, in the centre. There is also a great hall which is now called Khursheed Mahal.

Hanumkonda, written as Anmakonda in the Uparapalli inscription is said to have been in olden times the capital of a Hindu kingdom. It contains some very interesting relics of

it. As he ran he tumbled over something and the gory heart rolled along the ground. And as the heart rolled and quivered he heard it speaking; it was weeping and saying to him:

'Have you hurt yourself, my child?'

HAMIDUZ-ZAFAR, B.A.

WARANGAL

To write anything of value about the history of the ancient kingdoms like that of Warangal, and the great work done by their kings is no easy matter. Little is known about the kingdom of Warangal till 1303, A.C. There are only a few records and inscriptions that throw light on the subject. Some foreign visitors and a very few of the inhabitants of the Nizam's Dominions have taken the trouble of bringing to light the history of the bygone days and of the numerous ancient relics of Warangal. To speak the truth, every nook and corner of the city has its own historical importance; but I feel myself in difficulties when I try to bring out some useful matter from that dark abyss of time, before the reign of Tribhuvanamala. But as I have visited all the below mentioned things and places frequently and as their grandeur and historical importance have increasingly impressed me, I now make bold to write a few pages on the subject.

Warangal is an ancient town which lies 87 miles to the north-east of the city of Hyderabad. It is on H.E.H. the Nizam's State Railway. It is the chief town of Telingana (Eastern Circle) and the capital of Warangal Division. The ancient capital of this name was a small village, a fort of importance. Now Warangal means, not only the petty Village, but also Mutwada, which is a great business centre of Telingana on the main railway line; Hanumkonda which is famous for the 'Thousand Pillars Temple'; Subedari, which is now the seat of nearly all the Government offices of the town; and also includes Kazipet, which at a little distance from Subedari is a great railway junction.

The ancient greatness of Warangal has passed away and it is now turned into a common Jagir village, lying about four miles south-east Hanumkonda. It is surrounded by two walls, the

'Et lon la laire
Et lou len la.'
(*Adapted from the French.*)

It was the night of the full moon. The river Loire was running smooth and the atmosphere around was hushed into silence.

On her bank, near Orleans, two persons, in the prime of life, were engaged in secret whispers. One of them was a handsome girl and was proud of her matchless beauty. She did not care for the man by her side—her suitor—He was a poor fellow, who loved her with all his heart.

The moonlight was smiling at their fates.

Breaking the silence, the young lover said in broken accents: 'Ah! my darling, have you still any doubt about my extreme and burning love, even when I have sacrificed my life's most precious treasure for you—I—I mean my poor heart.'

The Matchless Beauty replied in a sweet tone but with a cruel heart: 'To sacrifice the heart on the Altar of Love is but a primary stage in the Religion of Love. I want a more valid proof than this: and will believe in your true love provided you fetch me to-morrow your mother's heart for my dog!'

To the young fellow these words came like a bolt from the sky and as a result a great commotion and tumult was raging in his mind:

'Between the acting of a dreadful thing
And the first motion, all the interim is
Like a phantasma or a hideous dream:
The Genius and the mortal instruments
Are then in Council; and the state of man,
Like to a little kingdom, suffers then
The nature of an insurrection.'

But since he was steeped in passionate love, he stood up; went to his mother; killed her; took her heart out and ran with

As the book draws to a close, 'angelic quires' are heard singing:—

'Hail, son of the Most High; heir of both worlds:
Queller of Satan! on thy glorious work
Now enter; and begin to save mankind!'

The blind and captive Samson and the blind and captive Milton, both think to set their country free. Both are conscious of their greatness and both are made to suffer through the mistakes of others. Delila, Samson's wife joins the Philistines. She betrays her husband by kissing him like Judas. But in the end he avenged himself on the captives, though he himself lost his life in the attempt.

Oh, dearly bought revenge, yet glorious!
Living or dying thou hast fulfilled
The work for which thou wast foretold
To Israel, and now liest victorious
Among thy slain, self-killed.....

B. N. CHOBE,
IV Year Student,
Osmania University College.

God made thee perfect, not immutable:
And good He made thee, but to persevere
He left it in thy power; ordained thy will
By nature free, not over-ruled by fate
Inexorable, or strict necessity;
Our voluntary service He requires. . . .

Satan takes the form of a serpent and finding Eve alone leads her to the tree of knowledge. He successfully persuades her to taste the fruit.

Her rash hand, in evil hour,
Forth reaching to the fruit, she plucked—she ate!
Earth felt the wound; and nature from her seal,
Sighing through all her works, gave sighs of woe,
That all was lost;

Eve's love forced her husband to eat the fruit, and brought about the ruin of the human race. This original sin brings about the expulsion of Adam and Eve from Paradise.

Paradise Regained is in four books of 2,070 lines. The subject may be stated as follows:—

I . . . . . now sing
Recovered Paradise to all mankind,
By one man's firm obedience fully tried
Through all temptation.

We learn that Jesus, even when a boy, thought of serious subjects such as

To rescue Israel from the Roman yoke;
Then to subdue and quell over all the earth,
Brute violence and proud tyrannic power,
Till truth were freed, and equity restored.

Milton from his earliest days felt a personal love for Jesus Christ. What was only suggested vaguely in the Nativity ode is fully explained in *Paradise Lost*. The poet says how one

Who reigns within himself and rules
Passions, desires, and fears, is more than king.

The object of the poem is to

'Assert eternal providence,
And justify the ways of God to men.'

Paradise Lost is in twelve books, of about nine thousand lines, but the first four books are pronounced to be the best, and from these we shall give a few extracts. To begin with the Fall of Satan in Book I.

Him the Almighty Power
Hurled headlong flaming from the ethereal sky.
With hideous ruin and combustion, down
To bottomless perdition ; there to dwell
In adamantine chains and penal fire,
Who durst defy the Omnipotent to arms.

After a long debate in the pandemonium it is resolved to have revenge upon man.

Either with hell fire
To waste his whole creation, or possess
All as our own, and drive as women driven,
The puny inhabitants ; or if not drive,
Reduce them to our party . . . . .

The description of Sin and Death in Book II is a piece that remains unsurpassed in English literature. With the address to Light in Book III may be compared the passage beginning.

'But chief of all,
O loss of Sight of thee I most complain'
to 'Why was the sight
To such a tender ball as the eye confined
So obvious and so easy to be quenched';
(lines 66-95) in *Samson Agonistes.*

The description of Adam and Eve in Book IV, lines 288-324 may be read in the original. In Book V may be found Milton's philosophy of life. One passage may be quoted :

From 1640 to 1660 Milton's time was devoted to political writings or religious disputes over the question of divorce. The contribution to the Muses was only seventeen sonnets written on different occasions. Of these four are incomparably the best: *When the Assault was Intended to the City* (VII), on the new forces of conscience *Under the Long Parliament* (XIIa), *On His Blindness* (XIX) and *To Cyriack Skinner* (XXII). I shall confine myself to giving a few familiar quotations.

1. License they mean when they cry liberty.
2. New Presbyter is but old priest writ large.
3. Peace hath her victories
   No less renowned than war.
4. : who best
   Bear His mild yoke, they serve Him best.
   They also serve who only stand and wait.
5. What supports me, dost thou ask?
   The conscience, friend, to have lost them over plied
   In liberty's defence, my noble task.

His last sonnet *To the Memory of the Second Wife* (XXIII) was composed in 1658 . . . the year which saw the death of Cromwell. After the Restoration Milton again thought of his message, and before his death he gave the English speaking world poems such as *Paradise Lost* (1165–7), *Paradise Regained* and *Samson Agonistes* (1671).

In preface to the *Paradise Lost* he says: 'The measure is English heroic verse, without rhyme, as that of Homer in Greek, and of Virgil in Latin; rhyme being no necessary adjunct or true ornament of poem or good verse . . . . but the invention of a barbarous age, to set off wretched matter and lame metre . . . . This neglect, then, ... is to be esteemed an example set, the first in English, of ancient liberty recovered to heroic poem, from the troublesome and modern bondage of rhyming.'

The subject is thus indicated in the opening lines:—

Of man's first disobedience, and the fruit
Of that forbidden tree, whose mortal taste
Brought death into the world, and all our woe,
With loss of Eden . . . . . .

Arcades is a masque. Here there are three short songs sung by persons dressed in pastoral habits, and a few lines of blank verse spoken by the genius of the woods.

In *Comus* we find Puritan theology predominating. It is an allegory. A young maiden is tempted and then delivered with the help of a river-nymph. She has perfect faith as she sings in the forest:—

> I see ye visibly, and now believe
> That He, the supreme God, to whom all things ill
> Are out as slavish officers of vengeance,
> Would send a glistering guardian, if need were,
> To keep my life and honour unassailed.

Lycidas is the last of the Horton group of poems. It is a monody bewailing the loss of Milton's Cambridge friend, Edward King, who was drowned in the Irish sea in 1637, Gray's *Elegy*, Shelley's *Adonais*, Tennyson's *In Memoriam* and Milton's *Lycidas* will be read with pleasure so long as the English language survives. In this poem of 193 lines we have the following which have passed into familiar phrases and quotations :—

1. Bitter constraint and sad occasion dear
   Compels me to disturb your season due.
2. He must not float upon the watery bier
   Unwept, and wilter to the parching wind,
   Without the meed of some melodious tear.
3. Fame is the spur that the clear spirit doth raise
   (That last infirmity of noble minds)
   To scorn delights and live laborious days.
4. Fame is no plant that grows on mortal soil . . . .
5. To-morrow to fresh woods and pastures new.

In *Lycidas* the poet foretells the ruin of the 'Blind-months' or the corrupted, unbishoplike clergy of the days of Charles and Laud.

After the death of his mother, Milton travelled on continental Europe but soon hurried home. He gave up his property to the cause of liberty and worked as Latin Secretary under the Commonwealth.

twelve pieces in all; of these two were sonnets, *To the Nightingale* and *On His Having Arrived at the Age of Twenty-Three;* one was *On Time* with a sub-title 'To be set on a clock-case.' The most notable poem before the end of his college career was the ode written *On the Morning of Christ's Nativity* in 1629 when the poet was still twenty years of age. While at Cambridge Milton gave up the idea of studying for the Church and definitely chose the Muses for his devotion. He took his degree of Master of Arts in 1632 and bade farewell to the university.

Milton's poetical life may be divided into the following periods:—

(1) 1632–1639.
(2) 1640–1660.
(3) 1660–1674.

For six years after leaving the university he resided at Horton in Buckinghamshire. The interval was spent in study and composing such small pieces as *L'Allegro* and *Il Penseroso* (1633), *Arcades* and *Comus* (1634) and *Lycidas* (1637). All of them show Milton as the product both of the Renaissance and the Reformation.

In *L'Allegro* the poet addressed himself to Euphrosyne or Mirth, among whose companions is

'The mountain nymph, Sweet Liberty'.

The poem is a description of man, Nature, and art as seen when in a happy and joyful strain of mind. In *Il Penseroso* he craves for

Him that soars on golden wing,
Guiding the fiery-wheeled-throne,
The cherub Contemplation.

The chief occupation of *Il Penseroso* is the watching of the stars all night, reading Plato, and the classical tragedies. Chaucer, Spenser, Ariosto, and Tasso also make their appearance. Music and Church service have a deep interest for him.

In service high and anthems clear,
As may with sweetness, through mine ears,
Dissolve me into ecstasies,
And bring all Heaven before my eyes.

MILTON'S POETRY

WHEN reading Milton I often think of our great poet Tulsidas (1532–1623). Their genius was essentially of the same mould . . . though it developed in various ways in which it was placed. Both had a very high ideal of poetry and of a poet's task, to which they solely devoted their lives: both were deeply tinged with religious feelings and lived a life of pure simplicity; both were intensely patriotic. . . . Milton, when he heard of the revolution at home, expressed himself thus:—'I thought it disgraceful, while my fellow-countrymen were fighting for liberty, that I should be travelling abroad for pleasure', and Tulsidas alone would put the following sentiments in Ram's mouth:—

'The city (Ayodhia) is so holy and the country is so charming, that although all men speak of Vaikunth, which is indeed famous in the Vedas and Puranas, and celebrated throughout the world, still it is not so dear to me as the city of Ayodh: only here and there one can be found to comprehend this saying. Here is the delightful city my birthplace and to the north the sacred Sarju . . . '.—F. S. Growse.

Both Milton and Tulsidas wished for religious reforms in their own ways, but both had toleration at heart, and for their spiritual guidance they went directly to the Vedas and the Bible. Both were deeply studied in the classics of their own. . . . Milton in Latin, Greek and Italian, and Tulsidas in Sanskrit and the many vernaculars in which he wrote.

But here the comparison comes to an end. Milton will now mainly concern us for the present and we shall trace how his mind was slowly transformed.

Milton from his tender years was associated first with his father and then with Thomas Young, his tutor, both of whom were Puritans. At the age of seventeen he joined Christ's College, Cambridge. In 1626 he wrote his first original piece in English, *On the Death of a Fair Infant.* While at Cambridge he composed

title-deeds and other official orders. This was possible when the number of such decrees and works was comparatively small. The parchment was used because it was respectable to look at and had a long life of authenticity. But later the quantity of original works, compilations, despatches and other writings increased to such an extent that there was not a sufficient amount of parchment available, and it was then that according to the advice of el Faḍl Ibn-i-Yaḥya, the Barmicide vazir of Harūn er-Rashīd, paper was manufactured for writing the despatches of the Khalīfah and other governmental acts. Since then it has been normally employed both for governmental and scientific writings and its manufacture has been carried to a high degree of perfection.'

This habit of making researches in history and into the causes of various inventions in arts and sciences, and of delineating their gradual development, puts Ibn-i-Khaldūn, the African writer of the 14th century, in the same line as some of the best writers of modern Europe.

HAROON K. SHERWANI, M.A., (Oxon.)
Bar.-at-Law, Head of the Dept. of History.

existing social order. And Ibn-i-Khaldūn has abundant remarks on towns, town-building, arts and commerce. He says that progress in civilization is followed by progress in the arts of peace. 'Such arts as are produced by the needs of town-life, exist practically everywhere, and workers in those arts, such as tailors, blacksmiths, carpenters etc. abound in all the towns worth mentioning. But those who owe their existence to the needs of luxury are found only in the more populous places . . ., for it is only there that we find glass merchants, jewellers, perfumers, cooks, coppersmiths, juicemakers, *herissa*[1] sellers, workers in brocade and other objects of arts. As the habits of luxury increase, new arts, unknown before, make their appearance, such as vapour-baths, an institution which is found only in towns which are large and well-populated (for the reason that it is the sensuality born out of luxury which brings it into existence).'

We cannot here discuss all that Ibn-i-Khaldūn says in respect of various other sciences. He neither describes them nor enumerates their principles, but all the same, with the same philosophical tinge he makes deep observations with regard to everyone of them, says all that one ought to know about them, their use and the conditions under which it develops, etc. All these observations are moreover illustrated by wellchosen examples and sometimes the names of the distinguished authors on the particular subjects are given and their more interesting ideas discussed. In the same way we find in the Prolegomena chapters on administration, agriculture, architecture, carpentry, weaving, tailoring, midwifery, medicine, singing, bookselling, the Quranic sciences, the sciences of numbers and mathematics, calculus, algebra, geometry, optics, astronomy, chemistry, alchemy, logic, grammar and literature. From this rich repertory of ideas and of facts we should like to end by giving a quotation which illustrates the peculiar method of our author; it is from the part of the work where the author has discussed the book-trade and where he relates the history of paper-making.[2]

'In earlier times parchment, prepared from raw hide, was employed for books and decrees of the Sultan, such as despatches,

[1] *Herissa* is made of wheat and minced meat mixed together.
[2] Notices and Extracts, vol. xx, p. 407.

that talking about the nobles, he mentions that the nobles of a family reach their culminating point in four generations. Thus according to him a family is more stable than a dynasty.

After new empires have been founded, nomadic life begins to be replaced by sedentary habits, and while adopting new ways the conquerors take as their model the customs of the people they have conquered. This is exactly what happened to the Arabs. 'We learn that the Arabs when they had conquered Persia, thought that the cushions presented to them were really packages of cloth, and when they discovered some camphor in the palace of Chosroes, they forthwith took it to be lumps of salt and put it in the flour which they had prepared for their bread. When they had subdued the inhabitants of these lands, they took a number of them into their service giving the best of them the charge of their domestic management.'

Slowly the energy of the erstwhile conquerors is sapped by the development of luxury. The condition of their new life in the cities enervates their temperament. 'The most remarkable character of sedentary life is the desire to diversify one's enjoyments. . . . For one is then busy with one's kitchen, with the dress material, with plates, dishes and other articles of furniture which are regarded as necessary for a decent household. In order that all these things might be well looked after and at the same time be of the best, it is necessary that the arts and crafts should be given an impetus. One luxury follows another, and arts multiply according to the varieties of fantasies which carry the spirit towards voluptuous life, pleasures and enjoyment of all kinds and forms.'

When an empire grows old, new ones spring up either by a gradual weakening of the central authority when it loses its hold on the governors, or else by conquest. A country is conquered when a chief living on the borders of a weakened empire, takes up arms to attack it with the pretext of supporting a political or religious principle under which the people can be united.'

In its origin, the foundation of empires precedes that of cities. The building of a town means the collaboration of numerous workmen and therefore presupposes a previously

round them and the works which have been built for their security, so that they fear nothing, but on the contrary seek to encroach upon the property of those who may be living in the vicinity. . . . The contrary is the condition of those as are living a long distance from the centres of population. Accustomed to wild ways, which become their second nature by continuously living in the vast lands of the desert, they avoid nearness to the army which the established government charges to protect the frontiers, and push back with disdain the idea of saving themselves behind walls and gates. They are strong enough to protect themselves, never confiding to others the care of the defence, and as they are always fully armed, they show a fine alertness in their expeditions. They never give themselves up to sleep except in the short intervals during the night or while they are travelling on the backs of their camels; but even then they have their ears wide open in order to be on guard at a moment's notice. . . . At the first warning, at the first cry of alarm, they throw themselves right in the danger zone trusting entirely on their own prowess. . . . And these are the things which have become their second nature, replacing their original nature characteristics.'

Laying further stress on these qualities, our philosopher insists on the qualities of self-respect and independence of character. He goes on to say that a people ought not to bow their heads easily even before legitimate authority, and it is not good for them to show that they are overkeen to pay their taxes to the State. He observes that semi-savage tribes are more capable of carrying on successful campaigns than others. 'God kept the Israelites in the desert for forty years so that their children might be brought up in an atmosphere of independence and render themselves capable of conquering the Promised Land.'

Ibn-i-Khaldūn has some idea of the development and evolution of the Empires, and we see him speak about them as he would of biological phenomena. 'Empires like individuals have an existence and a life peculiar to themselves. They grow up, they arrive at a mature age, they begin to decline.' He fixes the duration of their life to three generations or 120 years, a period which is to our mind, far too short especially in view of the fact

well estimate the point to which they have to think out various things beforehand. This provision is necessary to such an extent that one of them would keep in stock wheat for a whole year, and instead of drawing upon it, would go to the market every day in order to buy provisions for himself and his family.' Ibn-i-Khaldūn then goes on to say that if we were to continue such observations in respect of other climes we would have further proof that natural factors exercises a deep influence on the character of man.

Food, again, has a direct effect upon the temperament of different races. There are those who have an abundance of cereals and fruits 'owing to the peculiarities of vegetation, good quality of soil and the progress of civilization.' But with others, grain and seasonal crops are entirely wanting, so that their solitary food consists of milk and the flesh of their flock. Now these peoples who have to undergo privations like these, excel those who live an easy life, both in respect of moral as well as physical qualities. 'Their colour is fresher, their bodies healthier and better proportioned; they have a superior character and a livelier intelligence.' Ibn-i-Khaldūn concludes this by discussing the advantages of temperance in one's habits.

This philosopher is a great admirer of simplicity in life. As he was well-versed in a number of sciences and able to discuss all that helps to progress in arts and sciences, he praises the life of the country-folk and fully sympathises with pastoral and primitive way of living. To him both the nomadic and sedentary ways of life are according to the dictates of nature, yet he thinks that the first is easily the superior of the two. For, he says, the country was originally the cradle of civilization, and it is from the country that the towns derive their very existence and their population. Those who live in the fields are certainly less corrupt than the inhabitants of the towns, for their very security depends entirely upon them. 'The townsmen are in the habit of indulging in games which their easy-going life offers them, and they leave to their rulers the care of protecting both their persons and their goods. They are satisfied that they are in no danger because of the troops that are there to protect them, the walls which sur-

Climate also affects the temperament of the peoples of the world, and Ibn-i-Khaldūn studies its influence with great care. He explains this in certain fully painted pictures in which the superiority of the temperate zone is indicated. 'In the countries situated away from this zone, such as the first, the second, the sixth and the seventh zones, the condition of the people likewise deviates from happiness. Their houses are built of bamboos or of earth, their food consists of *Dorra* or of herbs; their dress is made of leaves of trees with which they cover their bodies or rather their skins, but mostly they go about without having any dress on. Moreover the fruits of their trees ripen at extraordinary and odd times.'

Quite different are the inhabitants of the Centre. 'We find in their character a sense of proportion which shows itself in their *physique* as well as in their *morale*, their conduct as well as in all the circumstances which are naturally connected with their civilization, that is to say, with the way of their life, of their arts and sciences, their high principles and their empire. There are, again, those nations which have received the Divine messengers among them, and it is there that the institution of kingship is found as also dynasties, Laws, sciences, towns, capitals, buildings, colonies, fine arts and all that constitutes a condition of well-regulated existence. The people who have inhabited these lands, the history of which we are aware, are the Arabs, the Romans, the Persians, the Jews, the Greeks as well as the population of Sind and China.'

The history of some well-known peoples has given occasion for some very interesting remarks. For instance Ibn-i-Khaldūn has something to say about the easy-going and gay manners of the negroes. He says that Mas'oadi had already looked for the cause of it and gives a quotation from him that the real reason is the fact that the negro can find his food very easily. The contrary is to be seen in the peoples of harder climate. 'The town of Fez in the Maghrib gives us an instance of the contrary state of affairs. It is surrounded by some very cold plateaux where one sees the inhabitants going about with lowered heads like those who are suffering from some kind of acute depression, and one can very

Babylonian knowledge? Where are the traces left by them on the peoples of these lands? Where the sciences left by the Copts of old? There is, as a matter of fact, only one ancient nation, that of the Greeks, of which we still possess scientific researches, and that is due entirely to the care taken by el Māmūn in having the important works in that language translated from the original into Arabic. This prince succeeded in this because he could find a large number of translators and because he spent immense wealth over the enterprise. We know nothing of the sciences of other peoples.'

This is somewhat an exaggerated account of the state of contemporary knowledge, for a part of the Persian, Indian and Jewish sciences were, as a matter of fact, handed down to the Muslims; but this passage, otherwise eloquent, shows the vastness of the idea which our author had of civilization.

After this Ibn-i-Khaldūn analyses the formation of societies, and says that the formation of societies is a general fact which results from the weakness of the solitary man. 'The power of the solitary human being is insufficient to obtain the quantity of food required by him, and is not enough to procure that which is necessary in order to sustain life. A solitary man cannot resist the force of a single animal, specially of the carnivorous type.'

The idea of society presupposes that of sovereignty, and for Ibn-i-Khaldūn the sovereign is a kind of moderator who must prevent mutual aggression. A person is necessary 'who has a sufficiently firm hand, a power and an authority strong enough to keep the people from attacking one another. It is really this quality which constitutes sovereignty.' Here our philosopher contrasts human society with the groups of pigs and other animal groups. 'If we believe in the sayings of certain sages, we should find the elements of social life existing even in some species of animals, such as bees and locusts, among which there is to be seen a certain amount of central authority, a kind of obedience and attachment to a leader belonging to their species, noted by the largeness of its stature. But among animals the thing exists by sheer instinct and does not mean either the arrangement or intention of a regular administration.'

The works of this great writer consists of a Universal History, which is a compilation, followed by an important history of the Berbers which M. de Slane has translated, and preceded by an introduction which is in itself quite voluminous. It is this preface, the Prolegomena, which contains the political philosophy of Ibn-i-Khaldūn, and constitutes a huge encyclopaedia where every question is treated in its philosophical aspect, while history itself is regarded as a branch of the philosophical science. We had better give here some quotations from the work itself :—

'We would here consider history in its external aspect and see how it serves to retrace events which were prominent during the centuries and within the lifetime of the ruling dynasties, and which are evidenced by the generation which came after them. It is really for the sake of this science that we have cultivated the ornate style and figurative language, and it is this which forms the main charm of literary assemblies which are crowded by amateurs. It is that which teaches us to know the revolutions wrought by the created beings, and offers a vast field of knowledge where one sees empires in all their varied careers, while at the same time showing us how the diverse peoples have tilled the earth up to the time when the hour of departure was sounded and the time of their end had arrived.

'Then we regard the internal character of the Historical Science and examine and verify the facts, diligently investigating the causes of production and trying to know the manner in which events have been taking place : we would then see how History forms a very important branch of Philosophy and merits to be included among the great Sciences.'

As we see, History is to Ibn-i-Khaldūn *critique* of facts and a research in causes, a research which necessitates a study of the psychology of the people and of their civilization. Ibn-i-Khaldūn thinks that civilization had already decayed in his time, and says that in times gone by a number of civilizations had likewise flourished and disappeared wholly or in part. 'The scientific knowledge which we have at the present moment exceeds that which originally came down to us. The question is, what happened to the sciences of Persia ? Where are the stores of Chaldean, Assyrian and

which are of a very great interest to a biographer of Ibn-i-Khaldūn. One of Ibn-i-Khaldūn's younger brothers was at this time the secretary of the King and was a poet of some eminence, a quality which the Abbé admires very much. The king, whose name was Abu Hammū, was himself a distinguished poet of his time, and was affectionate and sympathetic by temperament. He was brought up at the court of Granada which was the home of the sciences and arts, and had himself constructed a number of monuments. But Abbé Bargés is not a great admirer of Ibn-i-Khaldūn, for besides reproaching him for not having any order or method in his books, he goes on to say that he was prone to adopt a special course of conduct or to leave off another according to his momentary interest or personal security. But we must be a little indulgent while discussing these troublous times, and we note that Bargés himself calls Ibn-i-Khaldūn a political historian.

Our author was the ambassador of the Sultan of Granada at the court of Peter the Cruel, who sought in vain to keep him permanently with him. Later he went to Cairo, where he was appointed a Professor and then was transferred to the Department of Justice. After this he retired to the property which he had purchased at Fayum, and it is there that he composed a part of the work which has come down to us. The invasion of Timur in Syria drew him away from his studies, for he took part in the campaign against this conqueror, and after the defeat of the Mamalukes, he stayed on at Damascus. The inhabitants of this town sent him to the Mughal camp in order to negotiate terms for the rendition of the town. When he came to Timur, the Conqueror had a long conversation with him, and wanted him to tell him something about the West, and it is related that Ibn-i-Khaldūn described to him the countries he had been to as if they were before his very eyes, always giving his exposition a turn according to the ideas of Timur himself. Timur thereupon began to describe his own conquests, after which he allowed him to go back to Cairo. Ibn-i-Khaldūn was appointed Grand Qadi of this town, a post which he occupied till his death in 808 A.H. (1406 A.C.) at the age of 74. We are told that he was a man of handsome figure and elephant stature, and at the same time a thoroughly good diplomat and a fine courtier.

Islamic Political Philosophy.

(*Continued from the* 'OSMANIA MAGAZINE', *Vol. III, No. 2*).

III.

2. IBN-I-KHALDUN

MUSLIM Africa gives us a sociologist of the first rank in the person of Ibn-i-Khaldūn, and there is no denying the fact that no man ever understood the Philosophy of History more than our historian of Northern Africa. The psychology of a people, the causes which go to change it, the method of founding and establishing empires, the diversity of civilization, the causes of its development and hindrance, such are the questions which are discussed in the most conscientious manner in the famous Prolegomena of this author.[1] As a matter of fact it is not till the eighteenth century that we find any French authors building their theories on the foundation of history. Ibn-i-Khaldūn belongs to the group of historians in which are found Montesquieu and Abbé de Mably, one of the ancestors of our modern sociologists, as well as of Tarde and the Orientalist Gobineau.

We cannot deal with the life of Ibn-i-Khaldūn in any detail here as there is so much to be said by way of the analysis of the ideas which he has dealt with in some detail. The facts of his life can be found in the beginning of his Prolegomena, where we find that he was born at Tunis in 732 A.H. (1332 A.C.), and was in the service of a number of princes such as the Merinid Abu Inān of Fez, who was somehow or other the cause of his imprisonment later on. He also served a king of Tlemcen of the dynasty of Beni Zeyān who had reconquered Tlemcen from the Merinids. The Abbé Bargés has written a number of monographs on this dynasty, which was published in 1852 and 1887, and

[1] The Prolegomena (el muqaddamar) of Ibn-i-Khaldūn, Ed.; Quatremēre, Notes and Extracts, vol. 16–18, trans. by M.G. de Slane, vol. 19–21; of this vol. 19 was published in 1862. For bibliography, *vide* Brocklemann : Gesch. d. ar. Literature (History of Arabic Literature), vol. 2, p. 244

old manners, the same old system of naming a child, the same old household ceremonies and rites continue to exist. There is no check on them. To violate the ancient tradition, the co-operation of the majority is required. A single individual is not sufficient for this purpose, and if he dares do it, he will be ridiculed and scorned by his fellows. The party of custom-observing people is a great check on those who are not very particular about it, and such people when they are away in foreign places where there can be no danger of being scolded, very soon give up the customs they do not like. In a sphere like that of trade, people can hardly afford to continue their old traditions. Competition soon makes them change their methods of business. But *custom seems to be very powerful in matters of feeling.* Although the causes for good or bad feelings cease, the feelings themselves continue to exist. The very mention of the battle of Trafalgar would make the blood of a Scotsman boil with anger. I have myself heard a Scotch friend of mine saying that he would not like to be called an Englishman. The same about the Irish hatred of the English, and the French of the Germans. Such feelings of national friendship or enmity pass from generation to generation. Again in connection with feelings, we find that the method of disposing of the dead is different with different races. Some bury their dead, others cremate, still others leave them to be eaten by the birds. It shows how lasting the feeling for an ideal is. To conclude, old traditions and customs have such a strong foundation that a sudden attempt to break them might lead to serious results. They are like the mortar which keeps the bricks in their position, and prevents them from falling. To attack the foundation is to ruin the whole structure. It is not the task of a single generation to do, but gradual progressive changes in the long run might help to replace the old customs in a way not at all discernible. People would gradually get used to the new things, and every new generation would produce still more changes, and so the old customs would die out by themselves.

M. SAYEEDUD DIN, M.A., B.Sc., F.R.M.S.,
In charge of the Biology Dept.

nations in general to the latter. Among the Eastern countries, India seems to be a great problem. The presence of many sects with varying customs has been hindering the progress ever since. The influence of customs is so great that even civilized, educated classes do not appear to give up the old traditional ways. Nothing less than a complete overhauling is needed, if a higher development is to come about. But the majority of young educated Indians are trying their best to better the conditions of their mother country. They are not conservative as the old semi-educated men whose conservativeness has been responsible for the backwardness of India. Conditions are not the same as they were before, and every year sees considerable progress in all spheres.

One of the factors which favours the sway of custom is the *secludedness of a country*, for example by geographical barriers. They hinder progress in this respect, that no stimuli can reach the place by which progress can be induced. *Lack of good means of* communication also comes in the way of development, while better means of communication favour it. *Local dialect* shuts off the progress of language, and clannishness tends towards conservatism. Home life is not at all a suitable sphere to rouse one's spirits. Intercourse with people of different nationalities and open discussions tends to break the claim of custom, and stimulate progress. War seems to be a good instrument for progress. It breaks up habits and customs, and brings about a radical change in the lives of nations. Custom acts with more force in certain spheres than in others. For example it rules in such fields as dress, display, luxury, language, ceremony, rites, worship, government, relations of races, sexes, and classes. As already indicated there must be some strong hindrance for a custom to break, some revolutionary change, war, or the like. Custom breaks up when circumstances make it hard for people to stick to it. In India, wherever there is a railway line, even the most rigid sects of people are obliged to break their caste system. As long as the circumstances are normal, and so far as the life is 'easy go' life, people do not even dream of departing from what their ancestors have been practising and observing. Home life is the sphere where custom rules supreme. The same

exercised a supernatural influence. Primitive people believed that any departure from the traditional customs even by a single individual in the community would bring unspeakable disaster from unknown sources to the whole community. The question as to how traditional customs have come to acquire such an overwhelming authority and how especially they find the individual even when he is alone by himself, and, therefore, in no danger of being observed and punished by his fellows, becomes simple when we find that it is due to religion, to supernatural sanctions which the traditional customs acquired through religious belief. *The power of custom is purely psychical, and the key to it lies in our mental constitution.* The beaten track seems to be free from danger and agreeable. The *animistic ideas* (soul and body, soul a spectral duplicate of the body) of the primitive man *exercised a conservative influence* on him. The perpetual fear of the unknown power was so great that he dared not break the cake of custom lest some terrible calamity should come on the whole community. To enter into a new way seemed risky, and a thing once done in safety seemed to be possibly safe again, or a thing repeatedly done was safe enough to be done again. Thus the fear of the ghosts of the dead in primitive man preserved custom. But it cannot be denied that the *animistic beliefs* of primitive man, however false and ill-founded, *have made religion possible, and through religion the development of the human race.* Although animism has passed away, custom still rules the minds of the people; and the view held by the 'historical continuity' school is that *survival demonstrates fitness.* But the question is how the individual has contrived to emancipate himself from the tyranny of social custom, and how the cake of custom which stereotyped savage life ever came to be broken and society to be generally progressive. Of course this has not been done in a generation or two, it has taken centuries to depart from the beaten paths, and to break the retarding effect of custom. With the advance of education, and the understanding of facts, language became definite, and precision in religious rites increased. The societies which departed from the old ways progressed, and outstripped the others which still lay under that influence. Western nations belong to the former type of people, and the Eastern

TO HIS BELOVED

When the soul is surrounded with earthliness
You appear to me with your charming face,
My misery you come to bless,
Lulling my heart with a loving embrace.
My need for you no check has known,
My thoughts on you for ever brood ;
My heart, my love, I live alone,
Come then and cheer my solitude.
Methinks the hands that formed your eyes
The sun and moon for practice made
Ere the world had begun to rise
Unto your beauty that shall not fade ;
Your figure some nymph must have in thrall
For you combine the beauties of all.

BASHEER AHMED, B. A.
(*Auswi*).

CUSTOM

Custom in a general sense is *any transmission of psychic elements from one generation to another, or the transmission of a way of doing* (Ross). *Custom imitation* is the *borrowing of way from the predecessors*, and *conventional imitation* consists in the same act *from contemporaries*. One is *down imitation*, and the other *cross imitation*. If we trace the origin of custom and conventionality, we find that the same practice may be at one stage a conventionality, and at a later stage a custom. The *basis of conventionality* is the *prestige of its source*, and *that of custom* is the regard or *prestige the young have for the old*. *Custom* is *very deep rooted*, and something disastrous must happen before its foundation can be shaken. While conventionality requires the overcoming of the force of habit. Parents exercise a great influence in the early life of their children in the transmission of custom. This is an inheritance which the young get from their parents.

If we go into the history of the origin and development of customs, we find that in the life of the primitive man, *customs have*

Terrified, he looked around but saw nothing. His beloved bird falling in a bush was shrieking and the blood was welling from its wounded side.

A certain hunter, not having found his victim, was now hastily pacing with his big gun resting on his shoulder.

Owing to the intense sorrow and grief the child could see nothing but the bird and its bloody side. He lifted the bird and brought it under the shade of the same tree where he had several times heard its sweet songs and with eager looks had seen the bird sitting in its nest.

The female bird rushing out of the nest was impatiently shrieking.

The long-expected desire of my child was fulfilled today. He was sitting with the wounded bird in his hands, but the bird itself could not have felt such intense pain in its shattered side as the child had at the time in his tender heart.

He thought that the bird had fallen a victim to his own selfish wrath. He was repenting of his deed and in his inmost heart was taking an oath to break his small gun that was dearer to him than his life.

He, in his life for the first and perhaps the last time, felt such an intense remorse as only an innocent heart can realize. He might commit mistakes in his life and be sorry for them, but the repentance of this 'uncommitted offence' cannot be compared to that of any greater offence.

The first offence tears down that delicate veil that lies between offence and innocence.

A. RAUF, B.A.,
Law Student.

FIRST OFFENCE

MY child had been playing a long time in the garden. He was tired of chasing the motley butterflies and the bees humming over the spring flowers. A small wooden gun fell down from his delicate hands and he slowly fell into a—slumber.

He was re-enacting the same sport in his dream. Sometimes he would jump at the big trees to catch the birds and miss his way in the wood while chasing the sparrows. Sometimes he was equipped with beautiful wings and would chase them, but in vain.

His bare feet were getting wet with dew when he was running over the hillocks covered with beautiful flowers, and over the open grassy plains.

A bird, singing melodious songs on a pine tree, was the centre of the innocent interest of the boy.

In the attempt to catch the bird he had undergone much exercises by constant stumbling. When the bird singing and soaring in the open air would vanish from his sight he would weep and roll on the ground.

Even now, in the world of dream, his favourite bird was before his sight. Having seen it, he began to clap his delicate hands and spreading his small arms, in sweet tone he said, 'Good bird! come down; I will take you home'. The bird singing flew before him towards the wood. The child ran after it but the bird in order to tease the child (or its lover) would sit on diverse branches, and sometimes approaching him would again fly away.

The child was utterly disappointed and displeased. Uncontrollably he lifted his gun and aiming at the bird fired at it. There arose a din at which he too was appalled. At once his eyes opened. His gun was lying close to him and from the outer bush of the garden the shrieking of a bird was heard.

CONTENTS.

Vol. IV. **No. 1**

		PAGE
1	First Offence ... MR. ABDUL RAUF, L.L. B. Previous)	... 1
2	To his beloxed ... BASHEER AHMAD, L.L. B. (Previous)	... 3
3	Customs ... MR. SAYEEDUDDIN, M.A., B. Sc., F. R. M. S. Incharge of Bialogy Dept.	... 3
4	Islamic Political Philosophy ... MR. HAROON KHAN SHERWANI, M. A. (Oxen) Bar-at-Law, Head of the Department of History	... 7
5	Milton's Poetry ... B. N. CHOBE, IV Student	... 17
6	'Et lou la laire ... Et lou len la' MR. HAMEEDUZ ZAFAR, B A.	... 24
7	Warangal ... SYED SIRAJUDDIN AHMAD, M. A (Previous)	... 25
8	Nemeses ... MR NAZEERUDDIN, L.L. B. (Previous)	... 34
9	The Elegy of English Poetry ... EDITOR	... 38
10	Five Poems ... PROF. E. E. SPEIGHT	... 47
11	Sound and Meaning ... PROF. E. E. SPEIGHT	... 51
12	Notes and News ... EDITOR	... 65